الکلام

یعنی

علم کلام جدید جس مین اسلام کے عقائد کو فلسفہ حال کے مقابلہ مین ثابت کیا گیا ہے

از

حضرت علامہ شبلی نعمانی

باہتمام: مولوی مسعود علی صاحب ندوی

طبع پنجم

مطبع معارف اعظم گڑھ مین چھپی

سنہ ۱۳۶۰ھ
۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تنبیہ

از

سید سلیمان ندوی

علم کلام اُس فن کا نام ہے جس میں مخالفین مذہب کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کا جواب دیا اور عقائد حقہ کو عقلی ونقلی دلیلوں سے ثابت کیا جاتا ہے، اسی لیے بعض متکلمین کا اور خصوصاً امام رازی کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں ملحدوں اور منکروں کے ہر قسم کے اعتراضات اور شبہات کو نقل کرتے ہیں، اور پھر اُن کا ایک ایک کرکے یا مجموعی طور سے جواب دیتے ہیں، بعض علما، اس طریقہ کو ناپسند کرتے ہیں، کہ اس سے وہ اعتراضات اور شکوک ان لوگوں میں بھی پھیلتے ہیں جو اُن سے واقف نہیں، ذاتی طور سے میں بھی اس کو ناپسند کرتا ہوں، مگر مصنفِ الکلام اس باب میں پہلے گروہ کے ساتھ ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ اعتراضات وشکوک کے ان پھوڑوں کو بچا بچا کر رکھنا، جسم میں زہر پھیلانا ہے، بہتر یہ ہے کہ ان میں ایک دفعہ نشتر دیکر مادہ فاسد کو خارج کردیا جائے، چنانچہ وہ کہتے ہیں،

"ہم کو اس سے انکار نہیں کہ عالم اجزائے دیمقراطیسی سے بنا ہے، ہم کو یہ بھی تسلیم[1] ہے کہ عالم قدیم ہے جیسا کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ اور حکمائے اسلام یعنی فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی رائے ہے، بلکہ جیسا کہ ابن رشد نے تلخیص مقال میں لکھا ہے، خود قرآن مجید کی ان آیتوں سے اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا، وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ، یہی متبادر[2] ہوتا ہے،

ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں حرکت مادہ کے ذاتیات میں سے ہے، مختلف قوانینِ قدرت ہیں جن کے موافق اجزا باہم ملتے ہیں، ترکیب پاتے ہیں، لیکن پھر ان میں خاص خاص قوٰی اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا، اسکی تفصیل یہ ہے۔" (صفحہ ۵ و ۶)

اس کے بعد مصنف نے دکھایا ہے کہ ملحدین کی ان باتوں کے مان لینے کے باوجود ان کو خدا کے مان لینے سے کیوں چارہ نہیں،

الغرض ان صفحات میں قدمِ عالم کا جو قول ہے وہ ملاحدہ کا ہے مصنف کا نہیں، کیونکہ مصنف کے نزدیک قدمِ عالم کا عقیدہ اسلام کے خلاف ہے، چنانچہ علم الکلام میں وہ لکھتے ہیں:-

"یہاں یہ بات خیال رکھنے کے قابل ہے کہ اکثر حکمائے یونان عالم کے قدیم

---

[1] یعنی بالفرض (س) [2] یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے، درحقیقت نہیں، (س)

"اس کے نقل کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بزرگانِ سلف نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ معترضوں کے ہر قسم کے اعتراض کو سنا اور ان کو اپنی تصنیفات میں درج کرکے ان کے جواب دیئے، بخلاف اس کے آج ہمارے علماء یہ تلقین کرتے ہیں کہ دشمن کو آتا دیکھکر اپنی آنکھیں بند کرلینی چاہئیں" (الکلام صٓ)

بہرحال علماء کے یہ دونوں طریقے ہیں، اور نیک نیتی کے ساتھ کیا جائے تو دونوں بعض بعض حیثیتوں سے مفید ہیں، اسی اصول کی بنا پر مصنف نے خدا کے اثبات اور معجزات ونبوت کی حقیقت کے بیان میں ایک مستقل باب باندھ کر مخالفین اور معترضین کے بہت سے اعتراضوں کو نقل کیا ہے، اور پھر ان کا جواب دیا ہے، اس لئے خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اعتراضات مخالفوں کے ہیں جو رد کے لئے نقل کئے گئے ہیں، وہ مصنف کے ذاتی اعتقادات نہیں،

قدمِ عالم | کتاب کے صؔ سے صؔ تک "ملاحدہ (یعنی منکرین خدا) کے اعتراضات" کی موٹی سرخی کے نیچے جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ ملحدین کے خیالات کی تقریر ہے، وہ مصنف کا ذاتی عقیدہ نہیں، ملحدین نے مادہ کو قدیم مان کر، اور مادہ کے ساتھ اُس کے خواص، افعال اور حرکات کو قدیم تسلیم کرکے خدا کے عدمِ ضرورت کو ثابت کیا ہے صؔ پر مصنف نے ان کے اس عدمِ ضرورت کا جواب اس طرح دیا ہے، کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کو بالفرض مان کر یہ بتایا ہے کہ تمھاری ان باتوں کے مان لینے کے باوجود خدا کی تسلیم سے چارہ نہیں، چنانچہ اس موقع پر عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے:

اس عبارت سے ظاہر ہی کہ مصنف حکما کی طرح خدا کو فاعل بالاضطرار اور خالقِ مجبور نہیں مانتے
بلکہ ایسے خدا کو تسلیم کرتے ہیں جس نے عالم کو اپنی قدرت اور اختیار سے پیدا کیا اور آپ نے بوعلی سینا
پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو کر کیونکر ایسے لغو مسئلہ کا قائل ہی، اسکے بعد مصنف خدا کے وجود پر قرآن
پاک کا طریقۂ استدلال پیش کرتے ہیں، اور آخر میں نتیجہ نکالتے ہیں،

" ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے گئے ہیں، کامل اور بے نقص
ہے، موزوں اور مرتب ہے، ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے،
یہ دلیل کا صغریٰ ہے، کبریٰ خود ظاہر ہے، یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستمر النظام ہو گی تو
خود بخود نہیں ہو گئی ہو گی بلکہ کسی صاحبِ قدرت اور صاحبِ اختیار نے اسکو پیدا کیا ہو گا" (ص ۳۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم کو ایسا حادث اور مخلوق مانتے ہیں، جس کو خدا نے
اپنی قدرت اور اختیار سے پیدا کیا ہے،

پھر مصنف نے اسی کتاب میں توحید کی بحث میں لکھا ہے،

" نظامِ عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ کثیر الاجزا اور کثیر الافراد
ہے لیکن سب مل کر ایک ہے، یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اسقدر
وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے، جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے
باہمی تناسب کا محافظ ہو" (ص ۹۷)

اس فقرہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں، ایک یہ کہ خدا عالم کے ایک ایک ذرہ کا موجد یعنی
یعنی اسکو وجود میں لانے والا، اور ایک کو دوسرے سے جوڑنے والا ہے،

ہونے کے قائل ہیں، چنانچہ ارسطو کا میلان بھی اس طرف ہے لیکن چونکہ عالم کا قدیم ہونا عقائد اسلام کے خلاف تھا، اس لئے علامۂ موصوف (ابن مسکویہ) نے یونانیوں میں اس گروہ کی رائے اختیار کی جو حدوث کا قائل تھا"۔ (ص۱۲۳)

مصنف نے الکلام میں خود یہ ثابت کیا ہے کہ عالم خدا کا مخلوق ہے، اور اس کے ارادہ اور اختیار سے بنا ہے، چنانچہ "وجود باری" کے عنوان سے پہلے متکلمین اور فلاسفہ کے وہ دلائل نقل کئے ہیں جن سے انھوں نے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے پھر ان دلائل کی کمزوریاں دکھائی ہیں، اس سلسلہ میں مصنف کا بیان ہے:-

"ان دلائل میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان سے اگر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے تو اس کا فاعل باختیار ہونا ثابت نہیں ہوتا، ان دلائل سے صرف ایک علۃ العلل (کاز آف دی کازز) کا وجود ثابت ہوتا ہے، لیکن علت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ اختیار صادر ہو، آفتاب روشنی کی علت ہے، لیکن آفتاب کو نہ علم ہے، اور نہ ارادہ، بلکہ روشنی اس سے خود بخود بلا علم و ارادہ صادر ہوتی ہے اس بنا پر بہت سے حکماء کا مذہب ہے، کہ خدا نے عالم کو بہ اختیار پیدا نہیں کیا، اور تعجب ہے کہ شیخ بو علی سینا بھی ان کا ہمزبان ہے،

ان تمام تقریروں سے تم کو معلوم ہوگا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ[ل] کو حل نہ کر سکے، اور متکلمین بھی چونکہ انہی کے نقش قدم پر چلے تھے، اس لئے وہ بھی ناکام رہے اب دیکھو قرآن مجید نے اس عقدہ کو کیونکر حل کیا (ص۳۴ و ۳۵)

ل یعنی خدا کے وجود کے مسئلہ کو

اعتراضات یکجا کئے ہیں جو معجزات اور خرقِ عادت کی بنا پر نبوت پر کئے جاتے ہیں، اس باب کا عنوان یہ ہے "خرقِ عادت کے مسئلہ کی بنا پر نبوت پر اعتراض" یہ باب ص۲۶ سے ص۵۷ تک پھیلا ہوا ہے، اسی باب میں ایک فقرہ یہ بھی ہے،

" عالم میں علل اور اسباب کا سلسلہ جاری ہے یعنی جو چیز وجود میں آتی ہے اس کے علل اور اسباب ہوتے ہیں، اور جب کسی شے کے علل و اسباب موجود ہوتے ہیں، تو ضرور اس شے کا وجود ہوتا ہے، اب معجزہ کی اگر یہ تعریف ہے کہ علت و معلول کے سلسلہ کے خلاف وقوع میں آئے تو معجزہ بداہۃً باطل ہوگا" ص۲۶

یہ عبارت مصنف کے عقیدہ کی نہیں، بلکہ ان معترضین کی ہے، جو معجزہ کی تعریف میں خرقِ عادت کی شرط کے ضروری ہونے کی بنا پر کرتے ہیں، مصنف کا جو خیال اس باب میں ہے وہ ص۸۶ سے لیکر ص۹۲ تک ہے، اس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ معجزات قوانینِ قدرت کے خلاف نہیں ہوتے، بلکہ فطرت کے عاداتِ جاریہ کے خلاف ہوتے ہیں لیکن اس کے خلاف ہونے سے معجزہ کا استحالہ لازم نہیں آتا، عادتِ جاریہ یہ ہے کہ ہر انسان کا بچہ دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ دو پاؤں لیکر بطنِ مادر سے باہر آتا ہے، مگر اس عادتِ جاریہ کے خلاف مستثنیات بھی ہوتے ہیں، جو گو کبھی کبھی ہوتے ہیں مگر ہوتے ہیں اسی طرح معجزات اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانونِ قدرت کے خلاف نہیں ہوتے البتہ روزمرہ کے مشاہدات کے خلاف ہوتے ہیں، لیکن چونکہ خدا کے تمام قوانین کا ہمکو احاطہ نہیں، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہوتے ہیں، مگر

ان تمام تصریحات کے باوجود کتاب الکلام کی اشاعت کے دس برس بعد جب بعضوں کو یہ مغالطہ پیش آیا کہ مصنف نے "ملاحدہ کے اعتراضات" کے تحت میں قدم عالم کی نسبت ملحدین کے جو خیالات نقل کئے ہیں وہ مصنف کے اقوال ہیں، تو مصنف نے دہلی میں ۹ مئی ۱۹۱۴ء حسب ذیل اعلان شائع کیا:

"جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں، الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کئے گئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔"

ان تصریحات سے ناظرین پر روشن رہے کہ قدمِ عالم کا عقیدہ مصنف کے نزدیک اسلام کے خلاف ہے، اور وہ عالم کو حادث اور مخلوق تسلیم کرتا ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ حدوثِ عالم پر متکلمین اور فلاسفہ کے پیش کردہ دلائل کو نہایت کمزور سمجھتے ہیں، اور اس لئے ان دلائل کے ذریعہ خدا کے اثبات کے طریقہ کو صحیح نہیں مانتے اور اس طریقہ کو صحیح سمجھتے ہیں جس سے قرآن مجید نے ان کے نزدیک خدا کے وجود پر استدلال کیا ہے، غرض اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مصنف حدوثِ عالم کے قائل نہیں، وہ حدوثِ عالم کے قائل ہیں لیکن اس صحیح دعویٰ کے ثابت کرنے کیلیے متکلمین اور فلاسفہ کی دلیلوں کی صحت کے قائل نہیں،

بحث نبوت مصنف نے اسی طرح نبوت کے مباحث میں ایک باب میں مخالفین کے

کافی ہیں جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلبیع کیا کام دے سکتی ہے"۔ (صفحہ ۱۲۰ و ۱۲۱)

غرض مصنف کو معجزات یا خرقِ عادت سے انکار نہیں، البتہ ان کے نزدیک نبوت کی شناخت کا معیار خرقِ عادت نہیں بلکہ اسکی تعلیمات اور ہدایات ہیں، ساتھ ہی وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبروں سے خارقِ عادت امور سرزد ہوئے ہیں لیکن ان امور کے تسلیم کرلینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح اور مستند طریقہ سے مروی ہوں، مصنف کا قول ہے،

"بہر حال خرقِ عادت (بمعنی عام) سے کسی کو انکار نہیں، جو کچھ بحث ہے، وہ واقعات میں ہے، جو خرقِ عادت جس درجہ مستبعد ہو اُسی نسبت سے اگر اس کے ثبوت کی شہادت قوی ہو گی تو اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں"۔ (صفحہ ۸۵ و ۸۶)

پھر مصنف آگے کہتے ہیں،

"البتہ چونکہ خرقِ عادت کوئی معمولی چیز نہیں، اس لئے یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ جب تک اس کے ثبوت کی قطعی شہادت موجود نہ ہو ہم اس پر اعتبار نہ کریں، قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے، اس لئے جہاں اس میں خرقِ عادت کا ذکر ہو گا واجب التسلیم ہو گا لیکن پہلے یہ امر نہایت غور اور دقتِ نظر سے طے کرنا پڑیگا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں،

مفسرین میں جو محقق گذرے ہیں، مثلاً قفال، ابو مسلم اصفہانی، ابو بکر اصم وغیرہ ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرقِ عادات مذکور ہیں، اور جو واقعی

واقعہ ایسا نہیں، یہی بات شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی فرمائی ہے،

مصنف کا بیان ہے:۔

"خرقِ عادت کے منکرین کا تمامتر استدلال یہ ہے کہ خرقِ عادت قانونِ فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز قانونِ فطرت کے خلاف ہے، وہ ممتنع ہے اس دلیل کے دوسرے مقدمہ سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن پہلے مقدمہ کے ثابت ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا فطرت کے تمام قوانین منضبط ہو چکے ہیں، کیا اس پر اطمینان ہو چکا ہے کہ ہم جن امور کو قانونِ فطرت سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت قانونِ فطرت ہیں، علومِ جدیدہ کی تحقیقات اور تجربہ نے سینکڑوں ایسے قانون دریافت کئے جو پہلے معلوم نہ تھے، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے"۔ (ص ۱۲۱)

قرآنِ پاک میں جو خارقِ عادت معجزات مذکور ہیں ان کے متعلق سرسید کی تاویلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقہ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے

"ترقی کا سلسلہ خود انسان کی نوع میں قائم ہے، یہاں تک کہ قوائے عقلیہ ذہن وذکا، صفائی باطن، اور پاکیزہ خوئی میں ترقی کرتے کرتے انسان ملکوتیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے، یہی مرتبہ ہے جس کو ہم نبوت اور رسالت سے تعبیر کرتے ہیں"

اس سے بعض بدگمانوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے، کہ مصنف کے نزدیک جو چاہے ترقی کرکے پیغمبر بن سکتا ہے، یہ بدگمانی مصنف پر سراسر افترا ہے، علم الکلام کی عبارت بالا حکیم ابن مسکویہ کی عبارت ہے جس کو مصنف علم الکلام سے کوئی تعلق نہیں، مصنف نے اس کتاب میں بڑے بڑے متکلمین اور حکما کے اصولی مسائل اعتقادیہ نقل کئے ہیں، اسی سلسلہ میں ابن مسکویہ کے خیالات کی تشریح میں اس کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے، اور اس قول کا بھی یہ مطلب نہیں کہ جو چاہے ترقی کرکے نبی بن جا سکتا ہے، بلکہ اس نے یہ دکھایا ہے کہ کائنات میں تدریجی ترقی ہے، جمادات نباتات، حیوانات اور انسان میں عقل واحساس کی تدریج ترقی ہوتی ہے، پھر انسان کے مختلف طبقوں میں عقل واحساس اور تزکیہ وتقدس میں ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک فلاسفہ وحکما تک کا وجود ہوتا ہے، اب اس سے آگے بھی ایک طبقہ ہے جو اپنے قوائے عقلیہ وتقدس واخلاق میں انسانی ترقی کے انتہا ہوتے ہیں، اور وہی پیغمبر ہیں، اسی تقریر کو امام غزالی نے بھی نقل کیا ہے جو الکلام کے صنہ میں درج ہے، اس باب میں مصنف کا عقیدہ اس کے حسب ذیل بیان سے ظاہر ہے جو اس کتاب کے صفحہ ۱۳۵ میں ہے۔

"نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، اجزا سے ... سے مرکب ہے ....

.... اس کے علوم ومعارف اکتسابی نہ ہوں، بلکہ من جانب اللہ ہوں"

مذکور ہیں ان کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔" (ص۱۳۴ و ۱۳۵)

مصنف نے معجزات کے سلسلہ میں اشاعرہ کے اس خیال کی سختی سے تردید کی ہے کہ عالم میں اسباب وعلل کا وجود نہیں، اور ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کو سرتاسر اسباب وعلل پر قائم کیا ہے، اس لئے معجزات کا ظہور بھی اسباب وعلل کے تحت میں ہوتا ہے گو ہم کو ان کا علم نہ ہو،

اس مسئلہ کی تعبیر اگر میں اپنے مذاق کے مطابق کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ معجزات کے صدور سے کسی فریق کو انکار نہیں، اور یہ بھی مسلم ہے کہ معجزات کا صدور درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیت سے ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اذن اور مشیت، اسباب وعلل کے توسط کے بغیر کام کرتی ہے، یا اسباب وعلل کے توسط سے، اشاعرہ کا خیال ہے کہ مشیت الٰہی اسباب وعلل کے توسط کے بغیر براہ راست کام کرتی ہے، اور دوسروں کا خیال یہ ہے کہ مشیتِ الٰہی اسباب وعلل کے توسط سے اس کام کو انجام دیتی ہے، اور یہ اسباب وعلل خود اسی کے بنائے ہوئے ہیں، جس طرح دنیا کے معمولی واقعات ہر روز مشیتِ الٰہی سے انجام پاتے ہیں لیکن مشیتِ الٰہی ان میں سے ہر کام اسباب وعلل کے ذریعہ کرتی ہے، اور اس سے مشیتِ الٰہی کا تعطل لازم نہیں آتا، اس طرح معجزات گو مشیت الٰہی سے صادر ہوتے ہیں لیکن یہ مشیتِ الٰہی غیر معمولی اسباب وعلل کے ذریعہ سے وجود پذیر ہوتی ہے اور اس سے مشیت الٰہی کا تعطل نہیں ہوتا،

| نبوت اکتسابی | مصنف کی کتاب علم الکلام میں حسب ذیل عبارت ہے، |

حاصل ہوتی ہے اسی کا نام عذاب وثواب ہے، اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہیں (ص۱۴۱)

کا یہ مطلب ہے کہ اچھے کاموں سے جو سعادت اور بُرے کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے اور جو خود ان افعال کا لازمی نتیجہ ہے، وہی آخرت میں عذاب وثواب کی صورت میں ظاہر ہوگی، اور اسی سے سعید انسان کو جنت کی نعمتیں ملیں گی اور شقی کو دوزخ کی تکلیفیں پہنچیں گی اس کے سوا اگر مصنف کے ان الفاظ کا کوئی اور مطلب ہو تو وہ درست نہیں بلکہ عقائدِ اسلام کے خلاف ہوگا،

آخر میں ضروری ہے کہ الکلام کے بعض مضامین کی نسبت مصنف نے مئی ۱۹۱۴ء میں جو اعلان کیا تھا، اس کو یہاں شامل کر دیا جائے، تاکہ مصنف کے خیالات کی نسبت ناظرین کو غلط فہمی نہ ہو،

مصنف کا اعلان | ۱۔ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ "مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے"، وہ ملحد و زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں، الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں، اور اس غرض سے نقل کئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے،

۲۔ نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں کہ وہ اکتسابی ہے، اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا یقین کرتا ہوں، اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اُس کو مسلمان نہیں جانتا،

عذاب و ثواب | ص ۱۴۶ میں معاد اور عذاب و ثواب کا عنوان ہے، اس کے تحت میں عذاب و ثواب کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اس کا یہ منشا نہیں کہ اچھے اور برے اعمال کا جو اچھا یا برا اثر نفس پر پڑتا ہے، اسی کا نام عذاب و ثواب ہے، بلکہ وہ ملحدین کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگناہ پر سزا دینے سے کیا حاصل ہے، چنانچہ مصنف کہتا ہے،

"ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا کو گناہ پر عذاب دینے سے کیا حاصل......

......لیکن عذاب و ثواب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی، اس کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ملاحدہ کا اعتراض خود بخود اُٹھ جاتا ہے" (ص ۱۴۶ و ۱۴۷)

جواب کا حاصل یہ ہے کہ خدا کسی کو اپنے غصہ یا انتقام کے سبب سے عذاب نہیں دیگا، بلکہ اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق اچھے اور بُرے ہر عمل کا ایک اثر اور نتیجہ مقرر ہے جس طرح دنیا میں ہر شے کا خاصہ اور اثر ہے جو لازماً اس شے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، سنکھیا کھانے سے آدمی مرجاتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے سنکھیا کھانے سے خدا خفا ہوگیا، اور اُس کو موت کی سزا دیدی، بلکہ اس کے کھانے کا جو اثر خدا نے مقرر کردیا ہے، اس کا ظہور ہوا، اسی طرح اعمال اور کاموں کے خواص اور نتائج بھی اس نے مقرر کردیئے ہیں، اور وہی عذاب و ثواب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں،

امام غزالی نے جواہر القرآن میں جو تقریر کی ہے اور جس کو مصنف نے نقل کیا ہے اسکا یہی مطلب ہے، اور مصنف کے ان الفاظ:

"غرض اچھے [illegible] جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے، اور بُرے کاموں سے جو شقاوت

۴۸۶

فہرست مضامین

الکلام

٣- باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے حنفی[1] ہوں،

شبلی نعمانی دہلی

(٤ جمادی الاولی ١٣٣٢ھ)

لہذا مصنف کی اس کتاب کو اسی اعلان کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے، کہ مصنف کا اخیر مسلک یہی ہے،

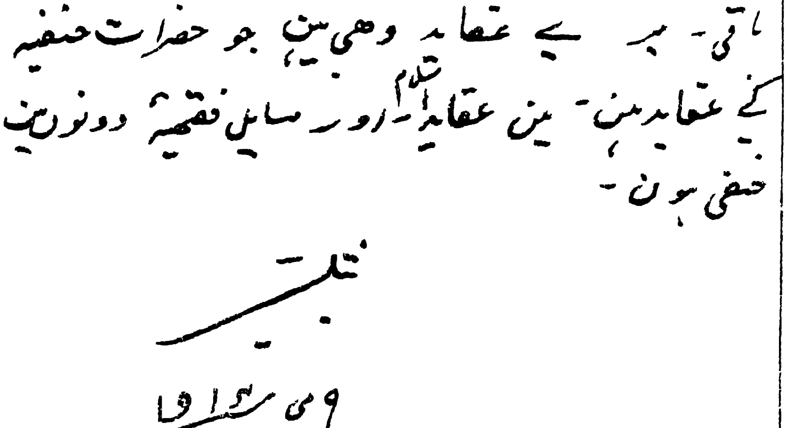
سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظم گڑھ   ٢٠ جمادی الثانیہ ١٣٥٥ھ

---

[1] مولانا نے اصل مسودہ میں حنفی لکھا تھا، مگر چونکہ سید عبد السلام صاحب مالک مطبع فاروقی جنھوں نے اس اعلان کو دہلی میں چھاپا تھا، اہل حدیث تھے، اس لئے ان کے کہنے سے مولانا نے اسکو بدل کر اہلسنت لکھدیا، "س"

عکس خط مصنف مرحوم



باقی میرے عقاید وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقاید ہیں۔ میں عقاید اسلام اور مسایل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔

شبلی

٩ مئی ١٩١٤

دیباچہ

مذہب اسلام تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے،

عقائد، عبادات، اخلاق،

عقائد میں اصل الاصول دو ہیں، وجود باری اور نبوت، اس کتاب میں انہی دو اصول سے بحث ہے، باقی مباحث تبعاً او ضمناً آگئے ہیں،

قرآن مجید کا کلام الٰہی ہونا مہمات عقائد میں ہے لیکن اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے، اس لئے اس حصہ میں میں نے اس سے بحث نہیں کی، بلکہ اس کو ایک مستقل کتاب کے لئے اٹھا رکھا ہے جو الکلام کا دوسرا حصہ ہوگا، اور جس کا نام علوم القرآن ہوگا، عبادات اور اخلاق کا بیان بھی اسی کتاب میں آجائیگا، اس طرح علم کلام کا سلسلہ تین جلدوں میں پورا ہو جائیگا، متکلمین کی سوانحمریاں اس سلسلہ سے الگ ہیں، خدا ان کے اتمام کے بھی اسباب بہم پہنچائے،

شبلی نعمانی

حیدرآباد (دکن)

لیکن انھوں نے خود جا بجا مختلف کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ان تصنیفات میں جو باتیں مذکور ہیں وہ اصلی حقائق نہیں ہیں، بلکہ عوام کے عقائد کے محفوظ رکھنے کے لئے ہیں،

امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ کتب متداولہ میں انھوں نے اصل حقیقت ظاہر نہیں کی،

جواہر القرآن[۵] میں جہاں علوم قرآنی کا بیان کیا ہے لکھتے ہیں:-

الثانی هو محاجة الکفار ومجادلتهم ومنه	دوسرا علم کافروں سے بحث ومجادلہ کرنا ہے اور
ینشعب علم الکلام المقصود لرد الضلال	اسی سے علم کلام پیدا ہوتا ہے جس کا مقصود
والبدع وازالة الشبهات ویتکفل به	ہے کہ بدعتوں کو رد کیا جائے اور شبہے زائل کئے جائیں
المتکلمون وهذا العلم قد شرحناه	اور اس علم کے متکفل متکلمین ہیں اور ہم نے اس
علی طبقتین سمینا الطبقة القریبة منها	علم کو دو انداز پر لکھا ہے، جو معمولی ہے اسکا نام
الرسالة القدسیة والطبقة التی	رسالہ قدسیہ ہے اور جو اس سے بلند تر ہے اس کا
فوقها الاقتصاد فی الاعتقاد ومقصود	نام الاقتصاد فی الاعتقاد ہے اور مقصود اس علم کا
هذا العلم حراسة عقیدة العوام عن	عوام کے عقیدہ کو بدعتوں کی رخنہ اندازی سے
تشویش المبتدعة ولا یکون هذا العلم	محفوظ رکھنا ہے اور اس علم میں حقائق
ملیا بکشف الحقائق وبجنسه یتعلق الکتاب الذی	ظاہر نہیں کئے جاتے اور اسی قسم کی ہماری کتاب وہ
صنفناه فی تهافة الفلاسفة والذی اوردناه	ہے جس کا نام تہافۃ الفلاسفہ ہے اور مستظہری
فی الرد علی الباطنیة فی الکتاب الملقب	جو باطنیہ کے رد میں ہے اور حجۃ الحق و قاصم الباطنیہ
بالمستظهری وفی کتاب حجة الحق وقاصم الباطنیة وکتاب مفصل الخلاف فی اصول الدین	وکتاب المفصل للخلاف فی اصول الدین،

[۵] جواہر القرآن کا کامل نسخہ میرے پاس موجود ہے لیکن اسکے کچھ اجزا بمبئی میں چھپ گئے ہیں اور یہ عبارت اسمیں موجود ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نتواں زگفتگو بہ حقیقت رسید لیک،

افسانۂ زگوہر نایاب سفتنی ست،

حامداً و مصلیاً

جدید علم کلام کا مایۂ خمیر اگرچہ جیسا کہ ہم پہلے حصہ کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں، وہی قدیم علم کلام ہے تاہم اس کی تدوین و ترتیب جس حیثیت سے ہونی چاہئے اس کے لحاظ سے اس کو جدید بھی کہہ سکتے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے،

تم پڑھ آئے ہو کہ علم کلام کے مختلف طریقے اور مختلف شاخیں ہیں ان میں جو طریقہ حقیقی علم کلام کہلانے کا مستحق تھا وہ قدمار کا علم کلام تھا لیکن قدمار کی ایک تصنیف بھی آج موجود نہیں، ملل و نحل، کتب کلامیہ اور تفسیر کبیر میں جستہ جستہ قدمائے کے اقوال مذکور ہیں ان تمام اقوال کو اس استقصا کے ساتھ جمع کرنا چاہئے کہ علم کلام کے اہم مسائل آجائیں،

متاخرین میں سے جو لوگ اہل حقیقت تھے انھوں نے یہ طرز اختیار کیا تھا، کہ درسی کتابیں عام مذاق کے موافق لکھتے تھے، اور اپنے اصلی خیالات و معتقدات دوسری کتابوں میں ظاہر کرتے تھے، جن کی نسبت یہ بھی تاکید کرتے تھے کہ عوام پر ظاہر نہ کی جائیں مثلاً علم کلام میں امام غزالی کی متعدد تصنیفات ہیں قواعد العقائد، اقتصاد، تہافتہ الفلاسفہ وغیرہ وغیرہ

اِرْتَاضَتْ نَفْسُهٗ وَاسْتَقَامَتْ عَلٰی سَوَاءِ السَّبِیْلِ	ہوگیا ہو اور دنیا کی خواہش بالکل باقی نہ رہی ہو اور
فَلَمْ یَبْقَ لَهٗ حَظٌّ فِی الدُّنْیَا وَلَمْ یَبْقَ لَهٗ طَلَبٌ	طلب حق کے سوا ان کی اور کچھ غرض نہ ہو، ان سب باتوں
اِلَّا الْحَقُّ وَرُزِقَ مَعَ ذٰلِكَ فِطْنَةً وَقَّادَةً وَ	کے ساتھ ذکی الطبع، خوش فہم، حدید الذہن، سلیم الطبع
قَرِیْحَةً مُنْقَادَةً وَذَكَاءً بَلِیْغًا وَفَهْمًا صَافِیًا	ہوں جس کے ہاتھ میں یہ تصنیف پڑ جائے اس پر حرام ہے
وَحَرَامٌ عَلٰی مَنْ یَقَعُ ذٰلِكَ الْكِتَابُ بِیَدِهٖ	کہ کسی شخص کے سامنے اسکو ظاہر کرے بجز ایسے شخص کے
اَنْ یُّظْهِرَهٗ اِلَّا عَلٰی مَنِ اسْتَجْمَعَ فِیْهِ هٰذِهِ الصِّفَاتُ	جس میں یہ تمام صفات جمع ہوں،

امام صاحب کے ان الفاظ پر خوب غور کرو، فرماتے ہیں کہ "اصلی حقائق لوگوں کے سامنے بیان کئے جائیں تو اُن کی سمجھ میں نہ آئیں، اور ان کو نقصان پہنچائیں"۔ اس پر شاید کسی کو خیال ہوتا کہ یہ تو عوام کی حالت ہے، علما کے سامنے اظہارِ حقائق میں کیا تامل ہو سکتا ہے، اس لئے جتا دیا کہ آج کل جو علما ہیں، وہ عوام ہی کے ہم پایہ ہیں،

مخاطب صحیح کے لئے بڑی قید یہ لگاتے ہیں کہ "دنیا سے اُسکو کسی قسم کی غرض نہ ہو"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حقائق اصلی کے ظاہر کرنے پر عوام برہم ہوتے ہیں، اسلئے اس منصب کا وہ مستحق ہے جس کو عوام کی کچھ پروا نہ ہو،

امام رازی کی نسبت ان کے حالات میں تم پڑھ آئے ہو کہ وہ اپنے اصلی خیالات کس کس غیر معمولی پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں، ابن رشد نے اپنی تصنیفات میں صاف لکھدیا ہے کہ جمہور کے سامنے اصلی حقائق ظاہر نہ کرنے چاہئیں،

اب جدید علم کلام کے مرتب کرنے والے کا یہ کام ہے کہ ان بزرگوں نے جن خزانوں کو

ان تصریحات سے قطع نظر کرکے امام صاحب کی کتابیں خود اس بات کی شہادت دے رہی ہیں، وہی عقائد جن کو کتب کلامیہ میں بڑے زور شور سے ثابت کرتے ہیں دوسری تصنیفات میں ان کی نسبت لکھدیتے ہیں کہ ان عقائد کی اصلی حقیقت کچھ اور ہی،

جن تصنیفات میں امام صاحب نے اسلام کے اصلی عقائد اور ان کے حقائق بیان کیے ہیں ان کو نہایت اہتمام سے مخفی رکھنا چاہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود مختصر اور سہل ہونے کے وہ رواج پذیر نہیں، خدا کی ذات، صفات، افعال اور قیامت کے متعلق عقائد کو انھوں نے احیاء العلوم وغیرہ میں نہایت تفصیل سے لکھا ہی لیکن جواہر القرآن میں لکھتے ہیں کہ

وَهٰذِهِ الْعُلُوْمُ الْاَرْبَعَةُ اَعْنِیْ عِلْمَ الذَّاتِ وَالصِّفَاتِ وَالْاَفْعَالِ وَعِلْمَ الْمَعَادِ اَوْدَعْنَا مِنْ اَوَائِلِهٖ وَمَجَامِعِهٖ الْقَدْرَ الَّذِیْ رُزِقْنَاهُ مَعَ قُصُوْرِ الْعُمْرِ وَكَثْرَةِ الشَّوَاغِلِ وَالْاٰفَاتِ وَقِلَّةِ الْاَعْوَانِ وَالرُّفَقَاءِ بَعْضَ التَّصَانِيْفِ لٰكِنَّا لَمْ نُظْهِرْهُ فَاِنَّهٗ يَكِلُّ عَنْهُ اَكْثَرُ الْاَفْهَامِ وَيَسْتَضِرُّ بِهِ الضُّعَفَاءُ وَهُمْ اَكْثَرُ الْمُتَرَسِّمِيْنَ بِالْعِلْمِ بَلْ لَا يَصْلُحُ اِظْهَارُهٗ اِلَّا عَلٰی مَنْ اَتْقَنَ عِلْمَ الظَّاهِرِ وَسَلَكَ فِیْ قَمْعِ الصِّفَاتِ الْمَذْمُوْمَةِ مِنَ النَّفْسِ طُرُقَ الْمُجَاهَدَةِ حَتّٰی

یہ چاروں علوم یعنی علم ذات وصفات وافعال ومعاد انکے ابتدائی اور جامع اصول، جہانتک مجھ کو معلوم ہو سکے میں نے بعض تصنیفات میں درج کئے، باوجود اسکے کہ فرصت کم اور آفتیں بہت تھیں اور دوست مددگار کمیاب تھے لیکن ان تصنیفات کو میں نے ظاہر نہیں کیا کیونکہ اکثر لوگ انکو سمجھ نہ سکتے اور ان سے انکو نقصان پہنچتا اور مدعیان علم اکثر اسی قسم کے ہیں، ان تصنیفات کو صرف ان لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا چاہئے، جنکو علم ظاہر میں کمال حاصل ہو چکا ہو اور صفات مذمومہ کے دور کرنے میں اس قدر کوشش کر چکے ہوں کہ انکا نفس آرام

علوم جدیدہ اور مذہب

تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہی کہ "علوم جدیدہ اور فلسفۂ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کردی ہی" فلسفہ اور مذہب کے معرکہ میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہی کہ فلسفۂ قدیمہ قیاسات اور ظنیات پر مبنی تھا، اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کرسکا، بخلاف اس کے فلسفۂ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہی، اسلئے مذہب کسی طرح اسکے مقابلہ میں جانبر نہیں ہوسکتا،

یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھکر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہی، لیکن ہمکو غور سے دیکھنا چاہئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہوگیا ہی،

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جسمیں طبعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبیعة سب کچھ شامل تھا لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اسکے دو حصے کردیئے جو مسائل، مشاہدہ اور تجربہ کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہوگئے انکو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے انکا نام فلسفہ رکھا،

مسائلِ جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہی کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں، اسمیں یہ پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے، کہ یورپ میں ان کی نسبت طبقۂ علماء میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہی، یورپ میں آج فلسفہ کے بیسوں اسکول ہیں، اور ان میں اس شدت سے اختلاف ہے

سر بہ مہر رکھا تھا، ان کو وقف عام کر دے،

قدیم علم کلام میں صرف، عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی کیونکہ اس زمانہ میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے تھے، عقائد ہی کے متعلق تھے، لیکن آجکل تاریخی، اخلاقی، تمدنی، ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے، یورپ کے نزدیک، کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر اس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں، ان کے نزدیک تعدد نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا، اس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنی ہوگی، اور یہ حصہ بالکل نیا علم کلام ہوگا،

سب سے بڑی ضروری چیز یہ ہے کہ دلائل اور براہین ایسے صاف اور سادہ پیرایہ میں بیان کئے جائیں کہ سریع الفہم ہونے کے ساتھ دل میں اُتر جائیں، قدیم طریقہ میں پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات، اور نہایت دقیق خیالات سے کام لیا جاتا تھا، اس طریقہ سے مخالف مرعوب ہوکر چپ ہو جاتا تھا، لیکن اس کے دل میں یقین اور وجدان کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی تھی،

غرض جدید علم کلام کے ترتیب دینے میں، انہی امور مذکورہ کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے، اخیر میں تخصیص کے ساتھ ان بزرگوں کے نام بتا دینے بھی ضرور ہیں، جو اس علم کلام کے ماخذ ہیں، اور وہ یہ ہیں، ابومسلم اصفہانی، قفال، ابن حزم، امام غزالی، راغب اصفہانی، ابن رشد، امام رازی، شاہ ولی اللہ،

مادہ ہے، اس گروہ نے مادہ کے متعلق نہایت عجیب عجیب اسرار معلوم کئے ہیں، یہی فرقہ ہی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب کا خدا کا روح کا منکر ہی لیکن درحقیقت وہ ان باتوں کا منکر نہیں بلکہ یہ کہتا ہی کہ ان چیزوں کا ثبوت ہمارے دائرۂ تحقیقات سے باہر ہے، پروفیسر لیتریہ (Lettre) جو اس گروہ کا بہت بڑا عالم ہی لکھتا ہی کہ "چونکہ ہم کائنات کے آغاز اور انجام سے ناواقف ہیں، اسلئے ہمارا یہ منصب نہیں کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا یہ کام بھی نہیں کہ ہم اسکو ثابت کریں، مادی مذہب اپنے آپ کو عقل اوّل کے وجود کی بحث سے بالکل الگ رکھتا ہی کیونکہ اس کو اسکے متعلق کسی قسم کا علم نہیں، ہم حکمتِ الٰہی کے نہ منکر ہیں نہ مثبت، ہمارا کام نفی و اثبات سے بالکل الگ رہنا ہی،

فرانس کے ایک طبی رسالہ میں ایک دفعہ ایک مضمون چھپا تھا، کہ ادراک و فکر اس فاسفورس سے پیدا ہوتا ہی، جو دماغ میں ہی اور فضائلِ انسانی مثلاً شجاعت، اخلاص، شرافتِ نفس، یہ سب اعضاے انسانی کے کہربائی تموجات ہیں" اس پر فرانس کے ایک مشہور فاضل کامل فلامریان نے جو طبعیات کا بڑا ماہر ہے، ایک مضمون لکھا جس میں اس نے مضمون نگار سے اس طرح خطاب کیا،

یہ کس نے تم سے کہا؟ لوگوں کو گمان ہوگا کہ تمہارے استادوں نے تمکو یہ سکھایا ہوگا، لیکن یہ گمان صحیح نہیں، میں نہیں جانتا کہ یہ بیہودہ دعویٰ زیادہ تر قابلِ تعجب ہے یا مدعیانِ علم کی جرأت؟ نیوٹن جب کوئی مسئلہ بیان کرتا تھا تو کہتا تھا کہ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہی" کیلر کہا کرتا تھا کہ "تم ان چیزوں کو فرض کرلو" بخلاف اس کے تم لوگ کہتے ہو کہ

کہ اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہی اور سیاہ بھی۔
اب دیکھنا چاہیئے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہی، سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہی، مذہب کو اُن سے مطلق سروکار نہیں، عناصر کس قدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے؟ نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کس قدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں، مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہی وہ یہ ہیں: خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و شر یا نیکی و بدی کوئی چیز ہی یا نہیں؟ ثواب و عقاب ہی یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہی جسکو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہی؟ سائنس کے اساتذہ نے جب کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہمکو ان چیزوں کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطہ سے باہر ہیں، یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیونکہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں جو تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں، کوتاہ نظر عدمِ علم سے علمِ عدم سمجھ جاتے ہیں، سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں، کوتاہ بین اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہمکو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہی، حالانکہ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے،

یورپ میں تقسیمِ عمل کے اصول پر عمل ہی یعنی تمام اہلِ فن نے اپنے اپنے کام تقسیم کر لئے ہیں اور ہر فرقہ اپنے کام میں اس طرح مشغول ہی کہ اس کو دوسری چیزوں سے مطلق غرض نہیں، ان میں ایک فرقہ مادیین (میٹریسٹ) کا ہے، جس کا موضوعِ بحث

جو فزیکل سائنس کا بڑا عالم ہے کہتا ہے کہ "زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے" فرانس کے ایک مشہور میگزین نے ایک مضمون میں بیان کیا تھا، کہ دماغ میں جو فاسفورس ہے فکر اسی کا ایک نتیجہ ہے اور جس چیز کو اخلاص، شجاعت اور فضیلت کہتے ہیں وہ اعضائے جسمانی کی کہربائی موجیں ہیں"

کیا یہ رائیں قطعیات میں شمار ہو سکتی ہیں؟ کیا ان کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ علوم جدیدہ نے روح کو باطل ثابت کر دیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کے حدود بالکل الگ الگ ہیں، سائنس کا جو موضوع ہے، مذہب کو اس سے کچھ واسطہ نہیں اور مذہب کو جن چیزوں سے بحث ہے، سائنس کو ان سے کچھ غرض نہیں فلسفہ البتہ کہیں کہیں مذہب سے ٹکرا جاتا ہے لیکن قطعیات اور یقینیات میں اس کا شمار نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسکے مختلف اسکول ہیں، اور ان اسکولوں میں باہم نہایت سخت اختلاف ہے، ان میں سے بعض خدا کے منکر ہیں تو بہت سے خدا کے قائل بھی ہیں، وجودِ روح کے مقر بھی ہیں اور منکر بھی، اخلاق کے اصول ایک فرقہ کے نزدیک کچھ ہیں اور دوسرے کے نزدیک کچھ اس حالت میں مذہب اس لحاظ سے مطمئن رہتا ہے کہ

چو دیدی کہ در دشمن افتاد جنگ

خلط مبحث اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب سائنس اور مذہب دونوں میں سے کوئی اپنی حد سے بڑھکر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے اور یہی خلط مبحث تھا، جس نے ملاحدہ اور منکرینِ مذہب کے خیالات کو قوت دی بلکہ درحقیقت اسی مبحث نے الحاد اور بیدینی کے

"ہم ثابت کرتے ہیں، ہم باطل کرتے ہیں، یہ موجود ہی، یہ معدوم ہی. علم نے فیصلہ کر دیا ہی
اور علم نے یہ ثابت کر دیا ہی" حالانکہ تمھارے ان دعووں میں علمی دلائل کی جھلک بھی نہیں تم
اپنی حماقت سے دلیری کر کے علم پر اس قدر بڑا بار ڈالا دیتے ہو؟ جو باتیں تم کہتے ہو اگر علم
کے کان میں پڑ جائیں (اور پڑنی ہی چاہئیں کیونکہ تم علم کے فرزند ہو) تو تمھاری حماقت پر اس کو
ہنسی آجائیگی، تم کہتے ہو کہ "علم مثبت ہی، نافی ہے، آمر ہے، ناہی ہی" یہ باتیں کہکر غریب علم
کے ہونٹوں پر ایسے بڑے بڑے بھاری الفاظ رکھدیتے ہو جس سے ممکن ہی کہ اُسکے دل میں
غرور آجائے، عزیزو! علم ان تمام مسائل میں سے نہ کسی کا اثبات کرتا ہی، نہ انکار"

یہ ہے ماہرین فن کی رائے لیکن بعض کم درجہ کے مادئین، اپنی حد سے بڑھکر نفی کا
دعویٰ بھی کر بیٹھتے ہیں، اور انہی کی طمع کاریاں ہیں جس نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کی آنکھوں
کو خیرہ کر دیا ہی، اسلئے ہمکو زیادہ غور و فکر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے دعویٰ پر کس قسم کے
دلائل قائم کرتے ہیں، مثال کے لئے ہم ایک اہم مسئلہ یعنی روح کے وجود کے متعلق انکے
اقوال نقل کرتے ہیں،

ڈاکٹر شفلر (SHEFFLER) کہتا ہی کہ "روح مادہ ہی کی ایک قوت کا نام ہی
جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہی" دیرشو کا قول ہی کہ "روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے"
بوشنر (BUCHNER) کہتا ہی کہ "انسان صرف مادہ کا ایک نتیجہ ہے" دو بموا ریمو
(DU:BAIS:REYMOND) کہتا ہی کہ "تمام اعصاب میں ایک کہربائی تموج پایا جاتا ہی
اور جس کو فکر کہتے ہیں وہ مادہ ہی کی ایک حرکت کا نام ہی" دو دوترشیہ (DU. DUTYOCHE)

زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد، کتابِ مقدس کے خلاف ہے،

غرض ہر قسم کی علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے، تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا ان کی کوششیں بے کار گئیں، اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھولے اور پھلے،

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا، اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہو گئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے، وہ علم اور حقیقت کے خلاف ہے، یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے،

بے شبہہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو وہ سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا لیکن اسلام نے پہلے ہی دن کہدیا تھا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو، یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علومِ جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں، معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں،

اس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اس قدر اختلاف رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی، یہ تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی، بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیتا تھا، یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور اکتشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں

خیالات پیدا کر دیئے، یورپ میں پہلے مذہب کو اس قدر وسیع کر لیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا، چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکویزیشن قائم ہوئی تھی، جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے، چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی ۱۴۸۱ء سے لیکر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دیئے گئے، اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جنمیں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دیئے گئے،

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا کو پرنیکس نے نظام بطلیموسی سے انکار کر کے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں، اس پر مجلس انکویزیشن نے فتویٰ نافذ کیا کہ یہ رائے، کتاب مقدس کی مخالف ہے اور اس بناء پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے،

گلیلو نے جو دوربین کا موجد گذرا ہے، ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جسمیں یہ ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے، اس پر مجلس انکویزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے، چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا تو قیدخانہ بھیجدیا گیا اور دس سال تک محبوس رہا،

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرہ کے دریافت ہونے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ، مذہب کے خلاف ہے،

والحیوانات ومقادیر سیر الشمس والقمر واسباب
الحوادث الیومیۃ وقصص الانبیاء والملوک
والبلدان ونحوھا اللّٰھم الا کلمات یسیرۃ
الفھا اسماعھم وقبلھا عقولھم یؤتی بھا
فی التذکیر بآلاء اللہ والتذکیر بایام اللہ
علی سبیل الاستطراد بکلام اجمالی یسامح
فی مثلہ بایراد الاستعارات والمجازات
ولھذا الاصل لما سألوا النبی عن لمیۃ
نقصان القمر وزیادتہ اعرض اللہ تعالیٰ
عن ذالک الی بیان فوائد الشھور فقال
یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس
والحج،

اور حیوانات کے عجائبات یا چاند سورج کی رفتار
یا روزانہ حوادث کے اسباب، یا انبیا، اور سلاطین کے قصے
شہروں کے حالات بیان کرنا ان چیزوں سے وہ بحث
نہیں کرتے مگر ہاں چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان آشنا
ہو چکے ہیں اور انکی عقلوں نے ان باتوں کو قبول کر لیا ہے
ان باتوں کو بھی انبیا علیہم السلام خدا کی شان اور
قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً بیان کرتے ہیں اور
اسمیں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں، اور یہی
وجہ ہے کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلعم سے چاند کے
گھٹنے بڑھنے کی علت دریافت کی تو خدا نے اسکے جواب سے
اعراض کیا اور اسکے بجائے مہینوں کی تعیین کا فائدہ
بیان کر دیا چنانچہ فرمایا ویسئلونک الآیہ

شاہ صاحب نے انبیاء کی تعلیم کا جو اصول بتایا اسکے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مذہب اسلام کو سائنس اور علوم جدیدہ سے کسی قسم کے خطرہ پہنچنے کا احتمال ہے،

کی گئی، قدماے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہی یعنی آسمان پر ایک دریا ہی، بادل اسی سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں، آفتاب، پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہی، زمین مسطح ہے کروی نہیں، ستارے جو ٹوٹتے ہیں، شیاطین کے شعلہ ہاے آتشیں ہیں، مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے، چنانچہ امام رازی نے مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کئے ہیں،

لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبعیات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی، باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں کہا، معتزلہ کو محدثین اس بناپر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اس بناپر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں، غرض جس حد تک تحقیق و تفتیش کیجائے، عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا، بلکہ محققین نے صاف تصریح کردی کہ اسباب کائنات اور مسائل ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں، اور انبیا کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں،

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

وَمِنْ سِیَرِھِمْ اَنْ لَّا یَشْتَغِلُوْا بِمَا لَا یَتَعَلَّقُ بِتَھْذِیْبِ النَّفْسِ وَسِیَاسَۃِ الْاُمَّۃِ کَبَیَانِ اَسْبَابِ حَوَادِثِ الْجَوِّ مِنَ الْمَطَرِ وَالْکُسُوْفِ وَالْھَالَۃِ وَعَجَائِبِ النَّبَاتِ

انبیاء کا ایک اصول یہ ہی کہ جو امور تہذیب نفس اور قوم کی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے انہیں وہ مشغول نہیں ہوتے مثلاً بارش، گرہن، اور ہالہ کے اسباب بیان کرنا یا نبات

ان مصائب اور مشکلات کے مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے اس کو کوئی جسمانی ہتھیار نہیں دیا، کیونکہ جن بے شمار اور برنز ورد شمنوں کا اسکو سامنا کرنا تھا، اسکے لئے کوئی جسمانی آلہ کافی نہیں ہو سکتا تھا، قدرت نے اُس کو ان ہتھیاروں کے بدلے ایک ایسی عام قوت عطا کی جس کے ذریعہ سے اس نے ہر قسم کے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جدا سامان تیار کئے، دھوپ، گرمی، جاڑے سے محفوظ رہنے کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے، جانوروں کے مقابلہ کیلئے تیغ و خنجر تیار کئے، دریاؤں پر پل باندھے، پہاڑ تراشے، لوہا پگھلایا، برق کو مسخر کیا، ہوا کو تھاما، غرض تھوڑے عرصہ کے بعد دیکھا تو تمام کائنات اسکے پنجۂ اقتدار میں تھی،

عقل اس عام قوت کا نام عقل کلی یا عقل انسانی ہے، لیکن چونکہ قدرت کو منظور تھا کہ انسان کی ترقیاں بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر ٹھہرنے نہ پائیں، اسلئے وہ (یعنی قدرت) ایک دم بھی انسان کو چین نہیں لینے دیتی، وہ اس کے مخالفوں کو نئے نئے ہتھیار دیتی جاتی ہی، جس سے انسان پر نئے نئے طرح کے حملے کئے جاتے ہیں، جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو چکا تھا، انکے علاوہ نئے امراض پیدا ہوتے ہیں، دنیا کا جغرافیہ جس قدر معلوم ہو چکا تھا، اسکے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہی اور نئے ضروریات پیش آتے ہیں، آرام و آسایش کے جو سامان مہیا ہو چکے تھے، راحت طلبی کا مادہ بڑھکر وہ سامان بیکار ہو جاتے ہیں، مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کیلئے نئی تیاریاں کرتا ہی، اور اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا، اس سے آگے نکل جاتا ہی،

عالم کون اور انسان کی یہ باہمی کشمکش ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہی اور جسکی بدولت آج سینکڑوں ہزاروں نئے نئے ایجادات کا سلسلہ قائم ہی اور روز بروز بڑھتا

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہی

انسان[1] اور حیوان کا مقابلہ کرو، حیوان اپنی ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہی ان کا لباس انکے ساتھ ہوتا ہی جو موسم کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہی، دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجے، ناخن، ڈنک کے ہتھیار اسکے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، جن غذاؤں پر اس کی زندگی کا مدار ہی پیدا ہونے کے ساتھ اسکو ہر طرف، جنگل ہو یا پہاڑ، خشکی ہو یا دریا، ویرانہ ہو یا آباد، ہر جگہ مہیا ملتی ہیں،

انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہی تو کسی قسم کا سامان اسکے پاس نہیں ہوتا، اسکی جلد نازک ہوتی ہے، ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں، جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا، دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے، اسکے ساتھ عالم فطرت کی جتنی چیزیں اسکے گرد و پیش ہوتی ہیں سب کی سب اُسکی دشمن نظر آتی ہیں، آفتاب کی گرمی، بادلوں کی جھڑی، لوؤں کی لپٹ، جاڑوں کی ٹھنڈ، ہر چیز چاہتی ہی کہ اسکو تباہ کر دے،

[1] اس موقع پر یہ جتا دینا ضروری ہی کہ اس حصہ میں ہمنے جا بجا یورپ کے حکما اور علما کے اقوال نقل کئے ہیں لیکن ہمنے انکی اصلی تصنیفات کے دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہی بلکہ مصر کے ایک فاضل مصنف کی تصنیفات پر اعتماد کیا ہی جس کا نام فرید وجدی بک ہے اس بحث میں اسکی دو تصنیفیں ہیں تطبیق الدیانۃ الاسلامیہ اور الحدیقۃ الفکریۃ، یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جن یورپین فاضلوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں انمیں سے اکثر جرمن اور فرنچ کے علما ہیں ہمارے نئے تعلیم یافتہ احباب کو جو انگریزی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے انکے ناموں کے متعلق غلطی نہ کرنی چاہئے،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

اپنا منہ سب طرف سے موڑ کر دین کی طرف کر یہ وہ خدا کی فطرت ہی جس پر خدا نے انسان کو مخلوق کیا ہی، خدا کی خلقت میں تغیر نہیں ہوتا، یہی ٹھیک دین ہی لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں

جرمنی کا ایک حکیم کسلر لکھتا ہی کہ "مذہب ایک بڑی چیز ہی کیونکہ مذہب جس حاسہ کا نتیجہ ہی وہ کسی زمانہ میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا، فرانس کا مشہور فاضل معلم رینان جو مذہب کا پابند تھا اپنی کتاب تاریخ مذہب میں لکھتا ہی، کہ یہ ممکن ہی کہ کل وہ اشیاء جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہی کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اسکی قوت میں زوال آجائے، وہ ہمیشہ اس بات کا علانیہ ثبوت دیگا کہ مادی مذہب (میٹریسٹ) بالکل غلط ہی جو یہ چاہتا ہی کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے"۔

پروفیسر سبیٹر (SABATER) فلسفۂ دینیہ میں لکھتا ہی "میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہی، لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہی، میں نے خود اپنی رائے پر یہی اعتراض کیا ہی، لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہی اور وہ حل نہیں ہوتا، مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہی، اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے، مذہب کے شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے ہیں، لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی ہی اور اس نے نئے نئے برگ و بار پیدا کر لئے ہیں، اس بنا پر مذہب ایک بڑی چیز ہی جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی

---

[۱] یہ دونوں قول تطبیق الدیانۃ الاسلامیۃ صفحہ ۲۴ و ۲۵ میں مذکور ہیں،

جاتا ہی لیکن ان بیرونی دشمنوں اور مخالفوں سے زیادہ سخت اور زیادہ خطرناک دشمنوں کا ایک اور گروہ ہی جو خود انسان کے اندر موجود ہی اور جن سے اسکو ہمیشہ سخت معرکہ آرائیاں رہتی ہیں طمع اسکو آمادہ کرتی ہی کہ عزیز و بیگانہ، دوست و دشمن، دور و نزدیک کے تمام دولت و مال پر قبضہ کر لیا جائے، کینہ پروری کا تقاضا ہی کہ مخالفوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، جاہ طلبی کہتی ہی کہ جب تک تمام عالم کی گردنیں جھک نہ جائیں، آرام نہ لے، خواہش نفس مجبور کرتی ہی کہ دنیا میں کسی کا پردۂ عصمت محفوظ نہ رہنے پائے، ان دشمنوں سے بچانے کے لئے ایک حد تک عقل کام آتی ہی، وہ بتاتی ہی کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کروگے تو وہ بھی کریگا، تم کسی کو برباد کرنا چاہوگے تو وہ بھی چاہیگا، تم دوسروں کی عزت نہ کروگے تو وہ بھی نہ کریں گے، لیکن اولاً تو اس قسم کی پیش بینی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہوسکتی ہی، اسکے علاوہ بہت سے ایسے موقع پیش آتے ہیں جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا، حکومت کا خوف، جاسوس کا ڈر، بدنامی کا احتمال، انتقام کا خطرہ، ایک چیز بھی نہیں ہوتی، ان موقعوں پر عقل اُن پُرزور مخالفوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ ایک دوسری قوت ہے، جو سینہ سپر ہوتی ہی اور انسان کو ان دشمنوں کے حملہ سے بچاتی ہی، اس قوت کا نام نورِ ایمان، کانشنس، حاسۂ اخلاقی ہے، اور یہی چیز مذہب کی بنیاد ہے، ایمان

یہ قوت انسان کی اصل فطرت میں داخل ہی، عالم و جاہل، رذیل و شریف، شاہ و گدا، افریقہ کا وحشی، اور یورپ کا تعلیم یافتہ، سب اسمیں برابر کے حصہ دار ہیں، اور یہی معنی ہیں قرآن کی اس آیت کے،

زیادہ ہو نہیں سکتی، سکندر و تیمور، ارسطو و افلاطون، ہومر و فردوسی، اسی فیاضی کے نمونے ہیں، دوسری طرف یہ تجمل ہے کہ انسان اور بندر میں اتنا کم فرق رہ جاتا ہے کہ ڈارون کو نظر تک نہیں آتا، بایں ہمہ جو باتیں شرط زندگی اور مدار حیات ہیں وہ تمام افراد انسانی کو یکساں عطا کی ہیں، افریقہ کا جاہل سے جاہل وحشی بھی اسی طرح کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا، سوتا، جاگتا، بولتا، چالتا ہے جس طرح یونان کا بڑے سے بڑا حکیم ان ضروریات کو انجام دیتا ہے،

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہے لازمۂ انسانی تھا، اور اس وجہ سے قدرت نے تمام قوموں کو یکساں عطا کیا، ارسطو اور بنتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ سچائی، دیانت داری، عفت، حلم یہ اچھی چیزیں ہیں، لیکن افریقہ کا ایک وحشی بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے خود بخود ان چیزوں کو اچھا جانتا اور اچھا سمجھتا ہے،

مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پا رہی ہے، دنیا کے اخلاقی نظم و نسق کو اسی حاسۂ مذہبی ہی نے تھام رکھا ہے، ورنہ اگر تعلیم و تمدن برسر کار ہوتا تو یورپ کا اخلاقی پلہ اسی قدر تمام دنیا سے بھاری ہو گیا ہوتا جس قدر تعلیم و تمدن میں اس کا پایہ بلند ہے۔

مذہب کے فطری ہونے کی دوسری دلیل

دنیا میں افراد انسانی کے خاص خاص مختصات یعنی زبان، قوم، ملک، صورت، رنگ کو حذف کرتے جاؤ تو جو چیزیں قدر مشترک رہ جائیں گی، ان میں ایک مذہب ہوگا، اور یہ بہت بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، جن چیزوں کو ہم انسان کی فطرت خیال کرتے ہیں، مثلاً اولاد کی محبت، انتقام کی خواہش، کمال کی قدر دانی وغیرہ وغیرہ، ان کے فطری ہونے کی یہی وجہ قرار دیتے ہیں کہ تمام دنیا کے آدمیوں میں مشترک پائی جاتی ہیں، اس بنا پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم، ہر نسل، ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ مذہب کے جو مقدم اصول ہیں وہ تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں، خدا کا وجود، اس کی پرستش کا خیال، حیات بعد الموت، اعمال کی جزا و سزا، رحمدلی، ہمدردی، عفت کا اچھا سمجھنا، جھوٹ دغا، زنا، چوری کو برا جاننا، دنیا کے تمام مذہبوں کا اصلِ اصول ہے،

تیسری دلیل

فطرت نے افراد انسانی میں بے انتہا فرقِ مراتب رکھا ہے، دولت و مال، جاہ و حشم، فضل و کمال، ذہن و ذکا کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے

ہ الحیوۃ سال اول صفحہ ۱۵۵۔

L 40

یہی حال مذہب کا ہے، خدا کا اعتراف، عبادت کا میلان، معاد کا خیال، جزا وسزا کا یقین، نبوت کا اعتراف لازمۂ انسانی تھا، اسلئے سب فرقوں میں مشترک رہا اور اسمیں کسی قوم اور کسی فرقہ کی تخصیص نہیں لیکن یہ امور کہ خدا کے کیا اوصاف ہیں؟ کس قسم کی عبادت فرض ہی؟ کیوں فرض ہے؟ معاد کی کیا حقیقت ہی؟ جزا وسزا سے کیا غرض ہی؟ نبوت کے کیا معنی ہیں؟ ان سوالات کا جواب تمام مذاہب میں یکساں نہیں مل سکتا، اس میں فرقِ مراتب ہے اور جس نسبت سے جس مذہب نے ان سوالات کا صحیح جواب دیا ہی، اسی نسبت سے وہ مذہب زیادہ صحیح اور کامل ہی،

تمام مذاہب میں سے کسی ایک کی ترجیح کی وجہ،

یورپ میں منکرینِ مذاہب کا جو گروہ پیدا ہو گیا ہی اور روز بروز بڑھتا جاتا ہی ان کے انکارِ مذہب کی وجہ یہی ہی کہ وہ مذاہبِ موجودہ میں سوالاتِ مذکورۂ بالا کا صحیح اور مکمل جواب نہیں پاتے،

پروفیسر لاروس (LAROUSSE) مذہب کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتا ہی

"اگر ہم کہتے ہیں کہ ان باتوں کا اعتقاد کرنا چاہیئے جو عقل میں آئیں، تو ہم سے کہا جاتا ہی، نہیں ہرگز نہیں، عقل کو جو نیک وبد کی ممیز ہی، ذلیل کیا جاتا ہی، یہانتک کہ جب عقل کی آنکھیں اس قدر اندھی کر دیجاتی ہیں کہ خرقِ عادت ایک معمولی بات بنجاتی ہے، سفید سیاہ ہو جاتا ہے، بدنما چیز خوشنما ہو جاتی ہی تو مذہب آتا ہے اور کہتا ہی کہ گردن ڈال دو، کس کے آگے؟ عقل کے آگے؟ نہیں، فطری فرائض کے آگے؟ نہیں، احساساتِ اندرونی کے آگے؟ نہیں اصولِ فطرت کے آگے؟ نہیں[1]"

یورپ کو مذہب سے کیوں مخالفت ہی

مانسیو بنجمن کانستان نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے، مذہب کی حقیقت اور مذہب

---

[1] ماخوذ از تطبیق صـ۲۴،

مذہبِ اسلام

یہ تو ثابت ہو چکا کہ مذہب فطری چیز ہے یعنی جس طرح انسان میں ہمدردی، محبت، جوشِ انتقام کے قدرتی جذبات پائے جاتے ہیں، اسی طرح میلانِ مذہب بھی قدرتی اور فطری ہی، اور جس طرح اور قدرتی جذبات کسی شخص میں کم، کسی میں زیادہ، کسی میں ضعیف کسی میں بہ شدت، اور شاذ و نادر افراد میں بالکل نہیں پائے جاتے بعینہٖ مذہب کا یہی حال ہی،

لیکن چونکہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے) حاسۂ مذہبی، اس بنا پر انسان کو عطا کیا گیا ہی کہ بغیر اس کے نوعِ انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، اسلئے مذہب کا جس قدر حصہ تمام انسانوں میں یکساں مشترک ہے، وہ نہایت سادہ، مجمل اور ناتمام ہے، اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا، اسکی صاف اور صریح تمثیل یہ ہی کہ انسان کے زندہ رہنے کے لئے، کھانا، پینا، گرمی سردی سے بچنا، ضروری ہے، اسلئے قدرت نے ان ضروریات کا سامان، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے لیے بھی مہیا کیا ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ سامان اعلیٰ درجہ کے بھی ہوں، کھانے کے لئے سدِّ رمق، رہنے کے لئے خس کا جھونپڑا، لباس کے لئے درختوں کے پتے بھی مہیا ہو گئے تو قدرت کا فرض ادا ہو گیا، اس سے بڑھکر مختلف قسم کے الوانِ نعمت، عالیشان محل، بیش بہا ملبوسات سب کے لئے مہیا ہونے ضرور نہیں، فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ،

یہی فطری عبادت ہے۔"

یہ تو فطری مذہب کے اعمال ہیں، عقائد یہ ہیں، ایک قادر مطلق کا یقین، جو ہر چیز پر قادر ہے، جس کو کوئی شئے بدل نہیں سکتی اور جس کے تمام کام اصول اور ترتیب پر مبنی ہیں[1]

لارڈس کہتا ہے[2]، اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ وہ اُن معقول خیالات کے مجموعہ کا نام ہے، جن کا مقصود یہ ہے کہ تمام افراد انسانی ایک رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور وہ جسمانی فائدوں سے اسی طرح بہرہ یاب ہوں جس طرح قوتِ عقلیہ سے تو تم یہ کہہ سکتے ہو کہ مذہب، نوعِ انسانی کے لئے ایک لابدی چیز ہے۔"

ایک عملی تر مذہب کے کیا اصول قرار پا سکتے ہیں،

غرض خواہ ان اقوال کی بنا پر، خواہ خود واقعیت کے لحاظ سے ایک صحیح، کامل اور ابدی مذہب کے لئے جو باتیں ضروری ہیں یہ ہیں،

(۱) مذہب کی صحت کا مدار عقل قرار دیا جائے نہ تقلید،

(۲) کوئی عقیدۂ مذہبی عقل کے خلاف نہ ہو،

(۳) عبادات کے یہ معنی نہ قرار دیئے جائیں کہ وہ مقصود بالذات ہیں اور خدا ہمارے تکلیفاتِ شاقہ اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، بلکہ عبادات سے خود نوعِ انسانی کا فائدہ مقصود ہو اور وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں،

(۴) دینی اور دنیوی فرائض کو اس اعتدال کے ساتھ قائم کیا جائے کہ ایک سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچے بلکہ ایک دوسرے کا دست و بازو بن جائے،

---

[1] ماخوذ از تطبیق صفحہ ۳۰ [2] تطبیق صفحہ ۲۵ و ۲۶،

کی نشو و نما پر ایک کتاب لکھی ہی، اس میں وہ مذہب کے نقصانات کی تفصیل بیان کرکے لکھتا ہے کہ "مذہب جن بنیادوں پر قائم ہوا ہی وہ علم کی مخالف ہیں اور اس لئے یہ قطعی ہی کہ تمام مذاہب برباد ہو جائیں"

برتلو (Bertelot) لکھتا ہی "علم نے اب پوری آزادی حاصل کر لی ہے اور اس بات کا خوف نہیں رہا کہ مذہب اس کو دبالے"

ان تصریحات سے ظاہر ہوتا ہی کہ ان منکرینِ مذاہب کے نزدیک چونکہ مذہبی اصول تحقیقاتِ علمی کے مخالف ہیں، اس لئے وہ صحیح نہیں ہوسکتے، ورنہ اگر کوئی مذہب ایسا ہو جس کے تمام اصول عقل کے موافق ہوں تو منکروں کو بھی اسکی تسلیم سے انکار نہ ہوگا، اسی بنا پر یورپ کے بڑے بڑے محققین نے مذہب کا ایک خیالی خاکہ کھینچا ہی، اور اس کا نام دیانۃ طبیعۃ رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مذاہبِ موجودہ غلط ہیں، لیکن اگر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جائے جس کے اصول حسبِ ذیل قرار دیئے جائیں تو وہ بے شبہہ تسلیم کے قابل ہوگا، اور تحقیقاتِ علمی کا ساتھ دے سکے گا، فطری مذہب

ژول سیمان نے اس عقلی مذہب کا تفصیلی خاکہ حسبِ ذیل کھینچا ہی:

ثوابِ آخرت کے یہ معنی ہیں کہ انسان قانون کا پابند ہو، لیکن یہ قانون کیا ہے؟ اپنی ذات کی حفاظت، ان خصائص کو ترقی دینا جو انسان کی فطرت میں مضمر ہیں، بنی نوع کی محبت اور خدمت، خدا کی عبادت، لیکن خدا کی عبادت کے کیا معنی ہیں؟ اپنے فرائض کا ادا کرنا، اچھے کام کرنا، وطن کی محبت، عمل اور اخلاص یہی فطری مذہب ہی، اور فطری مذہب کا خاکہ

جاتا ہے، یہانتک کہ چند روز کے بعد مذہب کے عمدہ عقائد بھی ان توہمات کے ہجوم میں چھپ جاتے ہیں اور مذہب ہمہ تن عجائبات اور ناممکنات کا مجموعہ بنجاتا ہے، یہی چیز ہے جس نے یورپ کے آزاد خیالوں کو مذہب سے متنفر بنا دیا ہے، پروفیسر لاروس نے تمام مذاہب کے برباد ہو جانے کی جو پیشین گوئی کی ہے اسی بنا پر کی ہے کہ مذہب عقل کو برباد کرنا چاہتا ہے، اسلئے ضروری ہے کہ خود برباد ہو جائے" یہی پروفیسر ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "اگر ہم بغیر خود غرضی اور وہم پرستی کے اس بات کا پتہ لگائیں کہ دنیا میں آج تک جس قدر مادی و ماغی، اور اخلاقی ترقیاں ہوئی ہیں اسکا اصلی سبب کیا ہے تو صرف یہ جواب ہے کہ عقل کا جبر کے شکنجہ سے نجات پانا۔

اب دیکھو اسلام کی کیا تلقین ہے؟

اسلام کی تلقین

قرآن مجید میں یہودیوں، عیسائیوں، بت پرستوں اور ملحدوں کو سینکڑوں جگہ مختلف طریقوں سے عقائد اسلام کی دعوت دی ہے، لیکن ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ تقلیداً ان عقائد کو مان لو، بلکہ ہر جگہ اور موقع پر اجتہاد اور غور کے ذریعہ سے انکو منوانا چاہا ہے، اور تقلید پرستی کی سخت برائی کی ہے، مخالفین اسلام کو سب سے بڑا الزام جو دیا وہ یہ تھا،

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (یوسف)	آسمان اور زمین میں کس قدر بیشمار نشانیاں ہیں، لیکن یہ لوگ ان پر گذر جاتے ہیں اور انکی طرف رخ نہیں کرتے
لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (سورۂ اعراف رکوع اخیر)	انکے دل تو ہیں لیکن اس سے سمجھ کا کام نہیں لیتے،
إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (پارہ ۲۵)	ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا، اور ہم انہی کے پیچھے پیچھے چلے جائیں گے،

(۵) مذہب، تمدن کی اصلی سے اعلیٰ ترقی کا ساتھ دے سکے بلکہ خود اس ترقی کا رستہ دکھائے

ہم اس کتاب میں اول انہی اصول کے معیار پر اسلام کو جانچنا چاہتے ہیں،

عقل اور مذہب

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تمام مذاہب میں عقل کو کیا درجہ دیا گیا ہے اور اسلام نے عقل کی کیا منزلت قائم کی ہے، دنیا میں آج جس قدر مذاہب موجود ہیں، اُن سب میں تلقین کی ابتدا اس حکم سے شروع ہوتی ہے کہ "مذہب میں عقل کو دخل نہ دو" یہی جابرانہ حکم ہے جس کی بدولت مذہب ہر قسم کی تحقیقات اور اجتہادات سے مطمئن رہتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز اسکی جباری کو کم نہیں کرسکتی، اسی کا اثر ہے کہ ایک شخص منطق، فلسفہ، ریاضیات میں سیکڑوں عجیب وغریب ایجادات کرتا ہے، اور ارسطو و فلاطون کی غلطیاں نکالتا ہے لیکن جب اسکے سامنے یہ مسئلہ کا ذکر آتا ہے کہ "ایک تین ہیں اور تین ایک" تو اسکی نقادی اور نکتہ سنجی بالکل کند اور بیکار ہوجاتی ہے، اسی کا اثر ہے کہ سقراط اتنا بڑا فلسفی ہوکر جان دینے کے وقت وصیت کرتا جاتا ہے کہ فلاں بت پر میں نے نذر چڑھانے کی جو منت مانی تھی وہ پوری کیجائے، اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام مذاہب میں سینکڑوں حکما و علما پیدا ہوتے ہیں لیکن مذہب کے لغو سے لغو عقیدہ کی نسبت بھی انکو شک نہیں پیدا ہوتا عقل کی اس بیکاری سے صرف یہ نقصان نہیں پہنچا کہ جو لغو عقیدہ ایک دفعہ قائم کرلیا گیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہتا ہے، بلکہ توہمات اور عجائب پرستی کا زور روز بروز بڑھتا

رسول اللہ صلعم کی نبوت پر مخالفوں کو جو استعجاب تھا اسکو اس طرح رفع کیا،

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ — کہدو کہ میں پیغمبروں میں سے کوئی انوکھا نہیں،

معاد کے ممکن ہونے کا اس طرح یقین دلایا،

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ... — کہدے کہ وہی زندہ کریگا جس نے پہلی بار پیدا کیا تھا،

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ، (یٰسین - ۵) — کیا جس نے آسمان اور زمین پیدا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کردے،

معاد کی ضرورت اس طرح ثابت کی،

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (مومنون - ۶) — کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ ہم نے تمکو یوں ہی بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہمارے ہاں لوٹ کر نہ آؤگے،

غرض خواہ نفسِ مذہب، خواہ بالخصوص مذہبِ اسلام، خواہ خاص خاص اسلامی عقائد جس چیز پر یقین دلانا چاہا، ساتھ ہی دلیل بھی بیان کی، اور ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا کہ ان عقائد کو بلا دلیل تسلیم کر لو

اس موقع پر یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ آج کل زمانہ کے مذاق کی وجہ سے تمام اہل مذاہب اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا مذہب عقل سے ثابت ہے، لیکن دیکھنا یہ ہی کہ یہ خود ان کا دعوی ہی یا اُن کے مذہب نے بھی ایسا دعوی کیا ہی،

اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی مذہب نے یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ عقل سے ثابت ہی اور مذہب کو عقل کے بنا پر ماننا چاہئے، اور یہ وہ بڑا فرق ہے جو علانیہ اسلام کو تمام دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہی،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ — اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کے باب میں بے علمی کیساتھ جھگڑتے ہیں

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ — کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے،

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کے کارخانہ کو (غور سے) نہیں دیکھتے،

یہ تمام آیتیں تو کلی طور پر عقل سے کام لینے کے متعلق تھیں، مذہب کے تمام اصول و فروع کے متعلق اسلام نے جو تلقین کی وہ عقل کی بنا پر کی،

نفس مذہب کی ضرورت اس طرح ظاہر کی،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ — اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے

فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ — جس پر خدا نے لوگونکو پیدا کیا ہے، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہوتی

اسلام کی دعوت کا حکم دیا تو اس کے یہ طریقے بتائے،

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ — اپنے خدا کی راہ کی طرف لوگونکو بلاؤ حکمت سے، نصیحت اور

الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ — ان لوگوں سے بحث کرو بہ طرز پسندیدہ،

خاص خاص اسلامی عقائد جہاں کہیں بیان کئے ہر ایک عقیدہ کے ساتھ اُسکی عقلی دلیل بیان کی، خدا کے ثبوت کے دلائل تو اس کثرت سے مذکور ہیں کہ اس کتاب میں اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا، وحدانیت کو اس طرح ثابت کیا،

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا — اگر آسمان زمین میں کئی خدا ہوتے تو دونوں میں فساد آجاتا،

خدا کے عالم ہونے کی یہ دلیل بیان کی،

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ — کیا جس نے پیدا کیا وہ علم نہیں رکھتا،

اس اعتراض کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی یہ کہ عالم کے تمام اجزا میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہی، کیونکہ تمام اجسام یا بڑھتے رہتے ہیں یا گھٹتے ہیں، اور بڑھنا یا گھٹنا حرکت ہی کی ایک قسم ہی، جن چیزوں کو ہم بحال خود قائم دیکھتے ہیں، انکے اجزا بھی بدلتے رہتے ہیں، یعنی پرانے اجزا فنا ہوتے جاتے اور ان کے بجائے نئے آتے جاتے ہیں، اجزا کا بدلتا رہنا بھی ایک قسم کی حرکت ہی، اسلئے تمام عالم متحرک ہی، اور جو چیز متحرک ہے، ضرور ہے کہ اسکے لئے کوئی محرک ہو، اب دو صورت ہی، یا یہ سلسلہ کسی حد تک جا کر ٹھہر جائیگا یعنی اخیر میں ایک ایسی چیز ثابت ہوگی جو بالذات یا بواسطہ تمام اشیا کی محرک ہی اور خود متحرک نہیں، یہی خدا ہے، یا یہ سلسلہ کہیں ختم نہ ہوگا، اس صورت میں غیر متناہی کا وجود لازم آئیگا اور یہ محال ہے،

ارسطو کا اصل مذہب یہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور وہ بذات خود پیدا ہوا لیکن اسکی حرکت حادث ہی اور خدا اسی حرکت کا خالق ہی، اس بنا پر ارسطو نے خدا کے ثبوت میں حرکت سے استدلال کیا، حکمائے اسلام میں سے ابن رشد کا بھی یہی مذہب ہی،

بو علی سینا کا طریقہ،

بو علی سینا بھی عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہی، لیکن اسلام کے اثر سے اس بات کا قائل نہ ہو سکا کہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں، اسلئے اس نے یہ رائے اختیار کی کہ عالم قدیم بھی ہی اور خدا کا مخلوق بھی ہی، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا تھا کہ جب عالم اور خدا دونوں قدیم اور ازلی ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کیونکر کہا جا سکتا ہی، کیونکہ علت و معلول میں زمانہ کا تقدم و تاخر ضرور ہی، بو علی سینا نے اس کا جواب دیا کہ علت کے لئے

وجود باری

خدا کے اثبات پر قدمار اس طرح استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہی اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں ہو وہ کسی علت کی محتاج ہو اور یہی علت خدا ہے، اس استدلال کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہی، پہلے مقدمہ پر یہ استدلال کیا جاتا تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہی اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے، یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا، اور اسلئے اسکی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی، لیکن وہ فی الواقع صحیح نہ تھا، تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں، دو چیزوں کا مجموعہ ہیں، مادّہ اور ایک خاص صورت، جو چیز بدلتی رہتی اور تغیر پذیر ہے وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، کوئی چیز جب فنا ہوتی ہی تو صرف اسکی صورت فنا ہوتی ہے اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہی، ایک کاغذ کو جلاؤ کاغذ جل کر راکھ ہو جائیگا، اب کاغذ فنا ہو گیا، لیکن راکھ موجود ہے، جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہی، راکھ کو برباد کرو، کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم رہیگی، غرض جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہی اصل مادہ کے حادث ہونے پر نہ کوئی تجربہ پیش کیا جا سکتا ہی، نہ کوئی استدلال قائم کیا جا سکتا ہی،

اس بنا پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہی، لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں، اور جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں، ارسطو نے

وجود باری پر قدما کا طریقۂ استدلال

اگر قدیم ہوگی تو ضرور ہے کہ دوسری چیز بھی قدیم ہو، ورنہ لازم و ملزوم میں فصل زمانی لازم آئیگا اور یہ محال ہے "

اب عالم کے حادث ہونے پر اس طرح استدلال کیا جاسکتا ہے کہ عالم دو صورت سے خالی نہیں، جوہر ہوگا یا عرض، اور جوہر و عرض دونوں حادث ہیں، عرض کا حادث ہونا تو ظاہر ہے جوہر اسلئے حادث ہے کہ کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہوسکتا، اور یہ ثابت ہوچکا ہے کہ جو چیز عرض سے خالی نہ ہوسکتی ہو، وہ حادث ہے،

اور جب یہ ثابت ہوا کہ عالم حادث ہے تو ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی علت ہو، اب اگر علت بھی حادث ہے تو اس کے لئے بھی کوئی علت درکار ہوگی، اس صورت میں اگر یہ سلسلہ کہیں جاکر ختم ہوگا تو وہی خدا ہے اور نہ ختم ہوگا تو دور و تسلسل لازم آئیگا اور دور و تسلسل محال ہے

متکلمین کا یہ استدلال فرفوریوس (یا رفیریس) سے ماخوذ ہے، جیسا کہ ہم نے تاریخ علم الکلام میں نقل کیا ہے، لیکن یہ استدلال اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ زمانہ غیر متناہی کا وجود نہیں ہوسکتا، ورنہ یہ استدلال محض مغالطہ ہے،

یہ سچ ہے کہ جوہر عرض سے خالی نہیں ہوسکتا، لیکن کسی خاص عرض کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی عرض کا وجود چاہئے اور جب زمانہ غیر متناہی ہے تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ عالم قدیم ہے اور علی سبیل البدلیہ کسی نہ کسی عرض کے ساتھ متصف رہتا ہے، یہ اعراض الگ الگ تو حادث ہیں لیکن ان کا سلسلہ جو علی سبیل البدلیہ ہے، غیر متناہی اور قدیم ہے، عالم کے حادث ہونے پر استدلال یہ تھا کہ اگر عالم قدیم ہو تو اعراض کا بھی قدیم ہونا لازم آئیگا ہم کہتے

صرف تقدم بالذات کافی ہے، زمانہ کے لحاظ سے مقدم ہونا ضرور نہیں، مثلاً کنجی کی حرکت قفل کے کھل جانے کی علت ہے، لیکن کنجی کی حرکت اور قفل کے کھلنے میں ایک لحظہ اور ایک آن کا بھی آگا پیچھا نہیں،

متکلمین کے نزدیک چونکہ خدا کے سوا کسی چیز کا قدیم ہونا خدا کی یکتائی میں خلل انداز تھا، اسلئے اُنھوں نے عالم کے حدوث کا دعویٰ کیا اور حدوث ہی سے خدا کے وجود پر دلیل قائم کی، عالم کے حادث ہونے پر متکلمین کا جو استدلال ہے، اسکے سمجھنے کے لئے پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہئے،

متکلمین کا استدلال

(۱) عالم میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں، عرض یعنی جو چیزیں بذات خود قائم نہیں، بلکہ جب پائی جاتی ہیں تو کسی دوسری چیز میں ہو کر پائی جاتی ہیں، مثلاً بو، رنگ، مزہ، رنج، خوشی، جوش، جوہر یعنی وہ چیزیں جو بذات خود قائم ہیں، مثلاً پتھر، مٹی، پانی،

(۲) کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس قدر جواہر ہیں کسی نہ کسی صورت اور ہیئت میں ہوتے ہیں اور صورت و ہیئت عرض ہیں، تمام جواہر میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے، اور حرکت عرض ہے، غرض جوہر کے جس قدر افراد ہیں ان میں کسی نہ کسی عرض کا پایا جانا ضرور ہے اور اس بناء پر کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا،

(۳) عرض حادث ہے، یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے،

(۴) جو چیز عرض سے کبھی خالی نہ ہو سکتی ہو، ضرور ہے کہ حادث ہو کیونکہ اگر وہ قدیم ہو تو لازم آئیگا کہ عرض بھی قدیم ہو، کیونکہ دو چیزیں جو لازم و ملزوم ہوں، ان میں سے ایک چیز

اور متکلمین بھی چونکہ انہی کے نقشِ قدم پر چلے تھے، اسلئے وہ بھی ناکام رہے،

اب دیکھو قرآن مجید نے اس عقیدہ کو کیونکر حل کیا،

وجود باری

پر

قرآن مجید کا طریقۂ استدلال

خدا کا خیال انسان کی فطرت میں داخل ہے،

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اعتراف، انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے، علم الانسان کے ماہروں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری حالت میں تھا، یعنی علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کا بالکل وجود نہیں ہوا تھا، اُس وقت اس نے سب سے پہلے اصنام کی پرستش کی تھی یا خدا کی؟ مادیین (مٹیریسٹ) کے سوا اور تمام محققین نے فیصلہ کیا ہے کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش اختیار کی تھی، مشہور محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے "ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے، جسمانی خدا (بت) اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوے کہ فطرت اصلی، مثالی صورت کے پردہ میں چھپ گئی"،

یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، دنیا کے ہر حصہ میں، خدا کا اعتقاد موجود تھا آشوری، مصری، کلدانی، یہود، اہل فینشیا سب خدا کے قائل تھے پلوٹارک کہتا ہے کہ "اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے

ہیں کہ اعراض کے ہر ہر فرد کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا بلکہ عراض کے سلسلہ علی سبیل البدلیۃ کا قدیم ہونا
لازم آتا ہی، اور جب زمانہ غیر متناہی ہی تو سلسلہ کا قدیم ہونا بھی ممکن ہی متکلمین نے اور بھی بہت سی
دلیلیں قائم کی ہیں لیکن سب کی صحت اس بات پر موقوف ہی کہ سلسلۂ غیر متناہی کا محال ہونا ثابت
کیا جائے، غیر متناہی کے محال ہونے پر حکما، اور متکلمین نے بہت سے دلائل قائم کیے ہیں لیکن وہ
تمام دلائل اس صورت میں جاری ہوتے ہیں، جب یہ مانا جائے کہ یہ سلسلہ مرتب موجود ہی لیکن منکرین
خدا علل کا سلسلہ اس طرح مانتے ہیں کہ ہر علت فنا ہو کر اسکے بجائے دوسری علت آجاتی ہی،
محقق دوانی نے رسالۂ زوراء کی شرح میں دعوی کیا ہی کہ اس صورت میں بھی دلیل جاری ہو سکتی ہے
کیونکہ گو علتیں فنا ہوتی جاتی ہیں لیکن انکا مجتمع و مرتب ہونا فرض کیا جا سکتا ہی، کیونکہ علل کا مجتمع
ہونا محالِ عقلی نہیں اور جو چیز محال نہیں وہ فرض بھی کیجا سکتی ہی لیکن محقق موصوف کا یہ قول صحیح نہیں،
علتوں کا اجتماع گو محال بالذات نہیں لیکن محال بالغیر ہو سکتا ہی، اور محال بالغیر کے فرض
کر لینے سے بھی محال آتا ہے، گو یہ محال محال بالغیر ہوگا،

ان دلائل میں ایک بڑا نقص یہ ہی کہ ان سے اگر خدا کا وجود ثابت بھی ہوتا ہی تو اس کا فاعل بالاختیار
ہونا ثابت نہیں ہوتا، ان دلائل سے صرف ایک علۃ العلل (کازآف دی کازز) کا وجود ثابت ہوتا ہی، لیکن علت
کیلئے یہ ضرور نہیں کہ اس سے معلول بارادہ اور بہ اختیار صادر ہو، آفتاب روشنی کی علت ہی لیکن آفتاب
کو نہ علم ہی نہ ارادہ، بلکہ روشنی اس سے خود بخود بلا علم و ارادہ صادر ہوتی ہی، اسی بنا پر بہت سے حکما کا مذہب
ہی کہ خدا نے عالم کو بہ اختیار نہیں پیدا کیا اور تعجب ہی کہ شیخ بو علی سینا بھی انہی کا ہمزبان ہی،

ان تمام تقریروں سے تمکو معلوم ہوا ہوگا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے،

وجود باری پر استدلال

کہ وہ جب کسی چیز کو مرتب، باقاعدہ اور منظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہوجاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے، اگر کسی جگہ ہم چند چیزیں بے ترتیب پڑی دیکھیں تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہوگئی ہوں گی، لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے چنی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صنّاع بھی بہ مشکل اسطرح چن سکتا ہو تو یہ خیال کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہوگئی ہوگی، اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو، خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو، اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کے کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھکر ترتیب دے، وہ سو طرح الٹ پلٹ کریگا، لیکن اتفاقیہ طور سے بھی کبھی یہ نہ ہوگا کہ حافظ اور نظامی کا شعر نکل آئے، حالانکہ وہی الفاظ ہیں، وہی حروف ہیں، وہی جملے ہیں، صرف ذراسی ترتیب کا پھیر ہے، پھر کیونکر ممکن ہو کہ نظام عالم، جو اس قدر باقاعدہ، مرتب اور موزوں ہے، وہ خود بخود قائم ہوگیا ہو، قرآن مجید میں خدا کے وجود پر اسی سے استدلال کیا ہو،

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (نمل-۷)	یہ خدا کی کاریگری ہو جس نے ہر شے کو خوب پختہ طور سے بنایا،
مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ، (ملک-۱)	خدا کی کاریگری میں تم کو کہیں فرق نظر نہ آئیگا، پھر دوبارہ دیکھو کہیں دراڑ دکھائی دیتی ہے،
خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (فرقان-۱۰)	خدا نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا،
لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم-۴)	خدا کی بناوٹ میں ردوبدل ممکن نہیں،
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (فاطر-۵)	خدا کے طریقہ میں تم ردوبدل نہیں پا سکتے،

جہاں نہ قلعے ہیں، نہ سیاست، نہ علم، نہ صناعت، نہ حرفہ، نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا، جہاں خدا نہ ہو"

فولٹیر جو فرانس کا مشہور فاضل اور وحی و الہام کا منکر تھا، کہتا ہے کہ زرواستر، منو، سولن، سقراط، سسرو، سب کے سب ایک سردار، ایک منصف، ایک باپ کی پرستش کرتے تھے"[1] یہی فطرت ہے جس کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا[2] (اعراف - ۲۲)

اور جبکہ خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے انکی نسل کو نکالا، اور اور خود انکو انہی پر گواہ کیا، کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں، سب بول اٹھے کہ ہاں ہم گواہ ہیں،

لیکن چونکہ خارجی اسباب سے اکثر یہ فطری احساس دب جاتا ہے، اسلئے خدا نے جا بجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے،

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم) کیا خدا کی نسبت بھی شک ہوسکتا ہے؟ جو آسمان و زمین کا موجد ہے

اور چونکہ خارجی اسباب کی وجہ سے بعض اوقات یہ فطری احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض اشارہ اور تنبیہ کافی نہیں ہوتی اسلئے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تجربی اور حسی مقدمات کے ذریعہ سے استدلال بھی کیا،

انسان کو آغاز تمیز میں جن بدیہی اور حسی مقدمات کا علم ہوتا ہے، ان میں ایک یہ ہے

---

[1] دیکھو انسیو بوتھیر کی کتاب الفلسفہ ترجمہ عربی، مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۰۱، یہ مصنف فرانس کی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا،

[2] محققین اور ارباب نظر نے اس آیت کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ خدا نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہو کہ خواہ مخواہ اسکو خدا کی خدائی کا قائل ہونا پڑتا ہے، دیکھو تفسیر کبیر،

اور یہ کیونکر برابر چلا جاتا ہے، اسی بنا پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جسکا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔"

پروفیسر لینی (Linne) لکھتا ہے "خدائے قادر و دانا اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہجاتی ہیں، اور میں بالکل دیوانہ بنجاتا ہوں، ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی ہو، اسکی کس قدر عجیب قدرت کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔"

فونتل۔ انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:۔

"علوم طبعیات کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہماری عقل کی پیاس بجھائے، بلکہ اسکا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی نظر، خالقِ کائنات کی طرف اُٹھائیں اور اُس کے جلال و عظمت پر فریفتہ ہو جائیں۔"

ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کیے ہیں، کامل اور بے نقص ہی، موزوں اور مرتب ہے، ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہی جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے، یہ دلیل کا صغری ہے، کبری خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستمر الانتظام ہوگی، وہ خود بخود پیدا نہیں ہوگئی ہوگی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحبِ اختیار نے اسکو پیدا کیا ہوگا،

آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہوگئی ہی، جبکہ کائنات کے سینکڑوں اسرار فاش ہوگئے ہیں، جبکہ حقائقِ اشیا نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہی، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہاے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے، جو قرآنِ مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا،

حکماے یورپ کی شہادت

آئزک نیوٹن کہتا ہی "کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلاباتِ زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جا سکے، جو سب سے اوّل ہی، اور صاحب علم اور صاحب اختیار ہے"!

اس زمانہ کا سب سے بڑا حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر وہ اور غامض ہوتے جاتے ہیں، اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہی کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہی جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں"

کیمل فلامریان[1] کہتا ہے "تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا

[1] فرانس کا ایک مشہور فاضل ہی،

اعتراض کی تقریر نقل کرتے ہیں،

خدا کے وجود پر ملاحدۂ قدیم کا اعتراض

خدا کا وجود اگر تسلیم کیا جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایک واقعہ جو آج پیش آیا، اسکی علت قدیم ہوگی یا حادث، اگر قدیم ہو تو لازم آئیگا کہ یہ واقعہ بھی قدیم اور ازلی ہو، کیونکہ علت کے ساتھ معلول کا وجود لازم ہے اور اگر حادث ہو تو اس کی علت بھی حادث ہوگی، اور پھر اس کے لئے کوئی اور علت درکار ہوگی، اب اگر یہ سلسلہ کسی ایسی علت پر جاکر ختم ہو جو قدیم اور ازلی ہو تو اس تمام سلسلہ کا درجہ بدرجہ قدیم ہونا لازم آئیگا، کیونکہ علة العلل جب قدیم ہے تو اُس کا پہلا معلول قدیم ہوگا، اور جب پہلا معلول قدیم ہے تو اس کا معلول بھی قدیم ہوگا، وَ هَلُمَّ جَرًّا اور اگر یہ سلسلہ کسی قدیم اور ازلی علت پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ الیٰ غیر النہایۃ چلا جاتا ہے، تو خدا کہاں باقی رہتا ہے،

ملاحدۂ سابق کے اور بہت سے قوی اعتراضات ہیں، لیکن ہمکو ان سوے ہوئے فتنوں کو جگانے کی ضرورت نہیں، یورپ کے ملاحدہ آج کل خدا کے وجود پر جو اعتراضات کر رہے ہیں اور جس کی بنا پر ہمارے ملک میں، مذہب کی طرف سے بیدلی پھیلتی جاتی ہے، ہمکو صرف ان اعتراضات کا نقل کرنا اور ان کا جواب دینا کافی ہے،

مادیین،

جن لوگوں کو منکر خدا کہا جاتا ہے وہ مادیین (میٹرلسٹ) ہیں، لیکن درحقیقت ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہیں کہ خدا نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہماری تحقیقات کے دائرہ سے باہر ہے، کیونکہ ان کا دائرۂ علم مادہ تک محدود ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا مادی نہیں،

پروفیسر لیتریہ کا قول ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ "مادی مذہب اپنے آپ کو عقلِ اول

ملاحدہ (یعنی منکرینِ خدا) کے اعتراضات[1]

سب سے پہلے یہ بات بتانے کے قابل ہے کہ خدا کا انکار کوئی جدید خیال نہیں، ہمیشہ ہر زمانہ میں ملاحدہ کا ایک گروہ موجود تھا، جو خدا کے وجود کا قطعی منکر، یا کم از کم متردد اور متشکک تھا، سائنس اور فلسفۂ حال سے اس مسئلہ پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑی ہے، خدا کے انکار کے متعلق کوئی نئی دلیل نہیں قائم ہو سکی ہے، بلکہ ملاحدۂ سابق و حال میں یہ فرق ہے کہ ملاحدۂ سابق کے دلائل زیادہ دقیق اور پُر زور ہوتے تھے، ان کے مقابلہ میں ملاحدۂ حال کے دلائل کو دلائل نہیں کہہ سکتے، ان کے تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا کا کوئی ثبوت نہیں ملتا"، "مادہ کے سوا عالم میں اور کوئی چیز موجود نہیں"، "خدا کے اعتراف کے بغیر نظامِ عالم کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے"، یہ ظاہر ہے کہ یہ کوئی استدلال نہیں بلکہ عدم علم کا اعتراف ہے،

متکلمین اسلام نے ملاحدۂ سابق کے دلائل نہایت تفصیل سے نقل کئے ہیں، علامہ ابن حزم نے ملل ونحل میں ملاحدہ ہی کے اعتراضات سے ابتدا کی ہے اور پھر ان کے جواب دیئے ہیں، یہ اعتراضات نہایت ہی قوی اور پُر زور ہیں، تفنن کیلئے ہم تک

[1] ناظرین خوب سمجھ لیں کہ یہاں سے صفحہ تک جہاں یہ باب ختم ہوا ہے جو کچھ ہے وہ ملاحدہ کے اعتراضات و اقوال ہیں، اور اس کے بعد ان کا جواب ہے، "س س ن"

اس بنا پر ہمکو خدا کی نفی پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ ثبوت کے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں، ثبوت کے جس قدر دلائل ہیں سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ اگر خدا کا وجود نہ ہو تو سلسلۂ غیر متناہی کا وجود لازم آئیگا لیکن غیر متناہی کے محال ہونے پر کوئی دلیل نہیں، (یہ بحث بہ تفصیل اوپر گذر چکی ہی) شاید یہ کہا جائے کہ غیر متناہی کا خیال انسان کی عقل سے بالاتر ہی، اور یہی اسکے محال ہونے کی دلیل ہے، لیکن خدا کو جس طرح قدیم اور ازلی مانا جاتا ہے، وہ بھی غیر متناہی کی ایک دوسری صورت ہے، ایک خدا جو ازل سے موجود ہی، اور جس کی کوئی انتہا نہیں، کیا ایک سلسلۂ غیر متناہی کے تسلیم کرنے سے کچھ کم عجیب ہے؟

خدا کے ثبوت میں یہ مقدمہ بڑے آب و تاب سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے، اسکی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے،

لیکن یہ مسئلہ کہ جو چیز پیدا ہوتی ہی، اسکی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہی، تشریح طلب ہی، یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم نے جن چیزوں کو پیدا ہوتے دیکھا ہی، بغیر علت کے نہیں دیکھا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے کیا چیز پیدا ہوتے دیکھی ہی؟ کیا ہم نے اصل مادّہ کو پیدا ہوتے دیکھا ہے؟ ہم نے جن چیزوں کو پیدا ہوتے دیکھا ہی وہ مادہ کی صورتیں ہیں نہ کہ اصل مادّہ اس لئے اس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صورتوں کے پیدا ہونے کے لئے علت درکار ہے اس سے زیادہ جو دعویٰ کیا جائے اسکی بنیاد تجربہ و مشاہدہ نہیں ہی، بلکہ صرف تخیل ہے، اس بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ عالم کے لئے کوئی علت ضرور ہے، صحیح نہیں، کیونکہ عالم مادّہ کا

کی بحث سے بالکل الگ رکھتا ہے، کیونکہ اس کو اسکے متعلق کسی قسم کا علم نہیں، ہم حکمتِ الٰہی کے نہ منکر ہیں نہ مثبت، ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ رہنا ہے۔"

اسی گروہ میں سے بعض ترقی کر کے یہ بھی کہتے ہیں، کہ خدا کے اقرار و انکار کے دونوں پہلوؤں میں سے انکار کا پہلو زیادہ قوی ہے، وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمکو یہ طے کرنا چاہیئے کہ کسی شے کے انکار یا اقرار، اثبات یا نفی کے اصولِ اولیہ کیا ہیں؟ فلسفۂ حال نے تحقیقاتِ علمیہ کا سب سے پہلا اصول جو قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ "جب تک کسی شے کے وجود کی قطعی شہادت موجود نہ ہو، ہم کو اس کا وجود تسلیم نہیں کرنا چاہیئے"، کانٹ اور بیکن نے اپنے فلسفہ کا سنگِ بنیاد اسی مسئلہ کو قرار دیا اور اسی مسئلہ کی بدولت ارسطو کے ظنی فلسفہ کے تمام ارکان متزلزل ہو کر قطعیات اور یقینیات کی بنیاد قائم ہوئی، روزمرہ کے تجربہ میں ہم اسی اصول کے پابند ہیں، فرض کرو ایک شے ہے جس کے نہ وجود کی شہادت ہے نہ عدم کی، تو ہمارا علم، اس کی نسبت کس قسم کا ہوتا ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس شے کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمکو معلوم ہے یہ شے موجود نہیں، مثلاً ممکن ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں ایسے آدمی موجود ہوں جن کے دو سر ہوں، ممکن ہے کہ ایسے جانور موجود ہوں جو صورۃً آدمی ہوں، ممکن ہے کہ ایسے دریا ہوں جنمیں مچھلیوں کے بجائے آدمی رہتے ہوں، لیکن ہم ان چیزوں کی نفی کا یقین رکھتے ہیں، کیوں؟ اسی لئے کہ انکے وجود کی کوئی شہادت موجود نہیں، اس اصول کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کے ثبوت و عدمِ ثبوت دونوں سے کسی پر اگر کوئی دلیل قائم نہ ہو تو یقین کا رجحان اسی طرف ہوگا کہ خدا موجود نہیں ہے،

مادیین کس بنا پر خدا کے قائل نہیں

مرکبات خود بخود کیوں کر پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح مادہ قدیم ہی حرکت اور قوت بھی قدیم ہے، حرکت ان اجزاے دیمقراطیسی کی فطری خاصیت ہی، جو اجسام ہمکو ساکن نظر آتے ہیں، ان کے اجزاے دیمقراطیسی بھی ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں، اور اگر ان کو کبھی سکون ہوتا ہے تو دو متقابل جذب کے تعارض کی وجہ سے ہوتا ہی، بہر حال مادہ کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے، اور مادہ کبھی حرکت سے خالی نہیں ہوسکتا، اس بنا پر اجزاے دیمقراطیسی کا باہم مل جانا کوئی استبعاد کی بات نہیں،

اب جو کچھ شبہہ باقی رہتا ہے وہ یہ ہے کہ محض بخت و اتفاق سے ایسی ایسی عجیب و غریب مخلوقات جو سرتاپا حکمت اور صنعت سے بھری ہوئی ہیں کیونکر پیدا ہوسکتی ہیں؟ اسی سوال کو مذہب نے نہایت موثر الفاظ میں ادا کیا ہی، اور یہ سمجھایا ہے کہ خدا کا وجود اس سوال کا لازمی نتیجہ ہے، راسین کہتا ہے، اے آسمانو! مجھکو خبر دو، اے دریاؤ! مجھکو بتاؤ، اے زمین مجھکو جواب دے! اے بے انتہا ستارو! تم بولو کون سا ہات ہے جس نے تمکو افق میں تھام رکھا ہے؟ او شب چاردہ! کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنا دیا ہی؟ تو کس قدر پُرشان ہے، کس قدر عظمت مآب ہی! تو خود بتارہی ہی کہ تیرا کوئی صانع ہی جس نے تجھکو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہی، اس نے تیری چھت کو قبہ ہاے نور سے مرصع کیا ہی جس طرح کہ اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے اور گرد کو ابھارا ہی، اور مژدہ رسانِ سحر! او نیر تنگرو! او ہمیشہ روشن رہنے والا ستارہ! او آفتابِ درخشاں! سچ بتا تو کس کی ادا ے طاعت کے لئے محیط کے پردہ سے باہر آتا ہی، اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنی روشن

نام ہے اور مادہ کا حادث اور مخلوق ہونا ثابت نہیں ہوا اس لئے اسکی علت بھی ثابت نہیں ہو سکتی،

شاید یہ کہا جائے کہ گو مادہ قدیم اور مخلوق ہے لیکن مادہ کبھی صورت سے خالی نہیں ہو سکتا، اس لئے ان صورتوں کے لئے کوئی علت ہو گی اور وہی خدا ہی، لیکن یہ استدلال بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ مادہ قدیم ہے اور یہ صورتیں علی السبیل البدلیۃ پیدا ہوتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں، اس بنا پر اُن کے لئے ایک قدیم علت نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں حادث علتیں درکار ہیں،

عالم کا وجود خدا کے بغیر فرض کیا جاسکتا ہی یا نہیں،

اصل یہ ہے کہ خدا کے وجود کی جو ضرورت ہی وہ صرف اس لحاظ سے ہے کہ نظام عالم کا سلسلہ کس بنیاد پر قائم کیا جائے؟ اسلئے ہمکو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ عالم کا وجود اور عالم کا نظام، خدا کے وجود کے بغیر، فرض کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر کیا جاسکتا ہے تو خدا کے وجود کے تسلیم کی کوئی ضرورت نہیں رہتی؟

یہ امر قطعی ہے کہ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی، اس بنا پر عالم کا مادہ قدیم ہے، تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم کی ترکیبی صورت سے پہلے، فضائے غیر متناہی میں نہایت چھوٹے چھوٹے اجزا پھیلے ہوئے تھے، ان اجزا کو علمی اصطلاح میں دیمقراطیسی کہتے ہیں، یہ اجزا آپس میں ملے اور ترکیب پاکر رفتہ رفتہ یہ عالم پیدا ہو گیا،

اس تجویز پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ اجزا خود بخود کیونکر مل گئے؟ اور یہ گوناگوں

خود بخود بھاپ پیدا ہوتی ہی، اوپر جاتی ہے، پانی بنتی ہی اور برستی ہی، اسی طرح خدا نے خلقت کے اصول او قوانین مقرر کر دیئے ہیں، جن کے موافق، نظام عالم قائم ہی، اور نئے نئے حوادث کا سلسلہ جاری رہتا ہے، محققین اہل مذہب کا عموماً یہی مذہب ہے اور خود مسلمانوں میں اشاعرہ کے سوا، باقی تمام فرقوں کی یہی رائے ہے،

جب یہ مسلّم ہو گیا کہ عالم کا سلسلہ چند قوانین قدرت پر قائم ہی تو بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ یہ قوانین قدرت خود بخود بنے ہیں، یا خدا نے بنائے ہیں، اگر پہلا احتمال فرض کیا جائے تو خدا کی مطلق ضرورت نہیں رہتی،

قوانین قدرت خود بنتے ہیں،

مادہ کی نسبت یہ ثابت ہو چکا ہی کہ وہ قدیم ہے، علوم جدیدہ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے، یعنی جب محض اجزائے دمیقراطیسی تھے تو یہ اجزا ہمیشہ حرکت میں تھے، اور جب ان اجزا کی ترکیب سے مختلف اجسام بنے، تب بھی یہ اجزا ہر وقت خود بخود حرکت میں رہتے ہیں گو ہمکو نظر نہیں آتے، ان امور کے تسلیم کے بعد اس بات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قوانین قدرت کے لئے، ایک الگ صانع یعنی (خدا) تسلیم کیا جائے، اجزائے دمیقراطیسی جب آپس میں امتزاج پاتے ہیں، تو مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہر صورت خود ایک خاصہ اور ایک اثر رکھتی ہی، یہ خاصہ اور اثر خود اس ترکیب اور امتزاج کا نتیجہ ہے، باہر سے کوئی شخص ان صورتوں میں وہ خواص پیدا نہیں کرتا، اس مضمون کو یوں سمجھو کہ خود فلسفۂ قدیمہ میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ ذاتیات اور لوازم مجعول نہیں، مثلاً خدا نے مختلف انواع

شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے"

اے پُر رعب سمندر! اے وہ کہ غضبناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہی، کس نے تجھکو محبوس کر رکھا ہے، جس طرح شیر کٹہرہ میں قید کر دیا جاتا ہی، تو اس قید خانہ سے فائدہ نکل جانے کی کوشش کرتا ہے، تیری موجوں کا زور ایک حد معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا"

خدا تمام اشیا کا بالذات خالق ہے یا بواسطہ

ان سوالات کے جواب دینے کے لئے پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ خود اہلِ مذہب نے کائنات کی خلقت، اور اس کے بقا و استمرار کا کیا اصول قرار دیا ہی، اس بارہ میں اہلِ مذہب کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ عالم میں جو کچھ پیدا ہوتا رہتا ہی، ایک ایک چیز کو خود خدا، بالذات اور بلا واسطہ پیدا کرتا ہے، اسباب علل اور درمیانی وسائط کوئی چیز نہیں، پانی جو برستا ہی، تو اس وجہ سے نہیں برستا کہ سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے وہ اوپر جا کر سردی کی وجہ سے پانی بنجاتی ہے اور بادل بنکر برستی ہی بلکہ خدا بالذات پانی برساتا ہے،

دوسرا گروہ کہتا ہی کہ خدا نے اشیا میں خواص اور تاثیر رکھی ہی، اور انہی خواص اور تاثیر کی وجہ سے کائنات کا سلسلہ پیدا ہوتا رہتا ہی، مثلاً خدا نے پانی میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ حرارت پاکر وہ بھاپ کی صورت میں بدل جاتا ہی، بھاپ کا یہ خاصہ ہے کہ خنکی پاکر وہ پانی بنجاتی ہے، اب ان خاصیتوں کے پیدا کرنے کے بعد، خدا کو باربار ہمیشہ دست اندازی نہیں کرنی پڑتی بلکہ انہی خاصیتوں کی بنا پر اوقاتِ معینہ میں

نتیجہ ہے یعنی ان کو بالذات خدا نے پیدا نہیں کیا، بلکہ وہ صورنوعیہ کا لازمی نتیجہ تھیں جو خود بخود ان کے ساتھ پیدا ہو گئیں[۲] یہ بحث باقی رہجاتی ہے کہ صورنوعیہ کا خالق کون ہی؟ اس قدر حکمائے قدیم کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ صورنوعیہ، قدیم اور ازلی ہیں نشر الطوالع میں ہی،

صورنوعیہ قدیم اور ازلی ہیں

وَزَعَمَ اَرسطاطالیسُ وَابُونصرِ	ارسطو، ابونصر فارابی اور بو علی سینا کا
الفارابی وَابُوعلی بن سینا اَنَّ الافلاک	خیال ہے کہ افلاک کا مادہ، مقدار اور
قدیمۃٌ بِموادّھا وَمقادیرِھا	اشکال، قدیم ہیں، صرف ان کی حرکت
وَاشکالِھا سِوی حرکاتِھا وَالعناصِر	قدیم نہیں ہے، اور عناصر کا مادہ
بِموادِّھا وَصُورِھا الجسمیۃ بنوعِھا	اور ان کی صورجسمیہ کی نوع اور
وَصُورِھا النوعیۃ بجنسِھا	صورنوعیہ کی جنس قدیم ہے،

صورنوعیہ کا قدیم ہونا جب خود اہل مذہب تک تسلیم کرتے ہیں[۳]، تو اب صرف یہ بحث رہجاتی ہے کہ صورنوعیہ خود بخود پیدا ہو گئیں، یا خدا نے پیدا کیں، اہل مذہب اس بات پر کوئی دلیل نہیں قائم کر سکتے کہ صورنوعیہ خدا نے پیدا کیں، بلکہ یہ احتمال زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ

---

[۱] شاہ صاحب کا مقصود یہ ہے کہ صورت نوعیہ اصل اور نوعی لوازم و خصائص صورت نوعیہ کے ساتھ بالتبع پائے جاتے ہیں، اس لئے کسی صورت نوعیہ کی پیدائش کے ساتھ ہی بحکم الٰہی اُس کے لوازم و خواص بھی پیدا ہوجاتے ہیں کیونکہ انھیں الگ الگ لوازم و خواص ہی سے مختلف صورنوعیہ بنے ہیں، (س س ن)

[۲] گروہ ہوئیں، اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے، اس لئے معترض نے شاہ صاحب کی عبارت سے غلط فائدہ اٹھانا چاہا ہے،" س س ن"

[۳] معترض کا یہ قول غلط ہے، اہل مذہب ایسا تسلیم نہیں کرتے، "س س ن"

کے درخت پیدا کئے، جن میں سے ہر نوع کا پتہ، شاخیں، پھول، پھل، مزہ، رنگ مختلف ہوتا ہے لیکن یہ چیزیں خدا نے بالذات پیدا نہیں کیں، بلکہ صرف اس نوع کو پیدا کیا، اور یہ چیزیں اس کے لوازم ہونے کی وجہ سے آپ سے آپ پیدا ہو گئیں،

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ[1] میں لکھتے ہیں،

فَاِنَّهٗ جَعَلَ لِكُلِّ نَوْعٍ اَوْرَاقًا بِشَكْلٍ	خدا نے ہر قسم کے درخت کیلئے جداگانہ شکل
خَاصٍّ وَاَزْهَارًا بِلَوْنٍ خَاصٍّ وَثِمَارًا	کے پتے، جداگانہ رنگ کے پھول، جداگانہ مزے
مُخْتَصَّةً بِطُعُوْمٍ وَتِلْكَ الْاُمُوْرُ	کے پھل بنائے جس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
يُعْرَفُ اَنَّ هٰذَا الْفَرْدَ مِنْ نَوْعِ	یہ خاص درخت فلاں درخت کے افراد میں داخل
كَذَا وَكَذَا وَهٰذِهٖ كُلُّهَا تَابِعَةٌ	ہے اور یہ سب خاصیتیں صورت نوعیہ کی تابع
لِلصُّوْرَةِ النَّوْعِيَّةِ مُلْتَوِيَةٌ	ہیں اور اسی میں لپٹی ہوئی ہیں،

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں،

وَلَيْسَ لَكَ اَنْ تَقُوْلَ لِمَ كَانَتْ	اور تم یہ پوچھ نہیں سکتے کہ خرما کا پھل اس صفت
ثَمَرَةُ النَّخْلِ عَلٰى هٰذِهِ الصِّفَةِ	کا کیوں ہوتا ہے، کیونکہ ایسا سوال کرنا لغو
فَاِنَّهٗ سُؤَالٌ بَاطِلٌ لِاَنَّ وُجُوْدَ	ہے اس وجہ سے کہ ماہیت کے جو لوازم ہیں اسکے
لَوَازِمِ الْمَهِيَّاتِ مَعَهَا لَا يُطَالَبُ بِلِمَ	ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور انکی نسبت یہ سوال

(یعنی سائنس صرف کیسے کا جواب دیتی ہے)

اس امر کے تسلیم کرنے کے بعد کہ مظاہر قدرت کا بڑا حصہ خود اشیا کی صورت نوعیہ کا

---

[1] صفحہ ۲۰،

لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں کیونکہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں احتمال یکساں نہیں ہیں تمام مدرکات اور معلومات کی واقعیت کا اصلی معیار یہ ہے کہ جو علم جس قدر زیادہ محسوسات پر مبنی اور محسوسات سے زیادہ قریب ہے، اسی قدر یقینی اور زیادہ قابل اعتماد ہے، جس قدر محسوسات سے بُعد ہوتا جاتا ہے اسی قدر یقینی ہونے کا درجہ گھٹتا جاتا ہے، اور اگر تحلیل کرنے کے بعد اس کی انتہا محسوسات تک نہیں پہونچتی، تو وہ محض وہمی علم ہے، کیونکہ یہ امر محقق ہوچکا ہے کہ انسان ان اشیاء کو جان سکتا ہے جو یا محسوس ہیں، یا محسوسات سے ماخوذ ہیں،

اس بنا پر پہلا احتمال یعنی محض مادہ اور حرکت کا مبدا رکائنات ہونا زیادہ تر قریب یقین ہے، عالم میں جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ مادہ ہے، حرکت ہے، قوت ہے، یہ مسئلہ بھی محسوسات میں داخل ہے کہ تمام دنیا مل کر کسی چیز کو نہ مطلق فنا کر سکتی، نہ عدم محض سے پیدا کر سکتی، اس سے خود بخود ثابت ہوتا ہے کہ مادہ قدیم ہے، اس لئے مادہ کا قدیم ہونا بھی گویا محسوسات میں داخل ہے، یہ بھی محسوسات میں داخل ہے کہ چند قوانین قدرت ہیں، جن کے مطابق کائنات کا سلسلہ قائم ہے، مثلاً کشش اجسام، مسئلۂ ارتقاء انتخاب طبعی وغیرہ وغیرہ،

خدا کا وجود محسوسات سے ماخوذ نہیں،

لیکن دوسرا احتمال یعنی خدا کا وجود نہ خود محسوسات میں ہے نہ محسوسات سے ماخوذ ہے، اس قدر بے شبہہ محسوس ہے کہ ہر حادث، علت کا محتاج ہے، لیکن مادہ حادث نہیں، اور چونکہ حرکت اور قوت، خود مادہ کے لوازم طبعی ہیں، اس لئے وہ بھی حادث نہیں،

خود بخود پیدا ہوگئیں کیونکہ جب وہ قدیم اور ازلی ہیں تو ان کو بغیر کسی قوی دلیل کے معلول کہنا بالکل خلافِ عقل ہے، حاصل یہ کہ اجزائے دیمقراطیسی قدیم ہیں، ان کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے حرکت سے امتزاج پیدا ہوا، امتزاج نے مختلف صور نوعیہ پیدا کیں، باقی تمام مظاہر کائنات ان صور نوعیہ کے نتائج لازمی ہیں جیسا کہ خود اہلِ مذہب کو تسلیم ہے۔

رابرٹ انگرسال جو امریکہ کا مشہور ملحد ہے، اپنی کتاب "انکار خدا" میں لکھتا ہے

"فرض کرو کہ نیچر سے برتر کوئی قوت نہیں اور مادہ اور قوت، ازل سے موجود ہیں، اب خیال کرو کہ دو ذرے باہم ملیں تو کیا کوئی نتیجہ پیدا ہوگا؟ ہاں فرض کرو اگر وہ مخالف جہتوں سے برابر قوت کے ساتھ آئیں تو دونوں رک جائیں گے اور یہی نتیجہ ہوگا، اگر ایسا ہو تو مادہ، قوت اور نتیجہ بلا کسی ایسی قوت کے ہیں جو نیچر سے برتر ہو، اگر فرض کرو کہ دو ذرے اس طرح ملیں تو کیا نتیجہ بعینہ وہی نہ ہوگا؟ ہاں ایک ہی قسم کی حالت سے ایک ہی قسم کا نتیجہ ہوگا، اور اسی کے معنی قانون اور ترتیب کے ہیں، تو اب مادہ، قوت، قانون، ترتیب بلا ایسی قوت کے ہیں جو نیچر سے بالاتر ہو۔"

شاید یہ کہا جائے کہ جس طرح یہ سلسلہ فرض کیا جاتا ہے، یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ مادہ اور اجزائے دیمقراطیسی قدیم ہیں، لیکن خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور پھر ان کے امتزاج اور اختلاط سے عالم پیدا ہوا، اور جب اس سلسلہ کے فرض کرنے میں کوئی استحالہ نہیں تو اسی کو ترجیح کا حق ہے، کیونکہ جواز میں دونوں احتمال برابر ہیں اور دوسرے احتمال کو ترجیح زائد یہ ہے کہ دنیا کا بڑا حصہ اسی احتمال کو آج تک مانتا آتا ہے،

قادر مطلق اور حکیم ہے۔ رابرٹ انگرسال اپنی کتاب میں جو خدا کے انکار پر ہی لکھا ہے:-

"فرض کرو ایک جزیرہ پر ایک آدمی دس لاکھ برس کی عمر کا ملے جس کے پاس ایک نہایت عمدہ خوبصورت گاڑی موجود ہو، اور اس کا یہ دعویٰ ہو کہ یہ گاڑی اسکی لاکھوں برس کی محنت کا نتیجہ ہے جس کے ایک ایک پرزہ کے ایجاد کرنے میں پچاس پچاس ہزار برس صرف ہوئے، تو کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ وہ شخص ابتدا ہی سے فنِ جرثقیل میں ماہر تھا،

مخلوق کی ترقی سے کیا یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ خالق میں بھی ترقی ہوئی ہے، کیا ایک نیک، عاقل اور قادر مطلق خدا انسان کو پیدا کرنا چاہتا تو اس طرح پیدا کرتا کہ پہلے نہایت ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کی سادہ حالت میں پیدا کرتا، پھر ایک غیر محدود زمانہ کے بعد آہستہ آہستہ ترقی دیکر انسان بناتا، اس طرح سالہاے بے شمار، ان شکلوں اور ہیئتوں کے بنانے میں صرف ہوئے، جن کو آخر کار خارج کرنا پڑا"۔

(۲) دنیا میں نہایت کثرت سے جور و ظلم، خونریزی اور قتل، مصیبت اور رنج پایا جاتا ہے، اس لئے کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کا خالق، رحیم اور عادل ہے انگرسال کہتا ہے کہ "دنیا کی سطح کو ایسے خوفناک اور نفرت انگیز جانوروں سے بھرنا جو ایک دوسرے کی تکلیف اور ایذا پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، کیا اس میں بصیرت اور عقلمندی کی علامت پائی جاتی ہے؟ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کے رحم کی کون قدر کر سکتا ہے، جب کہ ہر جانور دوسرے جانور کو کھاتا ہے، یہاں تک کہ ہر منھ ایک مذبح اور ہر پیٹ ایک قبرستان ہے۔

اور جب مادہ، قوت، حرکت قدیم ہیں اور کائنات کے تمام انواع، انہی چیزوں کا نتیجہ ہیں تو خدا کا وجود کن محسوسات سے ماخوذ کہا جا سکتا ہے؟ پروفیسر لیتر یہ کہتا ہے کہ جن اسباب نے کائنات کو پیدا کیا ہے، بظاہر وہ خود کائنات میں موجود ہیں، اور ان سے الگ نہیں اور انہی اسباب کو ہم قوانین فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔" ایک اور مشہور پروفیسر کہتا ہے کہ "قوانین فطرت اور خدا، ان دونوں میں سے ہمکو صرف ایک کی ضرورت ہے"

یہ اُن ملاحدہ کے خیالات ہیں، جن کا یہ بیان ہے کہ ہم کو خدا کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ملتی، اور اگر صرف احتمال سے کام لیا جائے تو خدا کے عدم کا احتمال، وجود سے زیادہ قوی ہے، لیکن ملاحدہ کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو علانیہ اس بات کا مدعی ہے کہ خدا کا وجود جس طرح بیان کیا جاتا ہے، ہو ہی نہیں سکتا؛

یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کے معنی اگر صرف علۃ العلل کے ہیں تو ہمکو کچھ بحث نہیں، لیکن اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ قادر مطلق، حکیم، صاحب ارادہ، عادل، اور رحیم بھی ہے تو اس کا ثبوت نہیں ہوتا، بلکہ اس کے خلاف بہت سے دلائل موجود ہیں جن کی تفصیل ذیل میں ہے۔

منکرین خدا کے دلائل

(۱) ڈارون کے مسئلۂ ارتقا نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام مخلوقات نہایت ادنیٰ درجہ سے ترقی کرتے کرتے موجودہ حالت پر پہونچی ہیں، خود انسان جو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے نہایت ادنی درجہ کا جانور تھا، ترقی کرتے کرتے بندر کی حد تک پہنچا اور پھر ایک دو زینہ کے بعد آدمی بن گیا، اس بنا پر کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کا پیدا کرنے والا

پیدا کرنی چاہیے تھی، فریب، جھوٹ، فسق فجور، حسد، بغض، دشمنی، انتقام، بیرحمی کے وجود کی کیا ضرورت تھی؟ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی صاحب ارادہ اور مختار خدا نہیں ہے، بلکہ صرف لا آف نیچر ہے، جس کے موافق کائنات کا ایک سلسلہ قائم ہے اور بغیر کسی غرض، اور مقصد کے جو کچھ ہوتا ہے ہوا جاتا ہے،

ایک مشہور ملحد کہتا ہے کہ "جہانتک ہم تمیز کر سکتے ہیں، ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ نیچر بلا محبت اور بلا ارادہ ہمیشہ مختلف اشکال بناتا اور بدلتا رہتا ہے، نہ اس کو غم ہے، نہ خوشی، زہر و غذا، رنج و طرب، زندگی و موت، ہنسی اور آنسو، سب اس کے نزدیک یکساں ہیں، نہ وہ رحیم ہے، نہ وہ خوشامد سے خوش ہوتا ہے، نہ آنسو گرانے سے متاثر[1]"

ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ عالم اجزاے دیمقراطیسی سے بنا ہے، ہمکو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم[2] ہے، جیسا کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ[3] اور حکماے اسلام یعنی فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی رائے ہے، بلکہ جیسا کہ ابن رشد نے تلخیص المقال میں لکھا ہے، خود قرآن مجید کی ان آیتوں سے اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا وَّکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ، یہی تبادر

[1] یہانتک ملاحدہ کے اعتراضات و اقوال ہیں، آگے ان کا جواب ہے،

[2] یہ تقریر فرضاً ہے، یعنی اگر عالم کو قدیم بھی مان لیں تب بھی خدا کے ماننے سے چارہ نہیں "س س ن"

[3] یہ مصنف کا سہو قلم ہے، معتزلہ ہرگز قدیم عالم کے قائل نہیں، "س س ن"

اس عام اور دائمی خونریزی میں غیر محدود بصیرت اور محبت کا وجود غیر ممکن ہی؟"

"سالہا سال کی تاریکی میں جو تکلیفیں بنی نوع انسان کو پہنچیں وہ قیاس نہیں کیجا سکتیں زیادہ تر حصہ اس تکلیف کا کمزور، نیک اور معصوم لوگوں نے برداشت کیا، عورتوں سے زہریلے درندوں کی طرح سلوک کیا گیا، معصوم بچے حشرات الارض کی طرح پاؤں سے کچلے گئے، قوم کی قوم پر صدیوں غلامی کا فتویٰ رہا اور تمام عالم میں وہ ستم برپا رہا جس کو زبانِ قلم ادا نہیں کرسکتی؟"

اگر کوئی کہے کہ آیندہ دنیا میں ان مصیبت زدوں کو تکلیف کا بدلہ مل جائیگا تب بھی اس اعتراض کا جواب نہیں ملتا، اس بات کی امید کرنے کا ہمکو کیا حق حاصل ہی کہ ایک کامل، عاقل، نیک اور با اقتدار حکیم ہمارے ساتھ بمقابلۂ حال کے آیندہ بہتر سلوک کریگا، کیا خدا میں زیادہ قوت آجائیگی؟ کیا وہ زیادہ رحیم ہو جائیگا؟ کیا اسکی مہربانی اپنی عاجز مخلوق کے ساتھ زیادہ ترقی کرجائیگی؟"

(۳) یہ امر ظاہر ہے کہ سیکڑوں آدمی خلقۃً نہایت بیرحم، سخت دل، بدکار اور مائل بہ شہوات ہوتے ہیں، بلکہ خلقت کا زیادہ حصہ برے ہی آدمیوں کا ہی، اس صورت میں کیونکر قیاس ہو سکتا ہی کہ ایک حکیم اس قسم کے اشخاص کا پیدا کرنا جائز رکھتا، قیامت کی جزا و سزا، اس عقدہ کو حل نہیں کرسکتی، کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ ان اشخاص کے پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پیدا کرنا اور پھر ان کو قیامت میں سزا دینا اس سے کیا فائدہ؟ اگر خدا قادر مطلق ہی تو اس کو دنیا میں صرف نیکی، راست بازی، نکوکاری،

سے تعبیر کیا ہے،

قوانینِ قدرت کا بھی یہی حال ہی، عالم میں سیکڑوں ہزاروں قوانینِ قدرت ہیں لیکن اگر ان میں سے ایک بھی باہمی توافق کے مرکز سے ذرا ہٹ جائے تو تمام نظامِ عالم برہم ہوجائے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی اور بالاتر قوت ہی جو ان تمام قوانینِ قدرت کو محکوم رکھتی ہے، اور جس نے ان تمام قوانین میں، باہم توافق، تناسب، ربط اور اتحاد پیدا کیا ہے، میٹرلسٹ یہ کہہ سکتا ہے کہ مادہ خود بخود پیدا ہوا، مادہ کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی، حرکت نے امتزاج پیدا کیا، اور پھر رفتہ رفتہ بہت سے قوانینِ قدرت پیدا ہوگئے لیکن وہ اس بات کی وجہ نہیں بتا سکتا کہ ان سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں قوانینِ قدرت میں یہ توافق، تناسب اور اتحاد کہاں سے آیا؟ توافق اور اتحاد پیدا ہونا خود ان قوانین کی ذاتی خاصیت نہیں ہی، اور اگر کوئی ایسا دعوی کرے تو محض ایک فرضی احتمال ہوگا جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی ہی بالاتر قوت جو تمام قوانینِ قدرت پر حاکم ہے اور جس نے ان تمام قوانین میں ربط اور اتحاد قائم کیا ہی خدا ہے یہی معنی ہیں قرآن مجید کی اس آیت کے

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	زمین اور آسمان میں جو کچھ ہو سب اس کا
وَالْأَرْضِ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا	کہا مانتے ہیں بجبر یا بخوشی

یورپ کے بڑے بڑے حکما، اور فلاسفرز کو اسی بنا پر خدا کا اقرار کرنا پڑا ہی،

ملین اڈورڈ (Milne Edward) کہتا ہے انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ

ہوتا ہے، ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں، حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے، مختلف قوانینِ قدرت ہیں جن کے موافق، اجزا باہم ملتے ہیں، ترکیب پاتے ہیں، اور پھر ان میں خاص خاص قویٰ اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا، اس کی تفصیل یہ ہے،

ملاحدہ کے اعتراض کا رد

اس میں شبہہ نہیں کہ عالم کا تمام نظام، قوانینِ قدرت یا لا آف نیچر پر قائم ہے لیکن یہ قوانین، الگ الگ مستقل بالذات، اور ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ سب ایک دوسرے کے موافق، متناسب اور معین ہیں ان میں باہم اس قدر تناسب اور ربط ہے کہ ایک چھوٹی سی چیز کے پیدا کرنے میں کل قوانینِ قدرت باہم مل کر کام کرتے ہیں، ایک کمزور سے کمزور گھانس اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب خاک، ہوا، پانی وغیرہ سے لیکر بڑے بڑے اجرامِ فلکی مثلاً آفتاب و ماہتاب وغیرہ کے افعال اور خواص اس کے پیدا کرنے میں مشارکت اور توافق کو عمل میں لائیں، اسکی مثال بالکل ایسی ہے جس طرح انسان کے جسم میں سینکڑوں اعضا، جوارح اور اعصاب ہیں، یہ اعضا اور جوارح الگ الگ ہیں اور ہر ایک کا کام جدا ہے، لیکن کوئی عضو اس وقت تک کام نہیں دے سکتا جب تک اور تمام اعضا بالذات یا بواسطہ اس کے عمل میں شریک نہ ہوں، یا کم سے کم یہ کہ اس کے کام میں خلل انداز نہ ہوں، اسی سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ان اعضا کے قویٰ مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ انسان میں کوئی اور عام قوت ہے، جو ان تمام اعضا کی جداگانہ قوتوں سے بالاتر ہے اور جس کی ماتحتی میں یہ سب باتفاق کام کرتے ہیں، اس عام قوت کو نفس، روح یا مزاج

تمام قوائے قدرت باہم موافق اور معاون ہیں

البتہ یہ اعتراض توجہ کے قابل ہے کہ دنیا میں نیکی کے ساتھ برائی کیوں ہی؟

بوعلی سینا نے شفا میں اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دنیا کی تین حالتیں فرض کی جاسکتی ہیں،

محض بھلائی ہی بھلائی ہوتی، محض برائی ہوتی، زیادہ بھلائی ہوتی اور کسی قدر برائی

اب فرض کرو کہ قدرت کے سامنے یہ تینوں پیش ہیں تو اس کو کیا کرنا چاہیئے؟

پہلی صورت کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ وہ اختیار کرنے کے قابل ہی، دوسری صورت بھی قابلِ بحث نہیں کیونکہ ہر شخص کے نزدیک وہ قابلِ اختیار ہے اور قدرت نے بھی ایسا ہی کیا، یعنی ایسی دنیا پیدا نہیں کی جس میں برائیاں ہی برائیاں ہوں، صرف تیسری صورت بحث کے قابل ہی، یعنی قدرت کو ایسا عالم پیدا کرنا چاہیئے یا نہیں جس میں بھلائیاں زیادہ اور برائیاں کم ہوں، اگر ایسا عالم پیدا نہ کیا جاتا تو بے شبہہ یہ فائدہ ہوتا کہ چند برائیاں عالمِ وجود میں نہ آتیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی بھلائیوں کا بھی وجود نہ ہوتا، اسکا یہ نتیجہ ہوتا کہ چند برائیوں کے لئے دنیا ہزاروں بھلائیوں سے محروم رہجاتی،

ابن رشد نے اس اعتراض کا اور جواب دیا ہی، وہ کہتا ہی کہ دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے وہ بالذات نہیں بلکہ کسی بھلائی کی تابع اور لازم ہے، غصہ بری چیز ہے، لیکن اس حاسہ کا نتیجہ ہے جس کی بدولت انسان حفاظتِ خود اختیاری کرتا ہے۔ یہ حاسہ نہ ہو تو انسان ایک قاتل کے مقابلہ میں اپنی جان بچانے کی بھی کوشش نہ کرے، فسق و فجور بری چیزیں ہیں، لیکن یہ اسی قوت سے متعلق ہیں، جس پر نسلِ انسانی کا بقا منحصر ہے، آگ گھروں کو جلا

بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یا دوسری عبارت میں یوں کہنا چاہئے کہ مادہ کی عام خاصیت کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دیا ہی، علم حقیقی نے اُن کو بالکل باطل کر دیا ہی، فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں لا سکتا۔"

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہی "یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں جب ہم ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہی کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت ہی جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں۔"

پروفیسر لینہ کہتا ہے "وہ خدائے اکبر جو ازلی ہے، جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہی جو ہر چیز پر قادر ہے، اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہی کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں۔"[1]

اب ہم اُن اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو خدا کے قادر مطلق، رحیم اور عادل ہونے کی نسبت کئے جاتے ہیں، یہ اعتراض کہ اگر خدا قادر مطلق ہوتا تو دنیا کو بتدریج کیوں پیدا کرتا، اس قدر لغو ہے کہ توجہ کے بھی قابل نہیں،

ایک قطرہ کا رحم میں پڑنا، پرورش پانا، گوشت پوست چڑھنا، مختلف اعضا کا پیدا ہونا، جان کا پڑنا، خون سے غذا پانا اور پھر نور کا پتلا بن کر ہستی کے منظر پر آنا، زیادہ اعجوبہ نما اور کمالِ قدرت کی دلیل ہے؟ یا دفعۃً بنا بنایا ایک انسانِ مجسم کا پیدا ہو جانا؟

---

[1] ہربرٹ اسپنسر اور پروفیسر لینہ کے یہ اقوال پہلے بھی ہم نقل کر چکے ہیں،

کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے، وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا،

توحید

ذاتِ باری کا اجمالی اعتراف، تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے، اس بنا پر اسلام نے اس مسئلہ پر چنداں زور نہیں دیا، اسلام کے مختصات میں جو چیز ہے وہ توحید ہے، کیونکہ دوسرے مذاہب میں یا تو سرے سے توحید تھی ہی نہیں، یا تھی تو کامل نہ تھی، اسی بنا پر قرآن مجید نے بار بار کہا کہ کفار کو بھی خدا سے انکار نہیں، کفار کو جو وحشت ہے وہ توحید سے ہے،

اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (مومن - ۲)
جب اکیلا خدا پکارا جاتا ہے تو تم منکر ہو جاتے ہو اور اگر کوئی اور شریک کر لیا جائے تو تم مان لیتے ہو

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ، (زمر - ۵)
اور جب خدا کا تنہا ذکر کیا جاتا ہے تو منکرین قیامت کا دل بدک جاتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ جن اسباب سے ہم کو خدا کے وجود کا یقین ہوتا ہے بعینہ وہی اسباب اس بات کے بھی شاہد ہیں کہ خدا ایک ہی ہے، نظامِ عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے، لیکن سب مل کر ایک ہے، یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اسکو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد، اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو، اسی دلیل کو قرآن مجید میں اس طرح ادا کیا ہے،

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا،
اگر آسمان اور زمین میں کئی خدا ہوتے تو نظامِ عالم بگڑ جاتا،

دیتی ہے، شہر کے شہر اس سے تباہ ہوجاتے ہیں، لیکن اگر آگ نہ ہو تو انسان کا زندگی بسر کرنا محال ہوجائے،

اب صرف یہ شبہہ رہتا ہو کہ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جو چیز پیدا کیجاتی اس میں اچھائی ہی اچھائی ہوتی، بُرائی مطلق نہ ہوتی، ابن رشد کہتا ہو کہ ہاں یہ ممکن ہی نہ تھا، کوئی ایسی آگ نہیں پیدا کی جاسکتی کہ اس سے کھانا پکانا چاہیں تو پک جائے لیکن اگر مسجد کو جلانا چاہیں تو نہ جلائے،

باقی یہ اعتراض کہ دنیا میں اکثر اچھے آدمی تکلیف اٹھاتے ہیں اور بُرے آدمی عیش و عشرت سے بسر کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی، اس حیاتِ فانی تک ختم نہیں ہوجاتی، اس لئے یہ کیونکر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم جن کو عیش و عشرت میں بسر کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں یہ ان کی پوری زندگی کی تصویر ہو، ہمارے سامنے اس سلسلہ کا بہت چھوٹا سا حصّہ ہے، اس کی بنا پر ہم پورے سلسلہ کی نسبت کیونکر رائے دے سکتے ہیں، آگے چل کر ہم ثابت کریں گے کہ جزا و سزا، افعالِ انسانی کے لازمی نتائج ہیں جو کسی طرح ان سے جدا نہیں ہو سکتے، جس طرح مرنا زہر کھانے کا اور سیراب ہونا پانی پینے کا لازمی نتیجہ ہے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ بہت سے لوگ اچھے یا بُرے کام کرتے ہیں اور اُن کے نتیجے ان کو پیش نہیں آتے،

نظامِ عالم میں ہم کو جو برائیاں ابتریاں اور نقائص نظر آتے ہیں، کون کہہ سکتا ہو کہ واقعی نقائص ہیں؟ یا اس وجہ سے نظر آتے ہیں کہ نظامِ عالم کا پورا سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، ایسی حالت میں صرف اتنی بات پر خدا کے کمال اور عزت و جلال کا

کامل یعنی شرک کے ہر قسم کے شائبوں سے پاک کر دیا، اور یہ منجملہ ان تکمیلوں کے ہے جن کی وجہ سے اسلام کے بعد اور کسی مذہب کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ کمال کے بعد پھر کوئی درجہ نہیں، توحید کامل کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں کوئی شریک نہیں اسی طرح اس کی صفات میں بھی کوئی شریک نہیں، پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب ہونا، دور و نزدیک سے یکساں تعلق رکھنا، یہ تمام صفات خدا کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں، اسلام کے سوا اور مذہب والے اوتاروں اور پیغمبروں میں بھی یہ اوصاف مانتے تھے اور مانتے ہیں، اور یہی توحید کا نقص ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اب اصطلاح کا پردہ رکھ کر ان اوصاف کو اوروں میں بھی ماننے لگے ہیں، اسلام نے توحید کے کمال کے لئے توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات اور توحید فی العبادت کو بھی ضروری قرار دیا یہاں تک کہ سجدۂ تعظیمی جو تمام دوسرے مذاہب میں خدا کے سوا اوروں کے لیے بھی جائز تھا، اسلام نے اس کو بھی حرام کر دیا،

توحید فی الصفات و فی العبادت

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے اقرار اور اعتراف کا دل پر جو اخلاقی اثر پڑتا ہے وہ توحید کامل کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا، اطاعت، انقیاد، خشوع، استقلال، توکل، اخلاص کی حالت اسی وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ خیال ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں، تمام امیدوں، تمام اغراض، تمام خواہشوں کا ایک ہی مرکز ہے، انسان میں استقلال، آزادی، دلیری، بے نیازی کے اوصاف بھی توحید کامل کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے، جو شخص ایک کے سوا اوروں کو بھی حاجت روا مانتا ہے، اس کا سر ہر آستانہ پر جھک جانے کیلئے تیار رہتا ہے،

منطقی پیرایہ میں اگر یہ استدلال بیان کیا جائے تو پہلے مقدماتِ ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہئے۔

۱۔ عالم میں گو بظاہر ہزاروں لاکھوں اشیاء نظر آتی ہیں لیکن عالم ایک شے واحد ہے اور یہ تمام اشیاء اسکی ذاتیات اور اجزاء ہیں، جس طرح انسان میں باوجود اس کے کہ ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ، ناک، بہت سے اعضا پائے جاتے ہیں تاہم انسان ایک شے واحد ہی ہے،

۲۔ ایک چیز کی دو علتِ تامہ نہیں ہوسکتیں، کیونکہ علتِ تامہ کے یہ معنی ہیں کہ اسکے وجود کے ساتھ بلا انتظار کسی اور چیز کے معلول وجود میں آجائے، اسلئے اگر ایک معلول کے لئے دو علتِ تامہ ہوں تو ایک بالکل بیکار ہوگی،

۳۔ خدا، عالم کی علتِ تامہ ہے،

اب استدلال کے مقدمات یہ ہیں، عالم ایک شے واحد ہے، اور شے واحد کی دو علتِ تامہ نہیں ہوسکتیں، اس لئے عالم کی دو علتِ تامہ نہیں ہوسکتیں، خدا عالم کی علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ متعدد نہیں ہوسکتی، اس لئے خدا متعدد نہیں ہوسکتا، یہ بات خاص طور پر خیال کے قابل ہے کہ مطلق توحید بھی درحقیقت تمام مذہبوں میں پائی جاتی ہے، جن قوموں کو مشرک کہا جاتا ہے وہ بھی قادر مطلق ایک ہی ذات کو مانتے ہیں، البتہ اس کے مظاہر اور صفات کو متعدد کہتے ہیں، جس سے شرک کا گمان ہوتا ہے، عیسائی تین خدا مانتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تینوں ایک ہیں، یہ تعبیر کتنی ہی غلط ہو لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حقیقی تعدد ان کو بھی گوارا نہیں، اس لحاظ سے مطلق توحید بھی کوئی نئی بات نہیں، اسلام کو اس باب میں جو خصوصیت حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے توحید کو

توحید پر استدلال

اشاعرہ کا جو اعتقاد ہے گو تمام دنیا میں پھیل گیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج اس پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان سے کہیں زیادہ خود اشاعرہ ہی کے زمانہ میں کئے جا چکے تھے، اسی بنا پر امام غزالی، رازی، ابن رشد، راغب اصفہانی، اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ اساطینِ کلام نے اشاعرہ کے نقشِ قدم کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کی لیکن اشاعرہ کا مذہب عوام کے طبائع کے اس قدر موافق واقع ہوا تھا کہ امام غزالی وغیرہ نے جو کچھ ان کے موافق کہا وہ آج ایک ایک بچہ کے دل میں اور زبان پر ہے، اور جو کچھ ان کی خاص رائیں تھیں، وہ اس شور و ہنگامہ میں لوگوں کو سنائی بھی نہ دیں، مجبوراً ان بزرگوں نے بھیڑ سے الگ ہو کر ایک خاص دائرہ اختیار کیا اور جو کہنا تھا اسی خاص مجمع سے مخاطب ہو کر کہا،

خدا کا شکر ہے کہ اُن کی رازدارانہ گفتگوئیں گو پھیلیں نہیں لیکن بالکل ناپید بھی نہیں ہوئیں، میں اس بحث کو نہایت استیعاب کے ساتھ لکھوں گا جس سے امور ذیل مقصود ہیں،

(۱) یہ ظاہر کرنا کہ مسئلہ نبوت کے متعلق مجتہدین اور ائمہ فن کے ذاتی خیالات اور تحقیقات کیا ہیں؟

(۲) نبوت پر جو اعتراضات کئے جا رہے ہیں نئے نہیں ہیں، بلکہ مع شے زائد پہلے کئے جا چکے ہیں،

(۳) یہ اعتراضات، زیادہ ایک خاص ظاہر پرست گروہِ مذہب پر وارد ہوتے ہیں، محققین کا مذہب ان حملوں کی زد سے محفوظ ہے،

(۴) علم کلام کی مروجہ اور زیرِ درس کتابیں عامیانہ مذاق پر لکھی گئی ہیں، محققین اور ائمہ کلام

نبوت

نبوت کی کیا حقیقت ہی؟ اسکے کیا شرائط ہیں ؟ متنبی اور غیر متنبی میں حد فاصل کیا ہی؟

ان سوالات کا جواب آج تمام اسلامی فرقوں کی طرف سے عموماً یہ دیا جاتا ہی کہ نبوت خدا کا عطا کیا ہوا ایک منصب ہے، خدا جس کو چاہتا ہی دیتا ہے، نبوت کے لیے معجزہ شرط ہے اور یہی نبوت کی فصل اور ممیز ہے، اس جواب کی ابتدا اشاعرۂ ظاہرین سے ہوئی اور رفتہ رفتہ تمام اسلامی فرقوں میں یہی اعتقاد پھیل گیا،

جناب رسالت پناہ صلعم اور صحابہ کے زمانہ میں تو علمی اور اصطلاحی حیثیت سے اس مسئلہ کی بحث پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن دولت عباسیہ کی ابتدا ہی میں جب فلسفہ نے مذہب کے احاطہ میں قدم رکھا تو یہ بحث زور و شور کے ساتھ پیدا ہوئی، جہانتک ہمکو معلوم ہی سب سے پہلے اس مسئلہ پر جاحظ نے قلم اٹھایا اور ایک مستقل کتاب لکھی، علوم عقلیہ و نقلیہ میں جاحظ کا جو پایہ ہے اس کے لحاظ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا کچھ لکھا ہوگا؟ لیکن قدما کی تمام تصنیفات اس طرح برباد ہو چکی ہیں کہ آج اُس خرمن کا ایک دانہ بھی موجود نہیں، ایثار الحق میں جو نویں صدی کے ایک مجتہد یمنی کی تصنیف ہے اور آج کل مصر میں چھاپی گئی ہی ایک جگہ صرف اس کتاب کا تذکرہ ہے، اور شرح مواقف میں نبوت کے اثبات کے جو چار طریقے لکھے ہیں ان میں سے دوسرے طریقہ کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ جاحظ کا مذہب ہے اور امام غزالی نے بھی اسکی تحسین کی ہی"

نبوت کی تشریح سب سے پہلے جاحظ نے کی،

عام لوگوں کو اس اطلاع کا کیا ذریعہ ہے کہ فلاں شخص سے خدا نے باتیں کیں اور اس سے یہ یہ کہا،
اس بنا پر اشاعرہ نے نبوت کی شناخت کے لئے معجزہ کو دلیل قرار دیا یعنی جس سے معجزہ صادر
ہو اُس کی نسبت یہ یقین کیا جائیگا کہ خدا نے اس سے خطاب کیا، اس بنا پر امور ذیل تنقیح طلب ہیں

معجزہ کی کیا تعریف ہی اور اس کے کیا شرائط ہیں ؟

کیا اس سے نبوت پر استدلال ہو سکتا ہی ؟

معجزہ کی تعریف

معجزہ کی تعریف اشاعرہ نے یہ کی ہے کہ جس کے ظاہر کرنے سے نبوت کی تصدیق مقصود ہو،
اور اس کے لئے سات شرطیں قرار دی ہیں،

خدا[1] کا فعل ہو، خارقِ عادت[2] ہو، اس کا[3] معارضہ نا ممکن ہو، مدعیِ[4] نبوت سے ظاہر ہو، دعویٰ[5]
کے موافق ہو، نبی[6] کا مکذب نہ ہو، دعوٰی[7] پر مقدم نہ ہو،

ان شرطوں میں سے دو شرطیں قابلِ بحث ہیں،

یہ شرط کہ خارقِ عادت ہو، اس سے کیا مراد ہی ؟ اگر یہ مراد ہی کہ سلسلۂ اسباب اور اصولِ
فطرت کے خلاف ہو تو سوال یہ ہے کہ معجزہ واقع بھی ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

انسان کو جس قدر علوم حاصل ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، بدیہیات[1]، نظریات[2] بدیہیات
وہ امور ہیں جو بغیر غور و فکر کے حاصل ہوتے ہیں، یعنی انسان کو بغیر استدلال و احتجاج کے آپ
سے آپ اُن کا یقین حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ آفتاب روشن ہے، آگ جلاتی ہی، کل جزو سے
بڑا ہوتا ہے، دو متناقض یکجا جمع نہیں ہو سکتے،

نظریات وہ امور ہیں جو غور او فکر سے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ عالم حادث ہی، خدا

کی تحقیقات، یا سرے سے اُن میں مذکور نہیں، یا ہیں تو ان کو ایسے کمزور پیرایہ میں ادا کیا ہی کہ ان پر توجہ تک مائل نہیں ہو سکتی،

اب ہم اصل بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

خرقِ عادت کے مسئلہ کی بنا پر

نبوت پر اعتراض

اشاعرہ کے نزدیک نبوت کی حقیقت

نبوت کی تعریف جیسا کہ مواقف میں ہے اشاعرہ نے یہ کی ہے اور اسی کو تمام اہلِ حق کی طرف منسوب کیا ہے،

مَنْ قَالَ لَهُ اللّٰهُ اَرْسَلْتُكَ	پیغمبر وہ ہی جس سے خدا نے یہ کہا ہو کہ میں نے تجھ کو بھیجا یا
اَوْ بَلِّغْهُمْ عَنِّيْ وَنَحْوِهٖ مِنَ	لوگوں کو میری طرف سے پیغام پہنچا، یا اس قسم کے اور
الْاَلْفَاظِ وَلَا يُشْتَرَطُ فِيْهِ شَرْطٌ	الفاظ، اور پیغمبر ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں نہ
وَلَا اسْتِعْدَادٌ بَلِ اللّٰهُ يَخْتَصُّ	یہ شرط ہی کہ اُسمیں کسی قسم کی قابلیت ہو بلکہ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	خدا اپنی رحمت کے ساتھ اپنے بندوں میں سے
عِبَادِهٖ،	جس کو چاہتا ہی خاص کر لیتا ہی،

لیکن یہ تعریف اس قسم کی ہو کہ اس کی بنا پر کسی شخص کو نبی کہنا بھی نبی کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ

لے یہاں سے صفحہ تک جہاں یہ باب ختم ہوا ہے، ملاحدہ کے اعتراضات ہیں اُس کے بعد ان کا جواب ہی "س س ن"

"جب یہ مقدمہ ثابت ہوچکا توہم کہتے ہیں کہ جب ہم کسی انسان کو دیکھتے ہیں تو ہمکو قطعی یقین ہوتا ہے کہ یہ شخص پہلے رحم میں تھا، پھر رحم سے بچہ ہوکر نکلا، بچہ سے جوان ہوا، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں بلکہ وہ دفعۃً پیدا ہوکر جوان ہوگیا توہم قطعاً یقین کرلیں گے کہ یہ شخص غلط کہہ رہا ہے اور اس کا قول باطل و افترا ہے،

"اس سے ثابت ہوا کہ خرقِ عادات کا دعویٰ ایک لغو بات ہے، اور جب یہ کلیہ ثابت ہوچکا توہم چند مثالوں کے ذریعہ سے اسکو یہ سمجھاتے ہیں"

(۱) کوئی شخص اگر کہے کہ یہ ممکن ہے کہ دریا اور چشموں کا پانی آبِ زر بنجائے یا پہاڑ زر خالص ہوجائے تو ہر شخص اس کو مجنون کہے گا،

(۲) کوئی شخص اگر یہ کہے کہ ممکن ہے کہ میرے گھر میں جو پتھر پڑا ہے وہ حکیم بن جائے اور منطق و فلسفہ کے دقائق کا ماہر ہوجائے، ممکن ہے کہ گھر میں جتنے کیڑے ہیں، عالم و فاضل انسان بن جائیں، ممکن ہے کہ جب میں گھر کو واپس جاؤں تو میرا گدھا بطلیموس ہوچکا ہو، اور مجسطی پڑھا رہا ہو، اور گھر میں جو کیڑے مکوڑے تھے وہ آدمی بن کر ہندسہ و منطق و الٰہیات میں مباحثہ کر رہے ہوں، تو ہر شخص ایسے آدمی کو انتہا درجہ کا مجنون کہے گا،

(۳) اگر کوئی شخص کفدست میدان کو دیکھکر کہے کہ ممکن ہے کہ بغیر کسی معمار اور سامان تعمیر کے یہاں عالیشان ایوان اور محل بن جائیں، اور نہریں جاری ہوجائیں تو ہر شخص ایسے آدمی کو مجنون کہے گا،

اس سے ثابت ہوا کہ عقل بالبداہۃ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ جس قدر حوادث ہیں،

موجود ہے، روح قدیم ہے، نظریات اگرچہ خود بدیہی نہیں لیکن یہ ضرور ہو کہ ان کی انتہا بدیہیات تک ہو،

بدیہیات کے بہت سے اقسام ہیں، نظامِ قدرت میں جو چیزیں ہمیشہ ایک طرح پر وقوع میں آتی رہتی ہیں، اُن کے استقرار سے جو علم کلی پیدا ہوتا ہو وہ بھی بدیہیات کی ایک قسم ہو انہی بدیہیات میں سے یہ بھی ہو کہ عالم میں علل و اسباب کا سلسلہ جاری ہے یعنی جو چیز وجود میں آتی ہے اس کے علل اور اسباب ہوتے ہیں، اور جب کسی شے کے علل اور اسباب موجود ہوتے ہیں تو ضرور اس شے کا وجود ہوتا ہے، اب معجزہ کی اگر یہ تعریف ہے کہ علت و معلول کے سلسلہ کے خلاف وقوع میں آئے، تو معجزہ بداہتہً باطل ہوگا، کیونکہ علت و معلول کا علم انسان کو بداہتہً حاصل ہوتا ہو، اور جب معجزہ اس سلسلہ کے خلاف ہو تو بداہت کے خلاف ہے،

امام رازی نے مطالب عالیہ میں جہاں اس اعتراض کی تقریر کی ہو لکھتے ہیں[۱]، کہ "علم کی دو قسمیں ہیں بدیہی و نظری[۲]، نظری، بدیہی پر متفرع ہوتا ہو، اسلئے اگر کوئی نظری ایسا ہو جو بدیہی کو باطل کرتا ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ فرع اصل کے خلاف ہے" اور یہ محال ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علوم نظری بدیہیات میں خلل انداز نہیں ہو سکتے،

اب جب ہم غور کرتے ہیں کہ بدیہی کیا چیز ہے تو معلوم ہوتا ہو کہ جو علم انسان کو خود بخود یقینی طور پر حاصل ہوتا ہو، جسمیں وہ کسی طرح شک نہیں کر سکتا وہی بدیہی ہو،

---

[۱] یہ امام صاحب کی عبارت کا لفظی ترجمہ ہو،

حلول کر سکتے ہیں، اور اُس وقت اس آدمی سے وہ تمام عجیب وغریب افعال صادر ہو سکتے ہیں جو خود اجنہ اور شیاطین سے صادر ہو سکتے ہیں، اب فرض کرو کہ ایک مدعیِ نبوت کسی خرقِ عادت کا اظہار کرتا ہے تو یہ کیونکر اطمینان ہو سکتا ہو کہ یہ در پردہ کسی جن کا فعل نہیں ہے،

اشاعرہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جادو سے ہر قسم کے خرقِ عادات سرزد ہو سکتے ہیں، یہاں تک کہ آدمی گدھا اور گدھا آدمی بن سکتا ہو، اس صورت میں کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے کہ یہ خرقِ عادت معجزہ ہے سحر نہیں، شرح مواقف میں اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ سحر سے عظیم الشان خرقِ عادات سرزد نہیں ہوتے، جادوگر جب عظیم الشان خرقِ عادات دکھاتا ہے تو نبوت کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرے تو خدا اس کے خرقِ عادت کو روک دیگا؛

لیکن یہ جواب بالکل ناکافی ہے، اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر سے آدمی ہوا پر اڑ سکتا ہے، آدمی گدھا اور گدھا آدمی بنؔ جاتا ہے، زمین سے چشمے اُبل سکتے ہیں، جمادات میں حرکت پیدا ہو سکتی ہے، کیا یہ عظیم الشان خرقِ عادات نہیں ہیں؟ اس کے علاوہ انبیا کے بھی تمام معجزے عظیم الشان نہیں ہوتے، باقی یہ امر کہ جادوگر خرقِ عادت کیساتھ نبوت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں بیان کیجا سکتی۔

ہ امام رازی تفسیر کبیر ہاروت وماروت کے قصہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں، اما اهل السنة فقد جوزوا ان يقدر الساحر على ان يطير فى الهواء ويقلب الانسان حمارا والحمار انسانا،

وہ نظامِ مقررہ اور عادتِ مستمرہ کے موافق وقوع میں آتے ہیں اور یہ احتمال پیدا کرنا کہ ممکن ہی
اس کے خلاف ہو، بدیہیات میں قدح کرنا ہی۔ [۱]

بہرحال خرقِ عادت کو معجزہ کہنا، خود معجزہ کے وجود سے انکار کرنا ہی اسی بنا پر بعض اکابر
اشاعرہ نے خرقِ عادت کی قید معجزہ کی تعریف سے خارج کردی، شرحِ مواقف میں ہی،

وَالْمُعْجِزَةُ عِنْدَنَا مَا يُقْصَدُ بِهِ	اور معجزہ کی تعریف ہمارے نزدیک یہ ہے
تَصْدِيْقُ مُدَّعِي الرِّسَالَةِ وَاِنْ	کہ اس سے مدعی نبوت کی تصدیق مقصود
لَمْ يَكُنْ خَارِقًا لِلْعَادَةِ،	ہو، گو وہ خرقِ عادت نہ ہو،

اب فرض کرو کہ خرقِ عادت ممکن ہے اور معجزہ خرقِ عادت کا نام ہی یعنی یہ کہ ایک چیز بغیر
اسباب و علت کے وجود میں آئے، یا یہ کہ باوجود علت کے وجود کے معلول نہ پایا جائے مثلاً
کسی پیغمبر کو آگ نے نہیں جلایا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جلانے کی علت یعنی آگ موجود تھی، اور
وہ جلا نہ سکی، یا مثلاً کسی پیغمبر نے پتھر پر عصا مارا اور چشمہ جاری ہوگیا، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ چشمہ
کے جاری ہونے کی کوئی علت نہ تھی، باوجود اس کے چشمہ جاری ہوگیا،

اس صورت میں یہ بحث پیدا ہوگی کہ اس بات کا کیونکر اطمینان ہوسکتا ہی کہ واقع میں اس
واقعہ کا کوئی سبب موجود نہ تھا، اور خصوصاً اشاعرہ کے موافق تو یہ احتمال نہایت قوی ہوجاتا
ہے، اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ جن اور شیاطین ہر قسم کی خرقِ عادات پر قادر ہیں،
اس کے ساتھ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جن اور شیاطین، انسان کے بدن میں

---

[۱] یہاں تک امام رازی کی اصلی عبارت کا لفظی ترجمہ تھا،

پر حجت ہو سکتا ہے جو اُس وقت موجود تھے، آیندہ نسلوں کو اُس کا علم صرف روایت کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی روایتوں کو قطعی اور یقینی کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہی روایت میں سب سے بڑا درجہ تواتر کا ہی یعنی جو خبر متواتر ہوتی ہے اُس کو یقینی کہا جاتا ہی لیکن کیا تمام متواترات یقینی ہیں؟ یہود بہ تواتر بیان کرتے ہیں کہ توراۃ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی، یہود اور نصاریٰ دونوں متفق اللفظ ہیں اور بتواتر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ مصلوب ہوئے، پارسی زردشت کے معجزات کو بتواتر بیان کرتے ہیں، غرض ہر فرقہ اپنے مذہب کے متعلق بہت سے واقعات کو بتواتر بیان کرتا ہے، لیکن کیا ان واقعات کو ہم یقینی سمجھتے ہیں؟ شاید یہ کہا جائے کہ روایت کی صحت کے لئے اسلام شرط ہے، جس کے یہ معنی ہوئے کہ صرف مسلمانوں کا تواتر مفید یقین ہے لیکن اس یک طرفہ فیصلہ کو مخالف کیونکر تسلیم کر سکتا ہے؟

یہ تمام بحثیں تو معجزہ کے امکان اور وقوع سے متعلق تھیں، اب فرض کرو کہ معجزہ ممکن بھی ہے، واقع بھی ہوتا ہے، تواتر سے اس کا ثبوت بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ مرحلہ اب بھی باقی ہے کہ اس سے نبوت پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے مثلاً ایک شخص کہتا ہی کہ میں ہندسہ داں ہوں، اور اُس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں بیس دن تک متصل بھوکا رہ سکتا ہوں، تو گو وہ بیس دن تک بھوکا رہے، اور گو یہ کتنا ہی خرقِ عادت واقعہ ہو لیکن اس سے اس کا ہندسہ داں ہونا کیونکر ثابت ہو گا؟ اسی طرح ایک شخص کہتا ہی کہ میں پیغمبر ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ سعادتِ دارین کا رہنما ہے، اسکی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ وہ لاٹھی کو سانپ

معجزہ سے نبوت پر استدلال

اگر مان لیا جائے کہ فی نفسہٖ جادوگر سے عظیم الشان خرقِ عادات سرزد ہو سکتے ہیں، تو کون تسلیم کریگا کہ دعوے نبوت کی حالت میں، اُس کی یہ قدرت جاتی رہے گی، عبد اللہ ابن المقنع اور زردشت نے بڑے بڑے خرقِ عادات دکھائے، اور نبوت کا دعویٰ بھی کیا،

ان امور کے علاوہ، شعبدہ جات، نیرنگ جات اور مسمریزم وغیرہ سے نہایت عجیب و غریب امور سرزد ہوتے ہیں، اسلیئے یہ کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے کہ جس چیز کو معجزہ کہا جاتا ہے اس میں ان چیزوں کا شائبہ نہ تھا،

غرض معجزہ کے متعلق یہ احتمال ہر وقت موجود ہے کہ مخفی اسباب کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا ہو اسلیئے معجزہ کا معجزہ ہونا نہایت مشکل ہے،

ان اعتراض سے بھی قطعِ نظر کرلی جائے تو عدمِ معارضہ کی شرط کیونکر ثابت ہو سکتی ہے یعنی یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اس معجزہ کا جواب نہیں ہو سکتا، جواب نہ ہو سکنے سے اگر یہ مراد ہے کہ معجزہ کے اظہار کے وقت سے اس کا جواب کسی سے نہ ہو سکا تو عبد اللہ بن المقنع اور زردشت وغیرہ کو بھی پیغمبر ماننا پڑیگا، کیونکہ جو خارقِ عادت باتیں ان سے ظہور میں آئیں اس زمانہ میں کوئی شخص اُن کا جواب نہ لا سکا، اور اگر یہ مراد ہے کہ قیامت تک کوئی شخص اس کا معارضہ نہ کر سکے تو یہ پیشین گوئی کیونکر کی جا سکتی ہے کہ قیامت تک اس کا جواب نہ ہو سکے گا، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں اُن کے معجزہ کا جواب نہ ہو سکا لیکن یہ کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قیامت تک اس کا جواب نہ ہو سکے گا،

ان سب امور کو مان بھی لیا جائے تو یہ بحث باقی رہے گی کہ معجزہ صرف ان لوگوں

اس بات کے ثابت کرنے کے بعد ثابت کرنا چاہئے کہ جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ پیغمبر ہوتا ہے، اشاعرہ نے اس پر اس طرح استدلال کیا ہے، کہ مثلاً اگر کوئی بادشاہ اپنا قاصد کسی شخص کے پاس بھیجے اور اس کے پاس، بادشاہ کی کچھ نشانیاں ہوں تو قطعاً یقین ہو جائیگا کہ وہ بادشاہ کا قاصد ہے، اسی طرح معجزہ خدا کی نشانی ہے، اسلئے جس کے پاس یہ نشانی ہوگی وہ خدا کا قاصد اور پیغمبر ہوگا،

لیکن پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ ہم کو اس بات کا علم کیونکر ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں شخص کی نشانی ہے، اس کا یا یہ طریقہ ہے کہ خود اس شخص نے کسی موقع پر ظاہر کیا ہو کہ جب میں کسی قاصد کو بھیجونگا تو اس کے پاس یہ نشانی ہوگی، یا خود قاصد کے بیان پر اعتماد کیا جائے یا یہ کہ بار بار کے تجربہ سے ثابت ہو چکا ہو کہ اس شخص کے پاس سے جب جب قاصد آیا ہے تو اس کے پاس اس قسم کی کوئی نشانی ضرور تھی، پہلا احتمال تو صریح البطلان ہے کیونکہ خود خدا نے کسی موقع پر تمام لوگوں سے یہ نہیں کہا کہ فلاں شخص میرا رسول ہے دوسری صورت اس لئے ممکن نہیں کہ پیغمبر ہی خود مبحوث فیہ ہے، اب صرف تیسرا احتمال رہ گیا، وہ اگر مفید بھی ہو تو صرف انبیاے متاخرین کے لئے ہوگا سب سے پہلے جو پیغمبر آیا ہوگا، اس کا معجزہ لوگوں پر کیونکر حجت ہوگا،

یہ تمام اعتراضات، اس بنا پر تھے کہ پیغمبری کی شناخت کا ذریعہ معجزہ کو قرار دیا گیا تھا، اس پہلو سے قطع نظر کرکے نبوت پر جو عام اعتراضات کئے گئے ہیں وہ آگے آتے ہیں،

بنا دیتا ہے تو گو وہ ایسا کرتا ہو، اور گو یہ کتنا ہی عجیب امر ہو لیکن اس سے اسکی پیغمبری کیونکر
ثابت ہوگی، ؟ دلیل کو دعویٰ کے ساتھ کیا ربط ہے ؟

اعتراض کی یہ تقریر امام رازی کی تقریر کے مطابق تھی، لیکن ابن رشد نے اس اعتراض
کو زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے "معجزہ سے
جب نبوت پر استدلال کیا جاتا ہے تو مقدماتِ دلیل یہ ہوتے ہیں۔

نبی سے معجزہ صادر ہوتا ہے، جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ نبی ہوتا ہے۔

ان مقدمات کا ثابت ہونا امورِ ذیل کے ثابت ہونے پر موقوف ہے۔

(۱) معجزہ ممکن الوقوع ہے اور واقع ہوتا ہے،

(۲) مدعیِ نبوت سے معجزہ صادر ہوا،

(۳) نبوت اور پیغمبری کا وجود ہے،

(۴) جس سے معجزہ صادر ہوتا ہے وہ نبی ہوتا ہے،

سب سے پہلے یہ متعین کرنا چاہئے کہ پیغمبری کی حقیقت اور جنس وفصل کیا ہے، یہ ظاہر ہے
کہ پیغمبری کی ماہیت میں معجزہ داخل نہیں ہے، بلکہ جو لوگ معجزہ کے قائل ہیں وہ بھی معجزہ
کو پیغمبری کی علامت قرار دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ علامت عین حقیقت نہیں ہوتی، پیغمبری کی
حقیقت اشاعرہ وغیرہ نے یہ بیان کی ہے کہ جو شخص خدا کا بھیجا ہوا ہو وہ پیغمبر ہے،

اب یہ ثابت کرنا چاہئے کہ رسالت کا وجود ہے یعنی خدا اپنے احکام کے پہنچانے
کے لئے لوگوں کو بھیجا بھی کرتا ہے، کیونکہ ایک گروہ کثیر سرے سے رسالت ہی کا منکر ہے،

یہودیوں، پارسیوں، غرض تمام مذاہب کے طریقہ نماز سے حاصل ہوسکتا ہے، کسی ایک طریقہ کی تخصیص کرنی، اور باقی تمام طریقوں کو غلط قرار دینا اور اسکی بنا پر قتل وخون کو جائز رکھنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے، تمام اور مذہبی اعمال کا بھی یہی حال ہو کہ جو مقصد اصلی ہو وہ سب میں مشترک ہے اور جو غیر مشترک ہے وہ مقصد اصلی نہیں،

(۳) مذہب کا اصلی مقصد، خدا کا اعتقاد، اعمالِ حسنہ کی پابندی اور اعمالِ قبیحہ سے احتراز ہے، جس شخص میں یہ باتیں پائی جائیں ضرور ہے کہ وہ نجات کا مستحق ہو، لیکن انبیا ان باتوں کے ساتھ اپنی نبوت کے اقرار کو بھی جزو ایمان قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص انکو پیغمبر تسلیم نہ کرے وہ باوجود توحید اور اعمالِ حسنہ کے ناجی نہ ہوگا، یہ امر صریح خلافِ عقل ہے،

(۴) دنیا میں جس قدر مذاہب موجود ہیں سب میں قابلِ اعتراض باتیں پائی جاتی ہیں یہود خدا کو مجسّم مانتے ہیں اور تمام وہ اوصاف ثابت کرتے ہیں جو معمولی آدمیوں میں پائے جاتے ہیں، عیسائی خدا کی اُبوّت، اور حلول و اتحاد کے قائل ہیں، پارسیوں کے ہاں دو خدا ہیں، قرآن مجید میں جبر و قدر کے متعلق نہایت کثرت سے متناقض اور متعارض آیتیں ہیں،

تنبیہ امام رازی نے اس اعتراض کو مطالب عالیہ میں ان الفاظ سے ادا کیا ہے،

اِنَّ الْقُرْاٰنَ مَمْلُوٌّ مِنَ الْجَبْرِ وَالْقَدْرِ وَالْاٰیَاتُ الْوَارِدَۃُ فِیْھَا اَکْثَرُ مِنْ عَدَدِ الرِّمَالِ وَالْحَصٰی وَلَاشَکَّ اَنَّھَا مُتَنَاقِضَۃٌ وَاِنَّ التَّوْفِیْقَ بَیْنَھَا لَا یَحْصُلُ اِلَّا بِتَعَسُّفٍ شَدِیْدٍ فَھٰذَا یَدُلُّ عَلٰی اَنَّ صَاحِبَ ھٰذَا الْکِتَابِ کَانَ مُضْطَرِبَ الرَّاْیِ فِی الْجَبْرِ وَالْقَدْرِ غَیْرَ جَازِمٍ بِاَحَدِ الطَّرَفَیْنِ،

عام اعتراضات

(۱) نبوت کا مقصد، اعتقادات، اور اصلاحِ معاش و معاد کی تعلیم ہے، لیکن ان امور کے لئے خود عقل کی رہنمائی کافی ہے، خدا کے ہاں سے کسی شخص کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں، بہت سے حکمائے جن پر نہ وحی آتی تھی، نہ ان کو الہام ہوتا تھا، ان مسائل کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ انبیا، اس سے زیادہ نہ کر سکے، اسلئے رسول و پیغمبر کی کیا ضرورت ہے؟

(۲) انبیا کی شریعتیں منسوخ ہوا کرتی ہیں یعنی ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کی شریعت کو منسوخ کر دیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہوے وہ مہاتِ امور اور مقاصدِ اصلیہ تھے، یا فرعی اور زائد باتیں تھیں، پہلا احتمال تو ممکن نہیں، کیونکہ مہاتِ امور تمام مذاہب میں مشترک ہیں، اور ان کو منسوخ کرنا خود مذہب کو باطل کرنا ہے، اس لئے صرف دوسرا احتمال رہ گیا، لیکن جب کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی شریعت کے قبول کروانے پر اس قدر اہتمام اور اصرار کرتا ہے کہ جو لوگ، اس کو تسلیم نہیں کرتے انکو گمراہ، مرتد اور مقابل جہنم ٹھہراتا ہے، یہاں تک کہ لڑائیاں برپا ہوتی ہیں اور نہایت سخت خونریزیوں تک نوبت پہنچتی ہے، اس بنا پر کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص مبعوث من اللہ ہوگا، وہ فرعی باتوں کے لئے اس قسم کے شقاق اور برہمیوں کو جائز رکھے گا"

مثلاً نماز کا اصلی مقصد، صرف تضرع اور خشوع الی اللہ ہے، یہ مقصد عیسائیوں،

(۲) کیا وہ نبوت کی حقیقت میں داخل ہے؟

(۳) کیا اس سے نبوت پر استدلال ہوسکتا ہے؟

(۴) نبوت کی اصلی حقیقت کیا ہے؟

کیا خرق عادت ممکن ہے؟

پہلا مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس قدر حقائقِ اشیاء سے ناآشنا ہوتا ہے اسی نسبت سے علل واسباب کے سلسلہ پر اُسکی نظر کم پڑتی ہے اور وہ ہر چیز کو براہِ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے، ایک دہقان کا بچہ برسات کے زمانہ میں جب بادلوں کو آتا دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ "اللہ میاں آئے" یعنی بادلوں کا آنا خود خدا کا آنا ہے، اس حالت سے جب ترقی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "اللہ میاں کے حکم سے پانی برسا" اب اُس نے خدا میں اور پانی میں بادل کو واسطہ قرار دیا، اس درجہ کے بعد یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ بادل براہِ راست خدا کے حکم سے پیدا ہوگئے، یا خدا نے ان کو بھی کسی اور علت کے ذریعہ سے پیدا کیا، ٹھیٹھ مذہبی آدمی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بادل اور خدا میں کوئی درمیانی علت نہیں ہے، خدا حکم دیتا ہے بادل آپ سے آپ پیدا ہوجاتے ہیں اور برستے ہیں، یا یہ کہ آسمان پر بہت بڑا دریا ہے وہاں سے پانی گرتا ہے اور بادل کی شکل بنجاتا ہے، چنانچہ قدماے مفسرین اسی بات کے قائل تھے، امام رازی نے اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً کی تفسیر میں اُن کے اقوال نقل کئے ہیں، لیکن صاحبِ نظر اور آگے قدم بڑھاتا ہے، اور کہتا ہے کہ "زمین یا سمندر سے بخارات اُٹھتے ہیں، وہ اوپر جاکر سردی کی وجہ سے پانی کے قطرے بنجاتے ہیں" غرض جسقدر حقیقت طلبی اور غور رسی بڑھتی جاتی ہے، علل واسباب کا سلسلہ وسیع ہوتا جاتا ہے یہانتک کہ بالآخر اس

خرق عادت کا خیال انسان کو کیونکر پیدا ہوتا ہے

اخیر کا فقرہ نہایت سخت ہے، اور اسی وجہ سے ہم اس عبارت کے ترجمہ کی جرأت نہ کرسکے، اس کے نقل کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بزرگانِ سلف نے نہایت بے تعصبی کے ساتھ معترضوں کے ہر قسم کے اعتراض کو سنا اور اُنکو اپنی تصنیفات میں درج کرکے اُن کے جواب دیئے بخلاف اس کے آج ہمارے علما یہ تلقین کرتے ہیں کہ دشمن کو آتا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلینی چاہئیں،

نبوت اور خرقِ عادت

کی

اصلی حقیقت

جو اعتراضات اوپر مذکور ہوئے اُن کا اجمالی جواب، امام رازی نے مطالبِ عالیہ میں، اور تفصیلی قاضی عضد نے مواقف میں دیا ہے، لیکن جواب ایسے ہیں جو اعتراضات کو اور زیادہ قوی کردیتے ہیں، اور چونکہ علم کلام کی تاریخ میں ہم نے ان کا ذکر بھی کیا ہے، اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی کچھ ضرورت نہیں،

اب ہم ان مباحث کو ائمۂ فن کی رائے کے موافق لکھتے ہیں جس سے معترضین کے اعتراضات خود بخود رفع ہو جائیں گے اور ان مسائل کی اصلی حقیقت ظاہر ہو جائیگی،

یہ بحث درحقیقت مسائلِ ذیل پر مبنی ہے،

(۱) کیا خرقِ عادت ممکن اور ممکن الوقوع ہے؟

اس کے بعد امام صاحب نے اس مسئلہ کے متعلق تین قول نقل کیے ہیں،

(۱) اشاعرہ کے نزدیک ہر قسم کے خرقِ عادات عموماً ممکن ہیں یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہی کہ ایک جزء لایتجزیٰ دفعتہً عالم اور عاقل بنجائے یا یہ کہ ایک اندھا جو اندلس میں بیٹھا ہوا ہے چین کے کسی گاؤں کو دیکھ لے،

(۲) حکمائے طبعیین کے نزدیک بالکل ناممکن ہے،

(۳) معتزلہ کے نزدیک بعض مخصوص صورتوں کے سوا ناممکن ہے،

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو اختلافات ہیں وہ دراصل نزاعِ لفظی ہی، اشاعرہ کے سوا کوئی اس بات کا قائل نہیں کہ معلول کا وجود بغیر علت کے ہوسکتا ہی، اور جو شخص اس کا قائل نہیں وہ خرقِ عادت کا بھی قائل نہیں ہوسکتا، اختلاف اسطرح پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی واقعہ عادتِ جاریہ کے خلاف وقوع میں آتا ہے، توعام لوگ اس کو خرقِ عادت سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خرقِ عادت ممکن ہی ورنہ اُس کا وقوع کیونکر ہوتا، حالانکہ وہ واقعہ اسباب ہی کی وجہ سے وقوع میں آتا ہے گو وہ اسباب غیر معمولی ہوتے ہیں، امام صاحب نے مطالبِ عالیہ میں خرقِ عادت کے امکان کو اس طرح ثابت کیا ہے، کہ ممکن ہے کوئی غیر معمولی حرکتِ فلکی پیدا ہو اور اس سے کوئی غیر معمولی امر وقوع میں آے لیکن امام صاحب نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس حالت میں وہ امر خرقِ عادت نہیں ہے کیونکہ اُسکی علت حرکتِ فلکی موجود ہے، امام صاحب کے اس استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ جس شے کو جو خلافِ عادت وقوع میں آئے، خرقِ عادت کہتے ہیں گو اسکے لئے

خرقِ عادت کے متعلق لوگوں میں جو اختلاف ہے وہ نزاعِ لفظی ہے،

بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علّت و معلول، سبب و مسبب، شرط و مشروط، موثر اور موثر کے سلسلہ کے بغیر نہیں ہوتا، اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرت، سنۃ اللہ اور خلق اللہ ہے اور قرآن مجید کی ان آیتوں میں اسی کی طرف اشارہ ہے،

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ	خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں،
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ	پس ہرگز تم خدا کی عادت میں تبدیلی نہ پاؤگے
تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (فاطر)	اور تم خدا کی عادت میں تغیر نہ پاؤگے،

اسلامی فرقوں میں سے صرف **اشاعرہ** اس سلسلہ کے منکر ہیں، اُن کے نزدیک کوئی شے کسی کی علت نہیں نہ اشیا میں خواص و تاثیر ہے، چنانچہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الرد علی المنطق میں جہاں اشاعرہ کے وہ مسائل گنائے ہیں جنمیں وہ متفرد ہیں، اُن میں اس مسئلہ کو بھی شمار کیا ہے، صرف اشاعرہ سلسلہ اسباب کے منکر ہیں،

اشاعرہ کے سوا رباقی تمام فرقے بلکہ تمام دنیا، اس سلسلہ کی معترف ہے اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ خرقِ عادت کے غیر ممکن ہونے پر بجز اشاعرہ کے اور سب کا اتفاق ہوتا، لیکن باینہمہ بظاہر اختلاف ہے، امام رازی، تفسیر کبیر، سورۂ اعراف، حضرت موسیٰ کے عصا کے معجزہ کے ذکر میں لکھتے ہیں،

اِعْلَمْ اَنَّ الْقَوْلَ بِتَجْوِيْزِ انْقِلَابِ	جاننا چاہئے کہ انقلابِ عادت کا قائل ہونا
الْعَادَاتِ عَنْ مَجَارِيْهَا صَعْبٌ مُشْكِلٌ	صعب و مشکل ہے اور اربابِ عقل اسمیں
وَالْعُقَلَاءُ اِضْطَرَبُوْا فِيْهِ،	مضطرب ہیں،

سب کے اسباب طبعی ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے اُنکا ظہور ہوتا ہے، بوعلی سینا نے ان اسباب طبعی کو تفصیل سے بیان کیا ہی، مثلاً امساکِ طعام کی نسبت لکھا ہے کہ معدہ جب مواد ردیہ کے ہضم کرنے میں مصروف ہوتا ہی تو صحیح غذا پر کم عمل کرتا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کئی کئی دن تک انسان کو بھوک نہیں لگتی، کیونکہ بدل ما یتحلل کی ضرورت نہیں پڑتی، اس بنا پر ممکن ہی کہ کسی صاحب حال کو خدا کے تصور میں اس قدر استغراق اور محویت ہو کہ طبیعت غذا کے ہضم کی طرف نہ مائل ہو، اس حالت میں مدت تک وہی غذا قائم رہے گی اور بدل ما یتحلل کی ضرورت نہ پڑے گی، یہی وجہ ہوتی ہے کہ خوف کی حالت میں بھوک بالکل جاتی رہتی ہے۔"

بوعلی سینا نے گو ان تمام خرقِ عادات کے وجوہ اور اسباب بیان کئے تاہم ان کا نام خرقِ عادت ہی رکھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو چیز عام عادت کے خلاف ہوتی ہی وہ خرقِ عادت سے تعبیر کیجاتی ہی، گو واقع میں وہ اصُولِ قدرت کے خلاف نہیں ہوتی، شاہ ولی اللہ صاحب نے تو صاف صاف اس کا فیصلہ کر دیا ہی، چنانچہ تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں،

اِنَّمَا الْمُعْجِزَاتُ وَالْکَرَامَاتُ اُمُوْرٌ	یعنی معجزات و کرامات امور اسبابی ہیں لیکن
اَسْبَابِیَّۃٌ غَلَبَ عَلَیْہِ السَّبَبُ	اُن پر کمال غالب ہو گیا ہی اور اس وجہ سے
فَبَایَنَتْ سَائِرَ الْاَسْبَابِیَاتِ	اور اسبابی اُمور سے ممتاز ہیں،

غرض کلّی طور پر اس مسئلہ میں اشاعرہ کے سوا باقی تمام اسلامی فرقے متفق ہیں کہ کوئی چیز اصول قدرت کے خلاف وجود میں نہیں آسکتی، اس لئے جب کوئی فرقہ یا کوئی شخص (اشاعرہ کے سوا) کسی خرقِ عادت کا قائل ہو تو اُس کی مراد صرف یہ ہو گی کہ وہ واقعہ یا عام عادت

کوئی غیر معمولی علت موجود ہو،

خرقِ عادات کے متعلق اشاعرہ میں اختلاف رائے

اشاعرہ میں بھی اس مسئلہ کے متعلق اختلاف رائے ہے، عام اشاعرہ ہر قسم کے خرقِ عادت کے قائل تھے اور ہر شخص سے اس کا صادر ہونا تسلیم کرتے تھے، اُن کے نزدیک جس قسم کے خرقِ عادات پیغمبر سے صادر ہوتے ہیں، اسی قسم کے اولیا بلکہ کافر زندیق، جادوگر وغیرہ سب سے صادر ہو سکتے ہیں، صرف یہ فرق ہے کہ ان کا نام بدل جاتا ہو یعنی کافر وغیرہ سے جو سرزد ہو، اس کو سحر اور استدراج کہتے ہیں، اور انبیاؑ سے جو سرزد ہو اس کا نام اعجاز ہو، لیکن جس قدر غور و فکر سے زیادہ کام لیا گیا یہ وسعت گھٹتی گئی، علامہ ابو اسحٰق اسفرائینی جو بہت بڑے پایہ کے شخص تھے اور اشعری طریقہ رکھتے تھے، ان کا قول ہو کہ

اِنَّ الْکَرَامَۃَ لَا تَبْلُغُ مَبْلَغَ خَرْقِ الْعَادَۃِ کرامت خرقِ عادت کی حد تک نہیں پہنچتی،

ابو القاسم قشیری جو اشاعرہ میں بہت بڑے صوفی گذرے ہیں، ان کا قول ہے کہ بہت سی چیزیں گو مقدوراتِ الٰہی کے لحاظ سے ممکن ہیں لیکن یہ قطعاً معلوم ہے کہ وہ کسی ولی سے سرزد نہیں ہو سکتیں[1]،

بوعلی سینا کی رائے

بوعلی سینا نے اشارات کے اخیر میں ایک باب باندھا ہو جس میں خرقِ عادات پر بحث کی ہے، اس میں لکھا ہے کہ "اگر تم سے کوئی شخص کہے کہ کسی درویش نے مدت تک کھانا نہیں کھایا، یا کوئی ایسا کام کیا جو اُسکی قوت سے زیادہ تھا، یا کوئی پیشین گوئی کی، یا اُسکی بددعا کی وجہ سے کوئی شخص زمین میں دھنس گیا، یا زلزلہ آگیا، یا درندہ مسخر ہو گیا وغیرہ وغیرہ تو تم اس سے انکار نہ کرو، کیونکہ ان

[1] یہ دونوں قول ابن السبکی نے طبقات جلد اوّل میں نقل کیے ہیں، علامہ موصوف نے ایک نہایت مفصل مضمون خرقِ عادات کے جواز پر لکھا ہو،

ایک شخص نے بیان کیا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ فلاں صوفی آگ میں گھس گئے اور آگ نے ان پر کچھ اثر نہیں کیا، اس واقعہ پر عام لوگ فوراً اعتبار کرلیں گے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ واقعہ ممکن ہے، اور ابن خلکان میں مذکور ہے، لیکن ایک محقق شخص اس بات پر غور کریگا کہ یہ واقعہ جس قدر ممکن ہے اس سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ ابن خلکان نے غلطی کی ہو یا راوی اوّل نے دھوکا کھایا ہو، یا بیچ کے رُوات سے غلطی ہوئی ہو، یا قصداً اُن میں سے کسی نے جھوٹ کہا ہو، البتہ جس درجہ کا یہ واقعہ مستبعد اور نادرالوقوع ہے، اُسی نسبت سے اگر اس کے ثبوت کی شہادت قوی اور مضبوط ہو گی تو واقعہ کا یقین ہو سکے گا، اور یہ قرار دیا جائیگا کہ کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہوں گے جن کی وجہ سے ان کے بدن پر آگ کا اثر نہ ہوا ہو گا،

اشاعرہ کی یہ سترگربگی حقیقت میں نہایت تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ وہ جب کسی خرقِ عادت کے ثبوت کا دعوی کرتے ہیں تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ واقعہ ممکن ہے اور امکان کو اس قدر وسعت دیتے ہیں کہ ہر قسم کے مستبعدات گو وہ ازل سے آجتک کبھی وقوع میں نہ آئے ہوں، اس میں شامل ہو جاتے ہیں، لیکن دوسری طرف یہ خیال نہیں کرتے کہ واقعہ کے لئے جس قسم کا امکان وہ ثابت کرتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ راویوں کا غلطی کرنا ممکن ہے، اس لئے صرف امکان پر مدار ہو گا تو ایک شخص وہ پہلو کیوں نہ اختیار کریگا جو زیادہ ممکن بلکہ قریب الوقوع ہے،

بہر حال خرقِ عادت (بمعنی عام) سے کسی کو انکار نہیں، جو کچھ بحث ہے، وہ

جاریہ کے خلاف وقوع میں آیا ہو نہ یہ کہ وہ حقیقت خلافِ اصولِ قدرت ہی،

اختلاف جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ خرقِ عادات کے ثبوت کے متعلق پیدا ہوتا ہی، واقعات کے یقین کرنے کے اصول کے متعلق لوگوں میں نہایت اختلاف ہے محققین کے نزدیک واقعات پر یقین کرنے کے متعلق یہ اصول ہیں،

واقعات پر یقین کرنے کے کیا اصول ہیں

(۱) جو واقعہ جس قدر زیادہ معمولِ عام کے موافق ہوگا اسی قدر اسکے وقوع کا یقین زیادہ ہوگا، اور جو واقعہ جس قدر خلافِ عادت اور خلافِ معمول ہوگا اسی قدر اس پر یقین کرنے کے لئے زیادہ کدوکاوش کی ضرورت ہوگی، فرض کرو کہ ایک شخص نہایت سچا ہے، اور اس نے یہ روایت کی کہ فلاں شہر میں پانی برسا تو فوراً یقین آجائیگا، لیکن وہی شخص اگر پانی کے بجائے خون کا برسنا بیان کرے تو یقین کی حالت بدل جائیگی اور واقعہ کے ثبوت کیلئے زیادہ قوی شہادت درکار ہوگی، غرض واقعہ کی حیثیت سے شہادت کی حیثیت بدلتی جاتی ہی،

(۲) کسی واقعہ کا صرف ممکن ہونا واقعہ پر یقین کرنے کے لئے کافی نہیں،

(۳) جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اس کے خلاف کا ممکن ہونا، اس بات کی وجہ نہیں ہوتا کہ ہم کو اُن واقعات کے یقین میں شبہہ پیدا ہو جائے،

(۴) جس واقعہ کی نسبت اثبات و نفی کا کوئی پہلو یقینی نہیں ہوتا، اُسکی نسبت بھی ہم خالی الذہن نہیں رہتے بلکہ دونوں پہلوؤں میں سے جو زیادہ قریب الیقین ہوتا ہی ہم اس پر اعتبار کرتے ہیں،

عام لوگ، ان اصول کو ملحوظ نہیں رکھتے، اور یہی اختلاف کا سبب ہوتا ہی، مثلاً

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۰) درمیان تو نہر نہ چلائے۔

اسلام جو اس لئے آیا تھا کہ مذہبی اُصول کے متعلق آج تک جو غلط خوش اعتقادیاں چلی آتی تھیں اور جو مسامحہ اپنے حال پر رہنے دے گئی تھیں اُن کو قطعاً رفع کر دیا جائے، جو اس لئے آیا تھا کہ قیامت تک ہر قسم کی ترقی اور اصلاح سے مذہب کو مستغنی کر دے، اس کا یہ کام تھا کہ جس طرح اُس نے توحید کو مکمل کیا تھا، نبوت کی اصلی حقیقت بھی کھول کر دکھا دے اس لئے سب سے پہلے اُس نے نہایت صفائی، نہایت آزادی، نہایت وضاحت سے اس بات کو ظاہر کیا کہ جو چیزیں بشریت سے بالاتر ہیں وہ پیغمبر میں نہیں ہوتیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام۔ ۵)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اس حکم پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف۔ ۲۳)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدو کہ میرا ذاتی نفع و نقصان بھی میرے اختیار میں نہیں، ہاں جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے، اور اگر میں غیب کی بات جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو گزند نہ پہنچتا، میں تو خوشخبری دینے والا اور خوف دلانے والا ہوں ان

واقعات میں ہے، جو خرقِ عادت جس درجہ مستبعد ہو اسی نسبت سے اگر اُس کے ثبوت کی شہادت قوی ہوگی تو اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں،

دوسری بحث، دنیا میں ہمیشہ یہ خیال رہا ہے اور آج بھی من حیث الاغلب تمام آدمیوں میں پایا جاتا ہے کہ انبیاء اور اولیا میں ضرور کوئی امر مافوق العادۃ ہوتا ہے، اس خیال کا زور یہاں تک پہنچا کہ انبیا میں شانِ ایزدی تسلیم کی گئی، ہندؤوں نے رام اور کرشن اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا پیکر جسمانی مانا، زمانہ کی امتداد اور عقل کی ترقی نے اس رتبہ کو گھٹا کر کم کیا تو خرقِ عادت کے درجہ پر آکر ٹھہرا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور اپنی نبوت کا اظہار کیا تو جو لوگ خرقِ عادت کو لازمہ نبوت سمجھتے تھے، اُنھوں نے نہایت تعجب سے کہا،

خرقِ عادت نبوت کا لازمہ ہے، یا نہیں؟

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (یونس)	اس پر خدا کے ہاں سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اترا؟
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (رعد)	کافر کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں سے اُن پر کوئی معجزہ کیوں نہیں اُترا؟
وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الانبیا)	اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے پاس کوئی معجزہ اپنے خدا کے ہاں سے کیوں نہیں لاتا،

بعضوں نے کہا معجزہ نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ امتیاز تو ضرور ہے،

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	اور کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائینگے جب تک تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ نکال دے یا خود تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو جسکے

چڑھ جاؤ، پھر ان سب کے جواب میں خدا نے کہا،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا	کہدو کہ سبحان اللہ میں تو صرف آدمی
بَشَرًا رَّسُوْلًا،	ہوں، اور پیغمبر ہوں،

اصل نکتہ جو اس موقع پر لحاظ کے قابل ہے یہ ہے کہ کفار جن باتوں کو طلب کرتے تھے، وہ ناممکن اور محال نہ تھیں، تاہم خدا نے اُن کے اظہار سے اعراض کیا جس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو یہ باتیں خدا کے اختیار میں ہیں لیکن نبوت کے ثبوت میں انکو پیش کرنا اسی قدیم غلطی میں لوگوں کو مبتلا رکھنا ہے، ورنہ خرق عادات کے پیش کرنے سے انکار اس بنا پر نہ تھا کہ خدا اُن پر قادر نہیں، ایک آیت میں خدا خود فرماتا ہے

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ	اور کفار کہتے ہیں کہ محمدؐ پر خدا کے ہاں سے
مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى	کوئی معجزہ کیوں نہ اُترا، کہدے کہ
اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے
لَا يَعْلَمُوْنَ (انعام)	لیکن یہ لوگ جاہل ہیں،

امام رازی سورۂ عنکبوت آیت وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

وَلَيْسَ مِنْ شَرْطِ الرِّسَالَةِ	پیغمبر کے لئے معجزہ شرط نہیں
الْاٰيَةُ الْمُعْجِزَةُ	ہے،

پھر تھوڑی دور کے بعد لکھتے ہیں،

وَلِهٰذَا اُعْلِمَ وُجُوْدُ رُسُلٍ وَكَثُرَتْ	اسی وجہ سے ایسے انبیا بھی گذرے ہیں مثلاً

یہ مسئلہ اگرچہ نہایت دقیق، نازک، اور معتقداتِ عوام کے بالکل خلاف تھا، لیکن شارع نے اس اہتمام سے اسکی تلقین کی کہ قرونِ اولی تک اس کے متعلق کسی شخص کو غلط فہمی نہیں ہوئی

اسکے بعد اُس عالمگیر اور ازلی غلطی کو رفع کیا کہ نبوت اور معجزہ میں تلازم ہے،

منکرین جو معجزات طلب کرتے تھے، اور نبوت کو معجزہ پر موقوف سمجھتے تھے، اُن کے جواب مختلف طریقہ سے دیئے لیکن ہر جگہ اس حقیقت کو ظاہر کیا کہ نبوت معجزہ پر موقوف نہیں،

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ	اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی (معجزہ) خدا
عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ	کے ہاں سے کیوں نہیں اتری، اے محمد! تو صرف ڈرانیوالا ہے
مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد - ۱)	اور ہر قوم کے لئے ایک ڈرانیوالا ہوتا ہے،
وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ	اور کافر کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی خدا کے ہاں
عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ	سے کیوں نہیں اتری، اے محمد! کہدو کہ خدا جسکو
يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (رعد - ۴)	چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور انکو ہدایت دیتا ہے جو اُسکی طرف رجوع کرتے ہیں
وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن	اور کافر کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے ہاں سے معجزے
رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ	کیوں نہیں آئے، کہدو معجزے تو خدا کے پاس ہوتے
وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (عنكبوت - ۵)	ہیں اور میں تو صرف ڈرانے والا ہوں،

سورہ بنی اسرائیل میں بیان کیا، کہ منکرین کہتے ہیں کہ "ہم تو تم پر جب ایمان لائیں جب تم زمین سے کوئی چشمہ نکال دو، یا کھجور اور انگور کا باغ تیار کردو، یا آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو، یا خدا اور فرشتوں کو سامنے لاکر کھڑا کردو، یا سونے کا مکان تیار کردو، یا آسمان پر

وَهٰذِهِ الدَّلَالَةُ لَيْسَتْ دَلَالَةً عَقْلِيَّةً مَحْضَةً بَلْ وَهِيَ دَلَالَةٌ عَادِيَّةٌ كَمَا اَشَارَ اِلَيْهِ بِقَوْلِهٖ وَهِيَ عِنْدَنَا اَيِ الْاَشَاعِرَةِ اِجْرَاءُ اللّٰهِ عَادَتَهٗ بِخَلْقِ الْعِلْمِ بِالصِّدْقِ عَقِيْبَهٗ

اور یہ دلالت محض عقلی نہیں ہو، بلکہ وہ دلالت عادیہ ہو جیسا کہ صاحب مواقف نے اپنے ان لفظوں میں اشارہ کیا ہو کہ "یہ دلالت ہمارے نزدیک (اشاعرہ) اس بنا پر ہو کہ خدا کی عادت یہ ہو کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو صاحب معجزہ کی سچائی کا علم خدا لوگوں کے[1]

مواقف بحث اثبات نبوت

یہ دعویٰ بھی کلی طور پر نہیں کیا جا سکتا، ورنہ بداہت کی تکذیب لازم آئے گی علانیہ ثابت ہے کہ انبیا کے معجزات کے ظہور کے وقت ہزاروں آدمی ایمان نہیں لاتے تھے، بلکہ نہ ایمان لانے والوں کی تعداد ہمیشہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہوتی تھی، اسی بنا پر ائمہ فن اور محققین نے تصریح کی ہے، کہ معجزہ نبوت کے یقین کے لئے کافی نہیں،

امام غزالی منقذ من الضلال بحث نبوت میں لکھتے ہیں،

فَمِنْ ذٰلِكَ الطَّرِيْقِ فَاطْلُبِ الْيَقِيْنَ بِالنُّبُوَّةِ لَا مِنْ قَلْبِ الْعَصَا ثُعْبَانًا وَشَقِّ الْقَمَرِ،

تو اس طریقہ سے نبوت کا یقین طلب کرو نہ اس بات سے کہ لاٹھی اژدہا بن گئی یا چاند پھٹ گیا،

راغب اصفہانی لکھتے ہیں،

وَذٰلِكَ يَطْلُبُهٗ اَحَدُ رَجُلَيْنِ

اور معجزہ دو قسم کے آدمی طلب کرتے

[1] کتاب الذریعہ صفحہ ۱۰۰،

وَاِدْرِیْسَ وَشُعَیْبَ وَلَمْ تَعْلَمْ لَهُمْ مُعْجِزَةٌ، | حضرت شیثؑ وادریسؑ وشعیبؑ جنکے پاس کسی معجزہ کا ہونا معلوم نہیں،

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں،

فَلَیْسَتِ الْمُعْجِزَاتُ وَلَا اسْتِجَابَةُ الدَّعَوَاتِ وَنَحْوُ ذَالِكَ اِلَّا اُمُوْرًا خَارِجَةً عَنْ اَصْلِ النُّبُوَّةِ لَازِمَةً فِی الْاَكْثَرِ، | معجزات اور اجابتِ دعا اور اس قسم کی اور باتیں اصل نبوت سے خارج ہیں لیکن اکثر حالات میں نبوت کے ساتھ لازم ہیں،

امام غزالی نے منقذ من الضلال میں نبوت کا ایک مستقل عنوان قائم کیا ہی، اُس میں نبوت کی حقیقت لکھ کر لکھتے ہیں کہ نبوت کا یقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور ارشادات سے ہوتا ہے، اُس کے بعد لکھتے ہیں،

فَمِنْ ذَالِكَ الطَّرِیْقِ فَاطْلُبِ الْیَقِیْنَ بِالنُّبُوَّةِ لَا مِنْ قَلْبِ الْعَصَا ثُعْبَانًا وَشَقِّ الْقَمَرِ، | تو اس طریقہ سے نبوت پر یقین لاؤ، نہ اس سے کہ لاٹھی سانپ بن گئی اور چاند پھٹ گیا،

تیسری بحث، معجزہ کا دلیلِ نبوت ہونا صرف اشاعرہ ظاہریین کا مذہب ہے اور وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ معجزہ، نبوت کی عقلی دلیل ہی، بلکہ ان کا یہ مذہب ہے کہ معجزہ کے صادر ہونے کے وقت لوگوں کو عادۃً یقین ہو جاتا ہی، نہ عقلاً،

شرحِ مواقف میں ہی،

والقول الثاني ان نقول انا نعرف	دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے
اولاً ان الحق والصدق في الاعتقادات	کہ صحیح عقائد اور اعمال خیر کیا ہیں، اس
ما هو وان الصواب في الاعمال	امر کے محقق ہو جانے کے بعد جب یہ
ما هو فاذا عرفنا ذالك ثم رأينا	دیکھا جائے کہ ایک شخص لوگوں کو دین
انسانا يدعو الخلق الى الدين	حق کی دعوت دیتا ہے، اور یہ بھی نظر
الحق ورأينا ان لقوله اثرا قويا	آئے کہ اس کی بات لوگوں کو باطل سے
في صرف الخلق من الباطل الى الحق	حق کی طرف لانے میں نہایت قوی اثر
عرفنا انه نبي صادق واجب	رکھتی ہے تو ہمکو یقین ہو جائیگا کہ وہ سچا
الاتباع وهذا الطريق اقرب	پیغمبر ہے اور واجب الاتباع ہے اور یہ طریقہ
الى العقل والشبهات فيه اقل	عقل سے زیادہ قریب ہے، اور اس پر

[illegible]

نبوت کی ایک دوسری تشریح

امام رازی اس دوسرے طریقہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں،

اس کے بعد امام صاحب نے اس دوسرے طریقہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے،

پھر ایک عنوان باندھا ہے، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید سے بھی یہی طریقہ افضل ثابت ہوتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

اس طریقہ کا ثبوت قرآن مجید سے

الفصل الثاني في بيان ان القرآن	دوسری فصل اس بات کے ثابت کرنے
العظيم يدل على ان هذا الطريق	میں کہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہوتا ہے
هو الطريق الاكمل الافضل	کہ نبوت کے ثابت کرنے میں یہی طریقہ
في اثبات النبوة،	زیادہ کامل اور افضل ہے،

اَمَّا نَاقِصٌ عَنِ الْفَرْقِ بَیْنَ الْکَلَامِ	ہیں یا وہ جو کلام الٰہی اور کلام انسانی
الْاِلٰھِیِّ وَبَیْنَ الْبَشَرِیِّ وَاَمَّا نَاقِصٌ	میں تمیز نہیں کر سکتا، یا وہ جو اس کے
وَھُوَ مَعَ نَقْصِہٖ مُعَانِدٌ،	ساتھ ہٹ دھرم بھی ہے،

نبوّت کی حقیقت

(مسئلہ چہارم)

نبوت کی حقیقت اور اُس کے اُصول اور شرائط، اشاعرہ نے جو کچھ بیان کئے وہ اوپر گذر چکے، امام غزالی اور رازی وغیرہ نے ان مسائل کی تشریح عام تصنیفات میں اشاعرہ ہی کے مذاق کے موافق کی لیکن مخصوص تصنیفات میں اپنی خاص تحقیقات بیان کیں، اور یہ بھی تصریح کر دی کہ اشاعرہ کا طریقہ ناکافی اور پُر از مشکلات ہے، امام رازی مطالب عالیہ میں لکھتے ہیں،

اِعْلَمْ اَنَّ الْقَائِلَ بِالنُّبُوَّۃِ فَرِیْقَانِ	نبوت کے قائل دو فریق ہیں،
اَحَدُھُمَا الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ اَنَّ	ایک فریق کہتا ہے کہ معجزات کا
ظُھُوْرَ الْمُعْجِزَاتِ عَلٰی یَدِہٖ یَدُلُّ	ظاہر ہونا نبی کے سچے ہونے کی دلیل
عَلٰی صِدْقِہٖ وَھٰذَا الْقَوْلُ ھُوَ	ہے، اور یہ مذہب قدیم طریقہ ہے،
الطَّرِیْقُ الْاَوَّلُ وَعَلَیْہِ مُتَّفِقٌ عَامَّۃُ	اور دنیا کے عام اہل مذاہب اسکے
اَرْبَابِ الْمِلَلِ وَالنِّحَلِ،	قائل ہیں،

پر غور کرے، اور اس بات کا فیصلہ کرے، اس قوت کا کمال یہ ہے کہ حقائق اشیار کا صحیح علم ہو یعنی جو شے ذہن میں آئے ٹھیک اُس صورت میں آئے جو اُسکی اصلی اور حقیقی صورت ہے عملی کے یہ معنی کہ کون سے افعال عمل کرنے کے قابل ہیں؟ اور کون سے نہیں، اس کا کمال یہ ہے کہ انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جس سے خود بخود اچھے افعال سرزد ہوں،

(۲) ان دونوں قوتوں کے لحاظ سے افراد انسانی کی تین قسمیں ہیں،

۱۔ وہ لوگ جو ان اوصاف میں ناقص ہیں،

۲۔ خود کامل ہیں لیکن ناقصوں کی تکمیل نہیں کر سکتے،

۳۔ خود کامل ہیں اور ناقصوں کو کامل بنا سکتے ہیں،

(۳) نقصان و کمال کے درجے نہایت متفاوت ہیں، نقصان کا درجہ اس حد تک پہنچتا ہے کہ انسان اور جانور میں صرف صورت کا فرق رہجاتا ہے، اسی طرح کمال کا درجہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچتا ہے کہ انسان فرشتہ بنجاتا ہے، ان دونوں درجوں کے بیچ میں ہزاروں درجے ہیں، یہانتک کہ اگر ہزاروں لاکھوں افراد انسانی کے حالات کا موازنہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ ہر شخص، دوسرے شخص سے کچھ نہ کچھ ان اوصاف میں متفاوت ہے،

چونکہ نقصان و کمال دونوں کی انتہائی حدیں ہیں، اس لئے ضرور ہے کہ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی شخص ایسا پایا جائے جو انتہائے کمال کے درجہ تک پہنچا ہو، اب جس شخص میں یہ دونوں قوتیں کامل درجہ پر پائی جائیں، اور دوسروں کو بھی کمال کے درجہ تک پہنچا سکتا ہو،

پھر اس طریقہ کی نسبت لکھتے ہیں،

اَلْفَصْلُ الْخَامِسُ فِیْ بَیَانِ	پانچویں فصل اس بات کے بیان
اَنَّ اِثْبَاتَ النُّبُوَّۃِ بِھٰذَا	میں کہ نبوت کا اس طریقہ سے ثابت کرنا
الطَّرِیْقِ اَقْوٰی وَاَکْمَلُ مِنْ	زیادہ قوی اور کامل ہی بہ نسبت اسکے
اِثْبَاتِھَا بِالْمُعْجِزَاتِ،	کہ وہ معجزے سے ثابت کی جائے،

تفسیر کبیر میں اس آیت کی تفسیر میں یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْکُمْ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (یونس) نہایت اختصار کے ساتھ اس دوسرے طریقہ کو بیان کیا ہی اور لکھا ہی کہ نبوت کے ثابت کرنے کا یہ طریقہ اشرف و اعلیٰ و اکمل و افضل ہی،

امام رازی کے سوا، امام غزالی، ابن حزم، ابن رشد، شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی نبوت کی حقیقت و ماہیت کی توضیح و تشریح نہایت خوبی سے کی ہی، ہم ان سب کی تقریروں کو نقل کرتے ہیں، جس سے نبوت کی پوری تصویر ذہن میں آجائیگی اور یہ ظاہر ہوگا کہ متداول کتب کلامیہ میں جو کچھ لکھا ہی صرف اشاعرہ ظاہریین کا قول ہی، امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت کی حقیقت نہایت تفصیل سے بیان کی ہے، ہم نے مطالب عالیہ کا یہ حصہ بعینہٖ کتاب کے ضمیمہ میں شامل کردیا ہے، اس موقع پر ہم صرف خلاصہ لکھتے ہیں،

امام صاحب نے نبوت کی حقیقت بتانے سے پہلے چند مقدمات قائم کئے ہیں، وہ یہ ہیں،

(۱) انسان کا اصلی کمال حقائق اشیاء اور خیر و شر کا ادراک ہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہی کہ انسان کو دو قسم کی قوتیں دی گئی ہیں، نظری۔ عملی، نظری کا یہ کام ہے کہ اشیاء کے حقائق

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک نبوت کی حقیقت

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں نبوت کی حقیقت زیادہ نکتہ سنجی اور حقیقت شناسی کے ساتھ لکھی ہے، چنانچہ ہم اُن کے مضمون کو اپنے الفاظ اور اپنے پیرایہ میں ادا کرتے ہیں، لیکن ہم نے اپنی طرف سے کوئی بات اضافہ نہیں کی ہی،

"اس امر کے سمجھنے کے لیے کہ انسان کا مکلف ہونا اور شرائع و ادیان کا قائم ہونا سب فطری امور ہیں، سلسلۂ کائنات پر غور کرنا چاہیئے،

سب سے پہلے نباتات پر غور کرو، درختوں کو دیکھو، اُن کے ہزاروں لاکھوں اقسام ہیں، لیکن ہر ایک کی شاخیں، پتے، پھول پھل، پھلوں کی بو باس، رنگ، ذائقہ سب مختلف ہی، یہ اختلافات، اُن کی صورتِ نوعیہ کے نتائج ہیں یعنی ہر درخت کے جتنے خصوصیات ہیں خود اس کی صورتِ نوعیہ نے پیدا کی ہیں، اِس بنا پر مثلاً یہ سوال کرنا کہ انگور شیریں، لطیف، باریک پوست کیوں پیدا کیا گیا، ایک لغو سوال ہے، کیونکہ یہ سوال کرنا گویا یہ کہنا ہی کہ انگور انگور کیوں ہوا، انگور کی فطرت خود اس کی مقتضی ہے کہ وہ شیریں ہو، لطیف ہو، باریک پوست ہو،

اب حیوانات کو لو، نباتات کی طرح ان میں سے ہر ایک کی شکل، صورت، رنگ، جدا ہے، لیکن ان میں نباتات سے بڑھ کر کچھ اور چیزیں بھی ہیں، یعنی اختیاری حرکات اور فطری الہامات، ہر جانور کو خاص خاص الہامی علوم عنایت ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے بنی نوع سے ممتاز ہے، اور جو اُس کی تمام ضروریات و خصوصیاتِ زندگی کے کفیل ہیں، اُن کی تربیت و پرورش کے لئے اُن کی فطرت کے لحاظ سے الگ الگ سامان مہیا ہیں، نباتات چونکہ حساس اور متحرک بالارادہ نہیں ہیں، اسلئے اُن میں رگ و ریشے پیدا کیے گئے ہیں جو پانی

وہی نبی اور پیغمبر[1] ہے،

امام صاحب یہ ثابت کر کے کہ نبوت صرف قوتِ نظری و عملی کے کمال کا نام ہے، اور معجزہ وغیرہ کو اس میں کچھ دخل نہیں، لکھتے ہیں،

وَمِنْ جُمْلَةِ الْاٰیَاتِ الدَّالَّةِ عَلٰی صِحَّةِ مَا ذَکَرْنَاہُ اَنَّہٗ تَعَالٰی لَمَّا حَکٰی عَنِ الْکُفَّارِ اَنَّھُمْ طَلَبُوْا مِنْہُ الْمُعْجِزَاتِ لِمَا ھٰھُنَا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا ثُمَّ اِنَّہٗ تَعَالٰی قَالَ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یَعْنِیْ کَوْنُ الشَّخْصِ اِنْسَانًا مَوْصُوْفًا بِالرِّسَالَۃِ مَعْنَاہُ کَوْنُہٗ کَامِلًا فِیْ قُوَّتِہِ النَّظَرِیَّۃِ وَالْعَمَلِیَّۃِ وَقَادِرًا عَلٰی مُعَالَجَۃِ النَّاقِصِیْنَ فِیْ ھَاتَیْنِ الْقُوَّتَیْنِ وَلَیْسَ یَلْزَمُ مِنْ حُصُوْلِ ھٰذِہِ الصِّفَۃِ کَوْنُہٗ قَادِرًا عَلَی الْاَحْوَالِ الَّتِیْ طَلَبْتُمُوْھَا مِنْہُ،

اور منجملہ ان باتوں کے جن سے ہمارے دعوے مذکور کی صحت ثابت ہوتی ہے، یہ ہے کہ خدا نے کافروں کا یہ قول نقل کیا کہ "اے محمد ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم زمین میں سے ہمارے لئے چشمہ نکال دو وغیرہ وغیرہ"، تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ "اے محمد کہدو کہ سبحان اللہ میں تو صرف آدمی اور پیغمبر ہوں"، یعنی کسی آدمی کا پیغمبر ہونا صرف اس پر موقوف ہے، کہ وہ قوتِ نظری و عملی میں کامل ہو، اور ناقصوں کو کامل کرسکتا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان باتوں پر بھی قادر ہو جو تم طلب کرتے ہو (یعنی معجزات)

[1] یہ مطالب عالیہ کی تقریر کا خلاصہ ہے، امام صاحب نے تفسیر کبیر آیت قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ (سورۂ ابراہیم) کی تفسیر میں اسی تقریر کو زیادہ اختصار کے ساتھ درج کیا ہے، یہ امام غزالی سے ماخوذ ہے، اس تقریر کی امام صاحب نے نہایت تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ فَھٰذِہٖ اَسْرَارٌ عَالِیَۃٌ مَخْزُوْنَۃٌ فِیْ اَلْفَاظِ الْقُرْاٰنِ،

اور جس کو قوتِ ملکیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی قوت کا اثر ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کے مخلوقات کو دیکھ کر یہ غور کرتا ہے کہ یہ تمام کارخانہ کیونکر قائم ہوگیا، خود مجھ کو کس نے پیدا کیا؟ کون مجھکو روزی دیتا ہے؟ ان سوالات کے جواب میں وہ ایک قوتِ اعظم کا قائل ہوتا ہے اور اسکے سامنے سرِ عجز خم کرتا ہے اور خضوع و خشوع کے تمام آداب بجالاتا ہے، اگرچہ تمام مخلوقات شجر و حجر، چاند سورج، ستارے، زمین، آسمان، سب اس مدبر اعظم کے معترف ہیں اور اُسکے آگے سر بہ نیاز ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ	کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین میں جو
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ	چیزیں ہیں اور آفتاب ماہتاب ستارے درخت پہاڑ
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ (حج)	اور چارپائے سب خدا کے آگے سجدہ کرتے ہیں

لیکن فرق یہ ہے کہ اور مخلوقات کا اعتراف اور خضوع زبانِ حال سے ہے اور انسان کو حال کے ساتھ زبانِ قال بھی عطا کی گئی ہے، حاسۂ انفعال بھی اسی روحانی قوت کا اثر ہے یعنی جب انسان کوئی اچھا یا بُرا کام کرتا ہے تو اس کا اثر اُس کے دل پر قائم رہتا ہے، اگر وہ اچھا کام تھا تو اُس کے دل میں انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور اگر بُرا تھا تو انقباض ہوتا ہے، (جانوروں میں یہ حاسہ بالکل نہیں ہے)

غرض اِس روحانی ادراک کے اقتضا سے سلسلہ بہ سلسلہ بہت سے اصول، قواعد، عقائد، اعمال قائم ہوجاتے ہیں، لیکن چونکہ یہ قوت تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتی اور چونکہ انسان کا کمالِ روحانی اس پر موقوف ہے کہ روحانی حیثیت سے نیکی بدی اور بُرائی بھلائی

ہوا اور مٹی کے لطیف اجزا کو چوستے ہیں، اور تمام شاخ و برگ میں تقسیم کرتے ہیں، حیوان
چونکہ حساس اور متحرک بالارادہ پیدا کیا گیا تھا، اسلئے اسکو اس قسم کا فطری ادراک دیا گیا
جس سے وہ خود چل پھر کر اپنی تمام ضروریات زندگی مہیا کرسکتا ہے، پھر ہر ایک کے کھانے
پینے، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، چارپائے گھانس چرتے ہیں، درندہ گوشت کھاتا ہے،
پرند اُڑتے ہیں، مچھلی تیرتی ہے، یہ تمام اختلافات بھی انکے مختلف صور نوعیہ کے نتائج ہیں، اور
یہی صورت نوعیہ ہر ایک کو اس قسم کے خاص ادراکات، خاص علوم، خاص الہامات
عطا کرتی ہے، جو اُسکی ضروریات کے مناسب ہیں، لیکن حیوانات کے جس قدر علوم و
ادراکات ہیں سب فطری اور الہامی ہیں، یعنی ان کو کسب اور اکتساب سے واسطہ
نہیں بلکہ وہ علوم اور ادراکات اُن کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اور یہ سب سے بڑی
خصوصیت ہی، جو حیوان کو انسان سے جدا کرتی ہی. انسان کو طبعی اور فطری ادراکات او
علوم کے علاوہ (جنمیں وہ اور دیگر تمام حیوانات برابر کے شریک ہیں) ایک دوسری قسم کا ادراک
بھی دیا گیا ہی، جس کو اکتسابی اور نظری کہتے ہیں، اور جو تجربہ، غور و فکر اور ترتیب مقدمات سے
حاصل ہوتا ہے، یہی اکتسابی ادراک یا الہام ہی، جس کے ذریعہ سے انسان تجارت، صنعت،
حرفت اور ہر قسم کے علوم و فنون حاصل کرتا ہے، یہی قوت ہی، جو مختلف پیرایوں میں ظاہر ہوکر
کسی کو بادشاہ، کسی کو سپہ سالار، کسی کو حکیم، کسی کو صنعت گر بناتی ہی،

لیکن یہ تمام علوم و ادراکات وہ ہیں جو انسان کے جسمانی حالات سے تعلق رکھتے
ہیں، ان کے سوا انسان کو ایک اور قسم کا ادراک دیا گیا ہی، جو اسکی روحانیت کا خاصہ ہی،

کی ہے، چونکہ اس کا بعینہ یہاں نقل کرنا موقع اور مقام کے لحاظ سے موزوں نہ تھا، ہم نے اس کو کتاب کے ضمیمہ میں شامل کر دیا ہی، اس موقع پر جو کچھ امام صاحب نے کتاب المنقذ اور احیاء العلوم میں لکھا ہے اُس کا خلاصہ لکھتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

انسان اصل خلقت کے لحاظ سے جاہل پیدا کیا گیا ہی، پیدا ہونے کے وقت وہ اقسام موجودات میں سے کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا، سب سے پہلے اُس میں لمس کا احساس پیدا ہوتا ہی جس کے ذریعہ سے وہ ان چیزوں کو محسوس کرتا ہے جو چھونے سے تعلق رکھتی ہیں،

مثلاً حرارت، برودت، رطوبت، یبوست، نرمی، سختی، اِس حاسہ کو مرئیات اور مسموعات سے تعلق نہیں، جو شے محض سننے سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کے حق میں یہ حاسہ بالکل معدوم ہے، لمس کے بعد پھر انسان میں دیکھنے کا حاسہ پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ رنگ اور مقدار کا ادراک کر سکتا ہے، پھر سننے کی قوت پیدا ہوتی ہے، پھر چکھنے کی یہاں تک کہ محسوسات کی حد ختم ہو جاتی ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اب اُس کو تمیز دیجاتی ہے اور اُن چیزوں کا ادراک کر سکتا ہے، جو حواس کے دسترس سے باہر ہیں، یہ دور ساتویں برس سے شروع ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر **عقل** کا زمانہ آتا ہی جس سے انسان کو ممکن، محال، جائز ناجائز کا ادراک ہوتا ہے، اس سے بڑھکر ایک اور درجہ ہی جو عقل کی سرحد سے بھی آگے ہے، اور جس طرح تمیز و عقل کی مدرکات کے لیے حواس بالکل بیکار ہیں، اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لیے عقل بے کار ہے، اور اسی درجہ کا نام **نبوت** ہے،

بعض عقلا اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن یہ اسی قسم کا انکار ہے جس طرح وہ شخص عقلی چیزوں

کا ایک مکمل قانون تیار ہو جائے، اس لئے خدا مدتوں میں ایک شخص پیدا کرتا ہی جو وحی الٰہی کے اتقار کے قابل ہوتا ہے، یہ شخص خدا کا خاص منظور نظر ہوتا ہے، اسی سے تعلیم پاتا ہی اسی کے دامن تربیت میں پلتا ہی اس کو شریعت عطا ہوتی ہے، اور تمام لوگوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسکے امر و نہی کو بجا لائیں، لیکن یہ جو کچھ ہوتا ہے سب انسان کی فطرت اور صورت نوعیہ کا اقتضا ہے[1]

فَاِنْ قِيْلَ مِنْ اَيْنَ وَجَبَ عَلَى الْاِنْسَانِ	اگر کوئی کہے کہ انسان پر نماز پڑھنا،
اَنْ يُّصَلِّيَ وَمِنْ اَيْنَ وَجَبَ عَلَيْهِ	اور پیغمبر کی اطاعت کرنا اور زنا و سرقہ
اَنْ يَّنْقَادَ لِلرَّسُوْلِ وَمِنْ اَيْنَ	سے بچنا کیوں واجب ہوا، تو جواب یہ
حُرِّمَ عَلَيْهِ الزِّنَاءُ وَالسَّرِقَةُ	ہے کہ اسی طرح جس طرح چرندوں
فَالْجَوَابُ وَجَبَ عَلَيْهِ ھٰذَا وَحُرِّمَ	پر یہ واجب ہی کہ گھانس چریں، اور
عَلَيْهِ ذٰلِكَ مِنْ حَيْثُ وَجَبَ عَلَى	اور گوشت نہ کھائیں، اور جس طرح
الْبَهَائِمِ اَنْ تَرْعَى الْحَشِيْشَ وَحُرِّمَ	شہد کی مکھیوں پر واجب ہی کہ مکھیوں
عَلَيْهَا اَكْلُ اللَّحْمِ وَمِنْ حَيْثُ وَجَبَ	کا جو سردار ہے اسکی اطاعت کریں، فرق
عَلَى النَّحْلِ اَنْ تَتَّبِعَ الْيَعْسُوْبَ اِلَّا	یہ ہے کہ حیوانات کو یہ علوم محض الہام سے
اَنَّ الْحَيْوَانَ اسْتَوْجَبَ تَلَقِّيَ عُلُوْمِهَا	حاصل ہوتے ہیں، اور انسان کو کسب و
اِلْهَامًا جِبِلِّيًّا وَاسْتَوْجَبَ الْاِنْسَانُ	نظر اور وحی و تقلید سے لیکن دونوں

نبوت کے متعلق امام غزالی کی رائے

امام غزالی نے نبوت کی حقیقت سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ معارج القدس میں بیان

---

[1] یعنی اس امر و نہی کی بجا آوری انسان کی فطرت اور صورت نوعیہ کا اقتضا ہے۔ "س س ن"

وَمِمَّا بَانَ لِیْ بِالضَّرُوْرَۃِ مِنْ مُمَارَسَۃِ طَرِیْقَتِہِمْ حَقِیْقَۃُ النُّبُوَّۃِ وَخَاصِیَّتُہَا،

صوفیوں کے طریقہ کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت اور اسکی خاصیت بدیہی طور پر معلوم ہو گئی،

نبوت کے ثبوت کا ایک اور طریقہ

امام صاحب نے ایک اور طریقہ سے **نبوت** کی حقیقت بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ عموماً مسلّم ہے کہ صفاتِ انسانی تمام آدمیوں میں یکساں نہیں پیدا کی گئیں، ذہن و ذکاوت، فہم و فراست، عقل و ذہانت، مختلف افرادِ انسانی میں کس قدر مختلف المراتب ہیں، ایک شخص ذہین ہے، دوسرا اس سے ذہین، تیسرا اس سے بھی زیادہ ذہین، بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ ایک شخص سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر قدرتِ انسانی کی حد سے باہر نظر آتے ہیں، جو لوگ شاعری میں، قوتِ تقریر میں، صناعی میں، ایجاد میں تمام زمانہ سے ممتاز گذرے، وہ اسی درجہ کی مثالیں ہیں، یہ درجہ فطری ہوتا ہے یعنی پڑھنے اور سیکھنے سے نہیں حاصل ہوتا، بلکہ ابتدا ہی سے ان لوگوں میں یہ قوت مرکوز ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے دوسرے اشخاص گو کتنی ہی کوشش کریں، انکے ہم پلہ نہیں ہو سکتے، انہی قوائے میں حقائقِ اشیا کے ادراک کی ایک قوت ہے، یہ قوت کسی میں کم ہے اور کسی میں زیادہ، کسی میں زیادہ تر ہوتی ہے، اور ترقی کرتے کرتے بعض انسانوں میں اس حد تک پہنچی ہے کہ کسب و تعلّم کے بغیر ان کو حقائقِ اشیا کا ادراک ہوتا ہے، ان کو کسی چیز کا بیرونی علم نہیں ہوتا، لیکن اس قوت کی وجہ سے خود بخود ان کو اشیا کا علم ہوتا جاتا ہے، اسی قوت کا نام ملکۂ نبوت ہے، اور اسی علم کو الہام اور وحی کہتے ہیں،

کا انکار کرتا ہے جس کو ہنوز عقل کی قوت عطا نہیں کی گئی ہو،

منقذ من الضلال میں لکھتے ہیں،

بَلِ الْاِیْمَانُ بِالنُّبُوَّۃِ اَنْ یُّقِرَّ	نبوت کے تسلیم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ تسلیم کیا
بِاِثْبَاتِ طَوْرٍ وَرَاءَ الْعَقْلِ تَنْفَتِحُ	جائے کہ ایک درجہ ہے جو عقل سے بالاتر ہے
فِیْهِ عَیْنٌ یُدْرِکُ بِهَا مُدْرِکَاتٌ	جہیں وہ آنکھ کھل جاتی ہے جس سے وہ چیزیں
خَاصَّةٌ وَالْعَقْلُ مَعْزُوْلٌ عَنْهَا	معلوم ہوتی ہیں، جن سے عقل بالکل محروم
کَعَزْلِ السَّمْعِ عَنْ اِدْرَاکِ الْاَلْوَانِ	ہے، جس سے سامعہ رنگ کے ادراک
(الخ)	سے بالکل معذور ہے،

اس بنا پر نبوت کا اصلی اذعان صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا رتبہ حاصل ہے، یا ان لوگوں کو جو نفوس قدسیہ رکھتے ہیں یا جنھوں نے ریاضات اور مجاہدات سے مکاشفات اور مشاہدات کا درجہ حاصل کیا ہو، امام غزالی منقذ من الضلال میں اپنی حالت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں،

وَبِالْجُمْلَةِ فَمَنْ لَمْ یُرْزَقْ مِنْهُ	مختصر یہ کہ جس نے تصوف کا کچھ مزا نہیں چکھا
شَیْئًا بِالذَّوْقِ فَلَیْسَ یُدْرِکُ	ہے وہ نبوت کی حقیقت نہیں جان سکتا،
مِنْ حَقِیْقَةِ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْاِسْمَ،	بجز اس کے کہ نبوت کا نام جان لے،

اس کے بعد لکھتے ہیں،

۱؎ منقذ من الضلال ص ۳۱،

امام شافعی کے فقیہ ہونے کا ہم کو کیوں یقین ہے؟ اس لئے کہ فقہ میں اُن کی نہایت عمدہ تصنیفات موجود ہیں، اسی طرح جب ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں، اور یہ دیکھتے ہیں کہ نبوت کے جو آثار ہیں اُسکے ہر ہر لفظ سے نمایاں ہیں تو صاف یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا حامل بجز پیغمبر کے اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا۔[1]

نبوت کے متعلق محدث ابن حزم کی رائے،

محدث ابن حزم نے نبوت کی یہ حقیقت بیان کی ہو کہ بغیر تعلم و تعلیم کے علم حاصل ہو چنانچہ لکھتے ہیں۔[2]

فصح ان النبوة فی الامکان وهی	تو یہ بات ثابت ہوئی کہ نبوت ممکن ہو
بعثة قوم قد خصهم الله تعالی	اور نبوت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایک گروہ
بالفضیلة لا لعلة الا انه شاء	کو مبعوث کرتا ہو اور انکو فضیلت کے
ذالك فعلمهم الله العلم بدون	ساتھ مخصوص کر دیتا ہو، نہ کسی علت
تعلم ولا تنقل فی مراتبه ولا	کی وجہ سے بلکہ صرف اپنی مرضی کی وجہ سے،
طلب له ومن هذا الباب	خدا انکو علم سکھلاتا ہو بغیر سیکھنے کے اور
ما یراه احدنا فی الرؤیا	بغیر درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور بغیر طلب کے،
فیخرج صحیحا،	اور یہ اسی طرح کی بات ہو جس طرح ہم لوگ

[illegible]

محدث موصوف نے اس کا امکان اس طرح ثابت کیا ہو کہ دنیا میں جس قدر علم و فن صنعت و حرفت وغیرہ ایجاد ہوئے، موجد اول کو ان کا علم آپ سے آپ بغیر تعلیم و تعلم

[1] منقذ من الضلال از صفحہ ۲۴ تا ۲۶ [2] ملل و نحل ابن حزم ۱۲

امام صاحب نے یہ مضمون[1] احیاء العلوم کے شروع میں ایک ضمنی بحث میں لکھا ہے

جس کا عنوان یہ ہے، بَیَانُ تَفَاوُتِ النَّاسِ فِی الْعَقْلِ چنانچہ اس کے بعض فقرے یہ ہیں،

وَکَیْفَ یُنْکَرُ تَفَاوُتُ الْغَرِیْزَۃِ وَلَوْلَا لَمَا اخْتَلَفَ النَّاسُ فِیْ فَهْمِ الْعُلُوْمِ وَ لَمَا انْقَسَمُوْا اِلٰی بَلِیْدٍ لَا یَفْهَمُ بِالتَّفْهِیْمِ اِلَّا بَعْدَ تَعَبٍ طَوِیْلٍ مِنَ الْمُعَلِّمِ وَ اِلٰی ذَکِیٍّ یَفْهَمُ بِاَدْنٰی رَمْزٍ وَ اِشَارَۃٍ وَ اِلٰی کَامِلٍ یَنْبَعِثُ مِنْ نَفْسِهٖ حَقَائِقُ الْاُمُوْرِ دُوْنَ التَّعَلُّمِ کَمَا قَالَ تَعَالٰی یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ وَ ذٰلِکَ مِثْلُ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ اِذْ یَتَّضِحُ لَهُمْ فِیْ بَوَاطِنِهِمْ اُمُوْرٌ غَامِضَةٌ مِنْ غَیْرِ تَعَلُّمٍ وَ سَمَاعٍ وَ یُعَبَّرُ ذٰلِکَ بِالْاِلْهَامِ وَ عَنْ

نبینا صلی اللہ علیہ وسلم حیث قال ان روح القدس نفث فی روعی ... الخ

... ۱۲

فطرت کے تفاوت کا کیونکر انکار ہو سکتا ہے، یہ تفاوت نہ ہوتا تو علوم کے سمجھنے میں اختلاف مراتب کیوں ہوتا، اور یہ بات کیوں ہوتی کہ بعض آدمی ایسے کودن ہوتے ہیں جو استاد کے سمجھانے پر بھی مشکل سے سمجھتے ہیں، اور بعض ایسے ذہین ہوتے ہیں کہ ذرا سے اشارے میں سمجھ جاتے ہیں اور بعض ایسے کامل ہوتے ہیں کہ خود ان کی طبیعت سے حقایق امور پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ خدا نے کہا ہے یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، انبیاء علیہم السلام کا یہی حال ہے، اُن کے دل میں دقیق باتیں خود بخود بغیر سکھانے اور سننے کے روشن اور ظاہر ہو جاتی ہیں،

امام صاحب اس تقریر سے نبوت کا امکان ثابت کر کے لکھتے ہیں کہ اب اگر کسی خاص شخص کی نسبت بحث ہو کہ وہ نبی ہے یا نہیں تو اس کے حالات خود اُس کی شہادت دے سکتے ہیں،

[1] ہم نے اس مضمون کو اپنے طرز بیان میں ادا کیا ہے،

تو یہ کیا بعید ہے کہ خدا بعض افراد کو اس قسم کی قوتِ قدسیہ عطا کرے، کہ اُن پر بغیر تعلم و تعلیم کے اخلاق کے حقائق و اسرار منکشف ہو جائیں،

کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اکثر انبیا رمثلاً حضرت ابراہیمؑ حضرت عیسیٰؑ اور جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم و فنون کی مطلق تعلیم نہ پائی تھی، اور باوجود اس کے صرف ہدایت و تلقین کی تاثیر سے دنیا کی حالت بدل دی، اور فلسفۂ اخلاق کے وہ اصول اور مسائل تعلیم کئے کہ فلاطون اور ارسطو کا خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا تھا،

نبوت کی تصدیق اور نبی کی باتوں کو سچ سمجھنا، خود انسان کی فطرتِ صحیح کا اقتضا ہی ایک شخص جو حق کا تشنہ ہی جس کا وجدان صحیح ہی جو سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہے، جس کے دل میں سچی بات آپ سے آپ اُتر جاتی ہی، وہ جب کسی نبی سے تلقین و ہدایت سنتا ہی تو بیہودہ کج بحثیوں میں نہیں پڑتا بلکہ آپ سے آپ اُس کا دل مان لیتا ہی کہ یہ سچ ہی اور سچائی کے مرکز سے نکلا ہی، مولانا روم نے اسکی یہ تشبیہ دی ہی کہ اگر کسی پیاسے کو پانی دیا جائے تو کیا وہ یہ بحث پیش کریگا کہ پہلے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ یہ پانی ہی، یا اگر ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پینے کے لئے بلائے تو کیا اس کو شک ہوگا کہ یہ میری ماں ہے، اور واقعی دودھ پلانے کے لئے بلا رہی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں،

نبوت کی تصدیق کیونکر ہوتی ہی

تشنہ را چوں بگوئی تو شتاب	در قدح آب ست بستاں زود آب
ہیچ گوید تشنہ کایں دعویٰ است	از برم اے مدعی مہجور شو
یا گواہ و حجتے بنما کہ ایں	جنس آب ست وازاں ماء معین

کے ہوا ہوگا، ورنہ تسلسل لازم آئیگا، اسلئے انبیار کو بھی ایسا علم ہونا ممکن ہے، اور اسی کا نام وحی ہے، چنانچہ محدث موصوف بہت سے صنائع وفنون کے نام لکھ کر لکھتے ہیں،

فَوَجَبَ بِالضَّرُوْرَةِ اَنَّہٗ لَابُدَّ	تو یہ بات ضروری ٹھہری کہ ایک یا ایک
مِنْ اِنْسَانٍ وَاحِدٍ فَاَکْثَرَ عَلَّمَھُمُ	سے زیادہ اس قسم کے انسان پائے جائیں
اللّٰہُ ابْتِدَاءً کُلَّ ھٰذَا دُوْنَ	جن کو خدا نے یہ علوم وصنائع ابتداً
مُعَلِّمٍ لٰکِنْ بِوَحْیٍ حَقَّقَہٗ عِنْدَہٗ	بغیر کسی معلم کے خود اپنی وحی سے سکھلائے
وَھٰذِہٖ صِفَةُ النُّبُوَّةِ، ؎	اور یہی نبوت کی صفت ہے،

ان تمام تقریروں کا حاصل اور قدر مشترک یہ ہے، کہ خدا نے انسان کو جس طرح اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں، جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتیں، اور بعض میں بہ تفاوتِ درجات پائی جاتی ہیں، اسی طرح ایک روحانی قوت عطا کی ہے جس کا نام قوتِ قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے، یہ قوت تزکیۂ نفس اور پاکیزگیٔ اخلاق سے تعلق رکھتی ہے، جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے، اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا سکتا ہے، یہ شخص کسی سے تعلیم وتربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم وتعلم کے اس پر حقائقِ اشیار منکشف ہو جاتے ہیں،

نبوت کی اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، جب یہ بات بداہۃً نظر آتی ہے کہ ایک شخص کچھ پڑھا لکھا نہیں ہوتا، (مثلاً ہومر اور امر القیس) اور باوجود اسکے اس درجہ کا فصیح و بلیغ، شاعر یا خطیب یا صناع یا موجد ہوتا ہے کہ تمام زمانہ میں اسکا جواب نہیں ہوتا

؎ ملل ونحل صہ ۲، مطبوعہ مصر،

بالنبوۃ لان قلب العصا ثعبانا او شق القمر — کہ عصا سانپ ہوگیا یا چاند شق ہوگیا،

معارف فی شرح الصحائف میں جو علم کلام کی مستند کتاب ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت پر دو طریقہ سے استدلال کیا ہے، پہلا وہی قدیم طریقہ یعنی معجزات ہے، دوسرا طریقہ یہ لکھا ہے،

الوجه الثاني في اثبات نبوة محمد صلعم	دوسرا طریقہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت
الاستدلال باخلاقه وافعاله	ثابت کرنے کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال،
واحكامه	اقوال اور احکام سے استدلال کرنا ہے،

پھر اس طریقہ کی نسبت لکھتے ہیں،

وهذا الوجه بالحقيقة تعيين	اور یہ طریقہ درحقیقت نبوت کی
حقيقة النبوة،	حقیقت بتا دیا ہے،

انبیا کی تعلیم و ہدایت کا طریقہ

انبیاء کی تعلیم کے اصول

مذہب کے متعلق بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ انبیاء کے اصول طریقۂ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے، علم کلام کی متداول کتابوں میں اس ضروری نکتہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابن رشد نے کشف الادلہ میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اصول بیان کئے ہیں، ان میں سے ضروری الذکر یہ ہیں،

پہلا اصول

(۱) انبیاء کو اگرچہ عوام و خواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلہ میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے، اس لئے اُن کی طرز تعلیم اور طریقۂ ہدایت میں عوام

یا بہ طفلِ شیر مادر بانگ زد | کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد
طفل گوید؟ مادرا حجت بیار | تا کہ باشیرت بگیرم من قرار
در دلِ ہر امتی کز حق مزہ است | روی و آواز پیمبر معجزہ است
چوں پیمبر از بروں بانگے زند | جانِ امت در دروں سجدہ کند
زانکہ جنس بانگ او اندر جہاں | از کسی نشنیدہ باشد گوش جاں

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں[1] کہ "انبیا کو دو قسم کے معجزے دئے جاتے ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ وہ پاک نسب ہوتے ہیں، اُن کے چہروں پر وہ نور ہوتا ہے جو دلوں کو فریفتہ کر لیتا ہے، ان کے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جو قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں، اُن کی تقریر ایسی ہوتی ہے جس سے سامع کو تشفی ہو جاتی ہے" پھر لکھتے ہیں،

وَهٰذِهِ الْاَحْوَالُ اِذَا حَصَلَتْ لَا يَحْتَاجُ ذُو الْبَصِيْرَةِ مَعَهَا اِلَى مُعْجِزَةٍ وَلَا يَطْلُبُهَا، | اور یہ حالات جب پائے جاتے ہیں تو سمجھدار آدمی کو اور کسی معجزہ کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ کسی معجزہ کا طالب نہیں ہوتا،

امام غزالی نے منقذ من الضلال میں جہاں نبوت پر بحث کی ہے لکھتے ہیں کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایات اور ارشادات پر بار بار غور کریگا اُسکو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یقین ہو جائے گا، پھر لکھتے ہیں،

فَمِنْ ذٰلِكَ الطَّرِيْقِ فَاطْلُبِ الْيَقِيْنَ | تو اس طریقہ سے نبوت پر یقین لاؤ نہ اس سے

[1] الذریعہ مطبوعہ مصر صفحہ ۶۹،

جو علم و عقل پیدا ہوتی ہے، وہ انبیا کے خطاب کا موضوع نہیں،

ومن سیرتھم ان لا یکلموا الناس	اور انبیا کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ
الا علی قدر عقولھم التی خلقوا علیھا	وہ لوگوں سے ان کی خلقی عقل کے موافق خطاب
فالانبیاء لم یخاطبوا الناس الا	کرتے ہیں، اسلئے انبیا نے محض اس فہم اور
علی منھاج ادراکھم الساذج	ادراک کے لحاظ سے خطاب کیا، جو ان
المودع فیھم باصل الخلقۃ	لوگوں کی خلقت میں ودیعت ہے، چنانچہ
فکذالک لم یکلفوا الناس ان	انبیا نے لوگوں کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ
یعرفوا ربھم بالتجلیات والمشاھدات	خدا کو تجلیات، مشاہدات، براہین،
ولا بالبراھین والقیاسات	اور قیاسات کے ذریعہ سے پہچانیں
ولا ان یعرفوہ منزّھا من	نہ ان کو اس بات پر مکلف کیا کہ وہ

(حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۸۳)

تیسرا اصول

(۳) سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ انبیا تہذیبِ اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مسائل اور مباحث اور حقائق سے متعرض نہیں ہوتے، اور اس قسم کے امور کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں، تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق اور انمیں بھی استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں،

ومن سیرتھم ان لا یشتغلوا	اور انبیا کے اصول میں سے ایک یہ بات ہے
بما لا یتعلق بتھذیب النفس	کہ جو امور تہذیب نفس اور سیاست قومی
سیاسۃ الامۃ کبیان اسباب	سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ دخل
حوادث الجو من المطر والکسوف	نہیں دیتے، مثلاً کائنات الجو یعنی بارش،

کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے، البتہ ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہی اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں،

امام رازی نے آیات متشابہات کے ورود کے متعلق سب سے قوی وجہ یہ بیان کی ہی کہ

إِنَّ الْقُرْآنَ كِتَابٌ مُشْتَمِلٌ عَلَى دَعْوَةِ الْخَوَاصِّ وَالْعَوَامِّ بِالْكُلِّيَّةِ وَطَبَائِعُ الْعَوَامِّ تَنْبُو فِي أَكْثَرِ الْأَمْرِ عَنْ إِدْرَاكِ الْحَقَائِقِ فَكَانَ الْأَصْلَحُ أَنْ يُخَاطَبُوا بِأَلْفَاظٍ دَالَّةٍ عَلَى بَعْضِ مَا يُنَاسِبُ مَا يَتَوَهَّمُونَهُ وَيَتَخَيَّلُونَهُ وَيَكُونُ ذَالِكَ مَخْلُوطًا بِمَا يَدُلُّ عَلَى الْحَقِّ

قرآن ایسی کتاب ہی جس سے خاص و عام سب کو حق کی طرف دعوت دی گئی ہی، اور عوام کا یہ حال ہی کہ ان کی طبیعت اکثر امور میں حقائق کے ادراک سے انکار کرتی ہی اسلئے مصلحت یہ تھی کہ ایسے الفاظ کیسا تھ خطاب کیا جائے جو عوام کے خیالات اور تصورات کے ساتھ کچھ مناسبت رکھتے ہوں اور اس میں حقیقت کا بھی کچھ حصہ موجود ہو

(تفسیر کبیر آل عمران آیت هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ)

ابن رشد فصل المقال میں لکھتے ہیں،

وكان الشرع مقصوده الاول العناية بالاكثر من غير اغفال لتنبيه الخواص،

شریعت کا مقصود اولی جمہور عوام کیساتھ اعتنا کرنا ہوتا ہم خواص کی تنبیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کیجاتی،

دوسرا اصول (۲) انبیا لوگوں کی عقل و علم کے لحاظ سے ان سے خطاب کرتے ہیں، لیکن اس علم و عقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد انسانی میں پائی جاتی ہے اکتساب، مجاہدہ، مراقبہ، ممارست کی وجہ سے

چوتھا اصول

(۴) ایک عام اصول جس پر تمام انبیا کا عمل رہا یہ ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں، اسکے اکل و شرب، لباس، مکان، سامانِ آرایش، طریقۂ نکاح، زوجین کے عادات، بیع و شرار، معاصی پر دار و گیر، فصلِ قضایا، غرض اس قسم کے تمام امور پر نظر ڈالتے ہیں، اگر یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسا ان کو ہونا چاہیئے تو پھر کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کرتے بلکہ ترغیب دلاتے ہیں، کہ یہ رسوم و آئین صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں، البتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہو، مثلاً وہ آزار رسانی کا ذریعہ ہوں، یا لذاتِ دنیوی میں انہماک کا باعث ہوں، یا اصولِ احسان کے مخالف ہوں، یا انسان کو دنیاوی اور دینی مصالح سے بے پروا کر دینے والی ہوں تو ان کو بدل دیتے ہیں، وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں، بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں جس کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہو یا ان لوگوں کے حالات میں اُس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جن کو قوم اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے"

شاہ ولی اللہ صاحب یہ اصول نہایت تفصیل[۵] سے بیان کر کے لکھتے ہیں،

ولھذا المعنی اختلف شرائع الانبیاء	اور اسی وجہ سے انبیا کی شریعتیں مختلف
والراسخ فی العلم یعلم ان الشرائع	ہیں، اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ
لم تجیٔ فی النکاح والطلاق والمعاملات	جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق،
والزینۃ واللباس والقضاء	معاملات، آرایش، لباس، قضا، تعزیرات
والحدود والغنیمۃ بما لم یکن	غنیمت میں کوئی ایسی بات نہیں پیش کی،

---

[۵] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۰۹ و ص ۱۱۱،

والهالة وعجائب النبات والحيوانات
ومقادير سير الشمس والقمر
واسباب الحوادث اليومية وقصص
الانبياء والملوك والبلدان و
نحوها انتهوا الا كلمات يسيرة
الفها اسماعهم وقبلها عقولهم
يؤتى بها في التذكير بآلاء الله و
التذكير بايام الله على سبيل
الاستطراد بكلام اجمالي يسامح
في مثله بايراد الاستعارات
والمجازات ولهذا الاصل لما
سألوا النبي عن لمية نقصان القمر
وزيادته اعرض الله تعالى عن
ذالك الى بيان فوائد الشهور
فقال يسئلونك عن الاهلة قل
هي مواقيت للناس والحج وترى
كثيرا من الناس فسد ذوقهم
بسبب الالفة بهذه الفنون وغيرها من الاسباب فحملوا كلام الرسل على غير محمله (حجة الله البالغة صفحہ ۸۸)

گرہن، ہالہ کے پیدا ہونے کے اسباب نباتات
اور حیوانات کے عجائبات، چاند، سورج کی رفتار
کی مقدار، حوادث یومیہ کے اسباب انبیاء،
سلاطین اور ممالک کے قصے وغیرہ وغیرہ
ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے مگر ہاں
کچھ چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے
کان مانوس ہو چکے ہیں اور انکی عقلوں نے ان باتوں کو
قبول کرلیا ہے اور ان باتوں کو بھی وہ لوگ[۵] خدا کی
شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً
بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ
سے کام لیتے ہیں، اور اسی اصول کی
بنا پر جب لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے
چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب پوچھا تو خدا نے
اسکے جواب سے اعراض کیا اور اسکے بجائے مہینوں
کا فائدہ بیان کر دیا، چنانچہ فرمایا و یسئلونک
اور اکثر لوگوں کا مذاق، ان فنون (یعنی
ریاضیات وغیرہ) کے اشتغال کی وجہ سے
خراب ہو گیا ہے تو یہ لوگ انبیا کے کلام کو خلافِ حقیقت محل پر محمول کرتے ہیں،

۵؎ "لوگ" سے یہاں مراد انبیا علیہم السلام ہیں، "س س ن"

شاہ صاحب نے اس موقع پر اس اصول کی اور بہت سی تفریعات بیان کی ہیں ہم نے تطویل کے لحاظ سے قلم انداز کردیں،

اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں،

وعلم ان کثیرا من العادات	جاننا چاہیئے بہت سے مراسم اور علوم
والعلوم الکامنۃ یتفق فیھا العرب	ایسے ہیں جنمیں تمام عرب و عجم اور تمام معتدل
والعجم وجمیع سکان الاقالیم	ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ
المعتدلۃ واھل الامزجۃ	جنمیں اخلاق فاضلہ کے قبول کرنے کی صلاحیت
القابلۃ للاخلاق الفاضلۃ	ہے سب متفق ہوئے ہیں مثلاً مردہ کا غم کرنا
کالحزن لمیتھم واستحباب	اور اس پر رحم کھانا، یا مثلاً حسب و نسب
الرفق بہ وکالفخر بالاحساب	پر فخر کرنا، تو یہ مراسم اور یہ اصول
والانساب فتلک العادات	سب سے زیادہ لحاظ کے قابل
والعلوم احق الاشیاء بالاعتبار	ہیں، ان کے بعد وہ مراسم ہیں جو
ثم بعدھا عادات وعقائد	خاص اسی قوم میں جاری ہیں جن پر وہ

تختص بالمعترض علیھم فیتعجب الیھا الخ رصح ،

مخصوص ہیں اور ان کا عمل درآمد بھی انہی کے ساتھ خاص ہے ،

جھٹا اصول

(۶) کسی چیز سے روکنے یا کسی چیز کے حکم دینے کے ۲ دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ اس چیز کے فوائد و نقصان بیان کئے جائیں، اور یہ بتایا جائے کہ وہ شے مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ امر و نہی کا اصلی سبب، اس کا مفید یا مضر ہونا ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ خود وہ شے بالذات موجب ثواب یا عقاب ہے، جیسا کہ بعض دعاؤں کی نسبت لوگوں کا خیال ہے کہ

لهم به علم او يتزودون فيه اذا كلفوا انهم انما وقع اقامة المعوج وتصحيح السقيم،

جسکو وہ لوگ سرے سے نہ جانتے ہوں یا ایسی میں کچھ قبول کرنے میں انکو پیش پیش ہونا ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی سیدھی کردیگئی اور

(حجۃ اللہ البالغہ [illegible] صفحہ ۱۲۳)

پانچواں اصول

(۵) انبیا پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اسکے دو حصے ہوتے ہیں ایک وہ عقائد و مسائل جو مذہب کے اصول کلیہ ہوتے ہیں، اس حصہ میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں مثلاً خدا کا وجود، توحید ثواب، عقاب، عبادات، شعائر اللہ کی تعظیم، نکاح، وراثت وغیرہ وغیرہ، دوسرے وہ احکام اور سنن، جو خاص خاص انبیا کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جنکی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے، شریعت کا یہ حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے، اور اسکی بنیاد زیادہ تر ان خیالات، عقائد، عادات، معاملات، رسوم، طریق معاشرت اور اصول تمدن پر ہوتی ہے جو پہلے سے اُس قوم میں موجود تھے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں،

فكذالك يعتبر في الشرائع علوم مخزونة في القوم واعتقادات كامنة فيهم وعادات تجاري فيهم ولذالك نزل تحريم لحوم الابل والبانها على بني اسرائيل دون بني اسمٰعيل ولذالك كان الطيب والخبيث في المطاعم مفوضا الى عادات العرب

اسی طرح شریعت میں اُن علوم اور اعتقادات و عادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا اور بنی اسمٰعیل پر حرام نہ ہوا اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محول

(ولہذا [illegible] علینا دون الیہود [illegible])

طرف راغب کرنے کا صرف یہی موثر طریقہ ہے،[1]

مذکورۂ بالا اصول، تمام انبیا میں مشترک ہوتے ہیں لیکن جس نبی کی رسالت عام ہوتی ہے، اور تمام عالم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوتا ہے، اسکی ہدایت اور تلقین میں بعض زائد

---

[1] یہ اصول شاہ ولی اللہ صاحب کی اُس تقریر سے ماخوذ ہے جو اُنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۹۵ میں لکھی ہے، لیکن شاہ صاحب اس اصول کو فلاسفۂ اسلام کیطرف منسوب کرتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں وذهب فلاسفة الاسلام الی ان العذاب والثواب انما یکونان علی الصفات النفسانیة والاخلاق المتشبثة بذیل الروح فانما ذکر قوالبها واشباحها فی الشرائع تفهیما وتقریباً للمعانی الدقیقة الی اذهان الناس، شاہ صاحب کی ذاتی رائے یہ ہے کہ جب کوئی شے شریعت میں مامور بہ اور منہی عنہ ہوتی ہے تو بالذات اس پر ثواب و عقاب مرتب ہو جاتا ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ شاہ صاحب آگے چل کر جہاں اس پر بحث کی ہے کہ جو شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہوتی ہے اسکے اصول کیا ہوتے ہیں، وہاں اس اصول کو خود، شریعت ناسخہ کے اصول میں شمار کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

ومنها ان یکلف الناس باشباح البر والاثم ویلزمهم ذلك الزاما عظیما ولا یلوح لهم بارواحها کثیر تلویح ولا یخیرهم فی شئ من الشرائع ویجعل علم الشرائع الذی ماخذ احکام التفصیلیة لمکلفین علما مکنونا وذلك لان الناس لا یعرفون المصالح ولا یستطیعون معرفتها الا اذا ضوبطت بالضوابط وصارت محسوسة یتعاطاها کل متعاط فلو رخص لهم فی ترك شئ منها او بین ان المقصود الاصلی غیر تلك الاشباح توسع لهم مذاهب الخصوص ولاختلفوا اختلافا فاحشا،

اور ان اصول میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر لوگوں کو نیکی و بدی کی جزئی صورتوں کا مکلف کرے اور انکو سخت تاکید کرے اور ان اعمال کی روحانیت کا اُن پر بہت کم اظہار کرے اور انکو احکام شریعت میں سے کسی حکم کی نسبت انکو کرنے نہ کرنے کا مختار نہ بنائے، اور اسرار شریعت کے علم کو جو احکام تفصیلی کا ماخذ ہے ایک راز مخفی قرار دے، اور یہ اسلئے کہ اکثر لوگ مصالح سے واقف نہیں اور اسکو سمجھ نہیں سکتے جب تک کہ ایسے قاعدے نہ بنائے جائیں جو محسوس صورت میں آجائیں اور جنکو ہر شخص سمجھ لے اسلئے اگر انکو کسی کے چھوڑنے کی اجازت دیجائے یا ان سے کہا جائے کہ اعمال اصلی نہیں ہیں تو انکو بڑی وسعت ہو جائیگی اور انمیں سخت اختلاف پیدا ہو جائیگا،

اگر اس کے الفاظ ادل بدل ہو جائیں تو دعا میں وہ تاثیر نہ رہے گی،

پہلا طریقہ اگرچہ بظاہر حکیمانہ اور اصولِ عقل کے زیادہ موافق ہے لیکن یہ طریقہ عام نہیں ہو سکتا، اگر امرونہی کا مدار اس پر رکھا جائے تو ایک ایک عامی کو اوامر و نواہی کے دقائق اور باریکیاں سمجھانی پڑیں گی، اور یہ بالکل ناممکن ہے، اس کے علاوہ کسی کام کے کرنے کے لئے عام طبائع پر جس قدر اس بات کا اثر پڑتا ہے کہ خدا نے اس کام کا حکم دیا ہے، اور خدا اس کی تعمیل سے خوش ہوتا ہے، اس قدر اس بات کا اثر نہیں پڑ سکتا کہ وہ چیز فی نفسہ اچھی ہے، فرض کرو اگر تعزیراتِ ہند کے بجاے، اخلاقی کتابیں جاری کی جائیں جنمیں یہ لکھا ہو کہ چوری، ڈکیتی، رہزنی بُری باتیں ہیں، اس لئے ان سے بچنا چاہئے، تو کیا یہ اخلاقی کتابیں، جرائم کے گھٹانے میں وہ کام دیں گی جو تعزیراتِ ہند دے رہی ہے، ؟ اس بنا پر انبیاء، افعال کی ترغیب و ترہیب کے لئے زیادہ تر یہی دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں، یعنی بجاے اس کے کہ اوامر و نواہی کے وجوہ اور اسباب بتائیں، وہ ان افعال کو بالذات، موجبِ ثواب و عقاب بتاتے ہیں، اور ثواب و عقاب کو صرف خدا کی خوشنودی، اور ناراضی پر محوّل کرتے ہیں، وہ نماز روزہ، زکوٰۃ کے حکم دینے میں عام لوگوں سے یہ نہیں کہتے کہ ان ارکان کے ادا کرنے میں یہ یہ فائدے ہیں، بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے خدا خوش ہوتا ہے، اور اُن کے نہ ادا کرنے سے وہ ناراض ہوتا ہے، اور دراصل عوام کو کسی چیز کی

ويزكيهم ويصلح شأنهم ثم
يتخذهم بمنزلة جوارحه
وذلك لأن هذا الإمام نفسه لا يتأتى
منه مجاهدة أمم غير محصورة وإذا
كان كذلك وجب أن يكون مادة شريعته
ما هو بمنزلة المذهب الطبيعي
لأهل الأقاليم الصالحة عربهم
وعجمهم ثم ما عند قومه من العلم
والارتفاقات ويراعى فيه حالهم
أكثر من غيرهم ثم يحمل الناس
جميعاً على اتباع تلك الشريعة
لأنه لا سبيل إلى أن يفوض الأمر
إلى كل قوم أو إلى أئمة كل عصر إذ
لا يحصل منه فائدة التشريع
أصلاً ولا إلى أن ينظر ما عند كل
قوم ويمارس كلا منهم فيجعل لكل شريعة

ایک قوم کو راہ راست پر لاتا ہے اسکی اصلاح کرتا
ہے اسکو پاک بنا دیتا ہے پھر اسکو اپنا دست و بازو قرار دیتا ہے۔
یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ امام
تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح میں جان
کھپائے اس لئے ضرور ہوا کہ اسکی شریعت
کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا
فطری مذہب ہو، اسکے ساتھ خاص اسکی
قوم کے عادات اور مسلمات کے اصول
بھی لئے جائیں، اور ان کے حالات کا
لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا
جائے، پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی
پیروی کی تکلیف دیجائے کیونکہ یہ تو ہو
نہیں سکتا کہ ہر قوم یا ہر زمانہ کے پیشوائے قوم
کو اجازت دیدیجائے کہ وہ اپنی شریعت آپ
بنا لیں، نہ تشریع محض بیفائدہ ہوگی، نہ یہ ہو سکتا
کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا تجسس کیا
جائے اور ... الگ الگ شریعت بنائی جائے۔

. . . .

فلا احسن ولا ايسر من ان يعتبر في الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومه المبعوث فيهم ولا يضيق كل التضييق على الآخرين الذين يأتون بعد ويبقى عليهم في الجملة۔

اس سے بہتر اور آسان کوئی صورت نہیں کہ شعائر، حدود اور ارتفاقات میں اس قوم کی عادت کا لحاظ رکھا جائے جس میں نبی مبعوث ہوا ہو اور بعد میں آنے والوں پر زیادہ تنگی نہ کی جائے بلکہ فی الجملہ ان پر باقی رکھا جائے۔

خصوصیات ہوتی ہیں، جو انبیا میں نہیں پائی جاتیں،

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اسکی شریعت میں اس قوم کی عادات اور خصوصیات کا خاص طریقہ پر لحاظ ہوتا ہے لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو اُسکے طریقۂ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا، کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ یعنی شریعتیں بنا سکتا ہے، نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں، اسلئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم و تلقین شروع کرتا ہے، اور ان کو محاسنِ اخلاق کا نمونہ بناتا ہے، یہ قوم اسکے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہے اور اُسی کے نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے اسکی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصول عام ہوتے ہیں جو قریبًا تمام دنیا کی قوموں میں مشترک ہوتے ہیں تاہم خاص اس کی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قائم ہوتے ہیں انکی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے،

اس اصول کو شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ (صفحہ ۱۲۳) میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

وهذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة یحتاج الی اصول اخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق الواشید منها ان یدعوقومًا الی السنة	یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اسکو اور چند اصول کی جو اصول مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں، حاجت پڑتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ

بخوبی واقف ہیں، بے شبہہ یہ تاویلیں نئے تعلیمیافتہ لوگوں کے لئے کافی ہیں جو بیچارے عربی زبان اور اُسکے طرز اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع کیا کام دے سکتی ہی،

حقیقت یہ ہے کہ جدید فرقہ، چونکہ وہم پرست مسلمانوں کا طرف مقابل ہی، اسلئے ضرور تھا کہ وہ اعتدال سے متجاوز ہو جائے، ایک طرف جب یہ افراط ہے کہ ہر قسم کے ناممکن اور محال واقعات ہر کس و ناکس سے سرزد ہو سکتے ہیں، اور کرامت الاولیاء حق کے دائرہ کی وسعت کی کوئی حد نہیں قرار پائی، تو اسکے مقابلہ میں یہ تفریط کچھ تعجب انگیز نہیں، کہ کوئی واقعہ جو بظاہر خلاف ہو، ہرگز وقوع میں نہیں آسکتا، لیکن ہمکو افراط و تفریط سے الگ ہو کر، خود حقیقت حال پر غور کرنا چاہیئے،

خرق عادت کے منکرین کا استدلال اور اسپر بحث

خرق عادت کے منکرین کا تمام تر استدلال یہ ہی کہ خرق عادت، قانون فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز قانون فطرت کے خلاف ہی وہ ممتنع ہے اس دلیل کے دوسرے مقدمہ سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن پہلے مقدمہ کے ثابت ہونے کا کیا طریقہ ہے، کیا فطرت کے تمام قوانین منضبط ہو چکے ہیں، ؟ کیا اس پر اطمینان ہو چکا ہی کہ ہم جن امور کو قانون فطرت سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت قانون فطرت ہیں؟ علوم جدیدہ کی تحقیقات اور تجربہ نے سینکڑوں ایسے قانون فطرت دریافت کئے جو پہلے مطلق معلوم نہ تھے، اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے، سینکڑوں ہزاروں برس سے فقرا، اور جوگیوں کے متعلق یہ واقعات منقول چلے آتے تھے کہ وہ محض توجہ قلب سے دوسرے شخص کو مدہوش اور متاثر کر سکتے ہیں، موجودہ زمانہ اس بنا پر انکار کر رہا تھا کہ یہ خلاف قانون فطرت ہے، کہ ایک مادہ بغیر اس کے کہ

اس اصول سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شریعتِ اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہانتک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ اُن سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے[1]،

خرقِ عادات

بیاناتِ مذکورۂ بالا سے اگرچہ ثابت ہوچکا کہ نبوت، خرقِ عادت پر موقوف نہیں، اور اس لحاظ سے ہم کو اس مسئلہ کے متعلق کچھ بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن خرقِ عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے، اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اُسکی جھلک موجود ہے، اسلئے اس عقدہ کا حل کرنا ضرور ہے، قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے، کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا، بے شبہہ شاعرہ کی افراط، بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے

[1] مصنف نے شاہصاحب کے مقصود میں بڑی وسعت پیدا کردی ہے، چوری، زنا اور قتل کی جو سزائیں ہیں وہ قرآن پاک کے منصوص احکام ہیں جن میں تغیر نہیں ہوسکتا، مقصود تعزیرات سے ہے، جو امام کی رائے کے سپرد ہیں، جیسے یہ کہ شرابی کی سزا یا اور دوسرے غیر منصوص انتظامی احکام، جیسے وزرا کا تقرر، امرا کا نصب اور جنگ کے سامان و اسلحہ اور طریقے وغیرہ دوسرے سیاسی و انتظامی مسائل جن میں عربی خصائل و دستور کی پابندی کی ضرورت نہیں، "س س ن"

کی علمی کانفرنس منعقدہ ۲۵ جون ۱۸۲۶ء میں یہ واقعہ برائے العین مشاہدہ کیا گیا۔"

اسی طرح اگر کوئی ہم سے یہ کہتا کہ ایک شخص مرگیا اور جب اسکی تشریح کی گئی تو اسکے پیٹ میں ایک بچہ پایا گیا جو اس شخص کا توام تھا اور اس کے جسم میں پرورش پا رہا تھا، تو ہم واقعہ کو محض خرافات سمجھتے، لیکن چند روز ہوئے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بچہ چھپن برس تک بدن ہی میں پرورش پاتا رہا اور پھر ظاہر ہوا، ہیروڈوٹس کے ایک مترجم نے لکھا ہے کہ لوگوں کا یہ بیان کہ سکندر کی بیوی روکسان نے ایک ایسا بچہ دیا تھا جس کے سر نہ تھا، خلافِ عقل سمجھا جاتا تھا، لیکن آج تمام طبی ڈکشنریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ بہت سے بچے بغیر سر کے پیدا ہوتے ہیں۔"

"اس قسم کے واقعات ہم سے کہتے ہیں کہ ہمکو احتیاط سے کام لینا چاہئے کیونکہ جو لوگ بغیر بصیرت کے انکار کر دیا کرتے ہیں، وہ جاہل اور کودن ہیں[۵]۔"

چونکہ ہمارے ملک میں عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ یورپ عام طور پر خرقِ عادات کا منکر ہے، اور اسی بنا پر جدید تعلیم کا ایک ایک بچہ ہر قسم کے ایسے واقعہ پر جو محسوسات عام کے خلاف ہو، استہزا اور انکار کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ خرقِ عادات کے متعلق یورپ کے مشہور اور مستند حکما و فضلا کے اقوال اور آراء اس موقع پر نقل کریں،

دنیا میں خرقِ عادات سے ہمیشہ اس فرقہ کو انکار رہا ہے جو طبیعی اور مادہ پرست

---

۵ کامل فلامریان کی کتاب صفحہ ۲۴۶،

دوسرا مادہ اس سے ملاقی ہو کسی قسم کا اثر قبول کر سکے، لیکن جب مسمریزیم کے تجربوں نے قوت نفسانی کا اثر ثابت کیا تو تمام پچھلے واقعات تسلیم کرنے پڑے، آج ایک مسمریزیم کا مشاق علی رؤس الاشہاد، دوسرے اشخاص کو محض قوتِ نظر یا قوتِ نفس سے بیہوش کر سکتا ہی اس سے جو بات چاہے کہلوا سکتا ہی، جو کام چاہے کرا سکتا ہے،

قدیم عربی کتابوں میں مذکور ہے کہ مصر میں ایک مچھلی ہوتی ہی جس کے چھونے سے جسم پر رعشہ طاری ہونا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر آدمی اسکو ہاتھ سے پھینک نہ دے تو رعشہ کی شدت سے بیہوش ہو کر گر جائے، یہ واقعہ ایک مدت تک خلافِ عقل قرار دیا گیا، لیکن موجودہ تحقیقات نے اس مچھلی کا وجود ثابت کیا اور معلوم ہوا کہ اس میں الکٹرسٹی ہوتی ہی،

خود یورپ کے محققین اس بات کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ جس قدر تحقیقات بڑھتی جاتی ہے، ناممکن چیزیں، ممکن ثابت ہوتی جاتی ہیں،

خرق عادت کے متعلق یورپ کے علمار کی رائے

فرانس کا مشہور فاضل کیمیل فلامریان جو فزیکل سائنس کا استاد مانا جاتا ہے، اپنی کتاب اسپرچولیزم میں لکھتا ہی: "انسان کی فطری عادت ہی کہ جو چیز بظاہر مشکوک ہوتی ہی، یا جس کو وہ نہیں جانتا اور سمجھ نہیں سکتا، اس کے وجود سے انکار کرتا ہے، ہیروڈوٹس یا پلینی[1] کی تحریروں میں اگر ہم یہ پڑھتے کہ ایک عورت کی ران میں چھاتی تھی اور اس سے وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی تھی تو ہمکو بے اختیار ہنسی آتی اور ہم استہزا کرتے لیکن پیرس

---

[1] یونان کا مشہور مورخ ہے،

کرتی رہی، اخیر میں مجلس نے جو رپورٹ مرتب کی، اسکے بعض فقرے یہ ہیں،

"مجلس نے اپنی رائے کا مدار صرف ان تجربوں پر رکھا جو مجلس نے برای العین مشاہدہ کئے اور جن میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہیں ہوسکتا تھا، مجلس میں چار شخص ایسے ممبر تھے، جو شروع میں اس قسم کے واقعات کے سخت منکر تھے، اور سمجھتے تھے کہ یا تو ان واقعات میں فریب اور شعبدہ بازی سے کام لیا جاتا ہے، یا خود انسان کے عصبی نظام کا اثر ہے، لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ خرقِ عادات حقیقی اور واقعی ہیں"

اس کے بعد انگلستان اور امریکہ میں اسکی تحقیقات کے لئے ایک مجلس قائم ہوئی جس کے صدر انجمن ہیزلوب اور ہوڈسن تھے، یہ مجلس قریبًا بارہ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی اور بالآخر ۱۸۹۹ء میں اسنے اپنی تحقیقات ختم کی، اور ان واقعات کی صحت کا اعتراف کیا، ہیزلوب نے جو رائے لکھی اسکے بعض فقرے یہ ہیں،

"مجھکو امید ہے کہ بیس برس دن کے بعد تمام دنیا کے سامنے دلائلِ قطعیہ سے یہ ثابت کردوں گا کہ اس عالمِ فانی کے بعد ایک اور عالم ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرقِ عادات دیکھے جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہوسکتا"

ہوڈسن کی رپورٹ کے بعض جملے یہ ہیں،

دنیا کو بہت جلد عظیم الشان جدید اطلاعیں، حاصل ہونے والی ہیں مجھکو امید ہے کہ

ہوتا ہے یعنی وہ لوگ جن کی تحقیقات، اجسام اور خواصِ اجسام پر محدود ہوتی ہے، یورپ کا یہی حال ہے ایک مدت تک یہی حالت رہی، پھر یک فرقہ پیدا ہوا جس نے روح اور روح کے اثروں کی تحقیقات پر توجہ کی، ان لوگوں نے بہت سے تجربوں کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ روح جسم سے جداگانہ ایک چیز ہے، اور اس کے قویٰ اور ادراکات بالکل الگ ہیں، روح سیکڑوں کوس سے بغیر حواس کی وساطت کے ایک چیز کو دیکھ سکتی اور سن سکتی ہے، روح واقعاتِ آئندہ کا ادراک کر سکتی ہے، روح کوسوں تک اپنا اثر پہنچا سکتی ہے، غرض روح کے ذریعہ سے بہت سے ایسے افعال سرزد ہو سکتے ہیں جنکو خرقِ عادت کہا جاتا ہے،

اسپریچولیزم

اس فرقہ نے اپنے دعویٰ کو اس بلند آہنگی سے ظاہر کیا کہ لوگوں کو اسکی تحقیقات کی طرف متوجہ ہونا پڑا ۱۸۶۹ء میں بمقام لندن ایک بہت بڑی مجلس ان امور کی تحقیقات کے لئے منعقد ہوئی، اس مجلس کے ارکان یہ تھے :-

سر جان لیبک ممبر پارلیمنٹ - صدر انجمن

پروفیسر ہکسلی جو طبیعیات کا سب سے بڑا عالم تھا، وکیں

لوئیس، فزیکل سائنس کا بہت بڑا عالم "

الفرڈ ویلز جو ڈارون کا ہمعصر اور مسئلۂ ارتقا میں برابر کا شریک تھا، ممبر

مارگن، مجلس علوم ریاضیہ کا صدر انجمن، "

جان کوکس۔ "

ان کے سوا اور بہت سے فضلا شریکِ مجلس تھے، اٹھارہ مہینہ تک یہ مجلس برابر تحقیقات

کی شعبدہ بازیوں کا پتہ لگائے، اس طرف توجہ کی اور پندرہ برس تک اس تگ و دو میں رہا، لیکن بالآخر اُس نے یہ الفاظ کہے :-

"میں نے خاص اپنے گھر میں جہاں میرے احباب کے سوا، اور کوئی موجود نہ تھا، بغیر کسی درمیانی شخص کے قطعی طور پر اس کا تجربہ کیا، جن لوگوں سے بات چیت ہوئی وہ مرے ہوئے ہمارے عزیز و اقارب تھے۔"

بارکس نے جو مشہور جیالوجسٹ فاضل ہے، ایک علمی پرچہ میں لکھا کہ "میں نے تمام وہ کتابیں جو روح کے رد میں لکھی گئی تھیں پڑھیں اور ان تمام لوگوں سے مناظرے کئے لیکن میں نے یہ مشاہدات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دس برس تک تجربہ کرتا رہا، یہاں تک کہ اب میں اُن مشاہدات پر، بہ علم و درایت گفتگو کر سکتا ہوں۔"

مارگن جو علوم ریاضیہ کا پریسیڈنٹ ہے، اُس نے یہ شہادت دی کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جو دیکھا اور اپنے کانوں سے جو سنا اُس نے مجھ کو ایسا مطمئن کر دیا ہے کہ شک کا احتمال بھی نہیں رہا۔"

سب سے بڑی شہادت اس باب میں **رسل ویلز** کی ہے، یہ مشہور فاضل ڈارون کا شریک اور ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، ڈارون کی ایجاد میں یہ برابر کا شریک تھا، اس نے خاص اس بحث پر ایک کتاب لکھی جس کا نام عجائباتِ روح ہے، اس میں وہ لکھتا ہے کہ "میں محض دہریہ تھا اور اپنے اس مذہب پر بالکل قانع تھا، مجھکو ذرہ بھر بھی خیال نہ تھا کہ میں روح کا معترف ہو سکوں گا، یا اس بات کا قائل ہو سکوں گا کہ اِس عالم میں مادہ کے سوا اور

دو ہی ایک برس میں، میں دنیا کے لئے انسانی زندگی کے قوانینِ فطرت کی نئی تفسیر پیش کروںگا"
اگر پروفیسر ہیزلوب نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اُس نے مردوں کی روحوں سے باتیں کیں
تو اُس نے بالکل سچ دعویٰ کیا ہے"۔

ایک اخبار کے نامہ نگار نے ہوڈسن سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی تو اُس نے یہ الفاظ
کہے "میں نے اور پروفیسر ہیزلوب نے ایک ساتھ تحقیقات شروع کی ہم دونوں دہریہ تھے
اور کسی شے پر یقین نہیں رکھتے تھے، تحقیقات سے ہماری غرض یہ تھی کہ مدعیانِ روحانیت
جو شعبدہ بازیاں کرتے ہیں، ان کی پردہ دری کردی جائے، لیکن آج میں اس بات کا
قائل ہوں کہ مردوں سے بات چیت ہوسکتی ہو، اور اُس کے متعلق ایسے دلائل ظاہر
ہو چکے کہ اب مطلق شبہہ کی گنجایش نہیں رہی"۔

پروفیسر کوکس، جو امپیریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن ہے اُس نے مجمعِ عام
میں کہا کہ "میں صرف یہی نہیں کہتا کہ یہ ممکن ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل حقیقتِ واقعی
ہے"۔ پروفیسر کوکس نے خاص اسپریچولیزم پر ایک کتاب لکھی جو نہایت کثرت سے بار
بار چھپ چکی ہو، اس میں وہ لکھتا ہو کہ "چونکہ مجھ کو ان واقعات کا قطعی یقین ہو چکا ہو، اسلئے
یہ اخلاقی نامردی ہے کہ میں ان کے ظاہر کرنے میں اس بنا پر ہچکچاؤں کہ نکتہ چین میری
ہنسی اڑائیں گے"۔

مادیین میں بہت بڑا فاضل ڈاکٹر جارج سکستون ہے، وہ روح وغیرہ کا نہایت
مخالف تھا، اور ان امور پر سخت حملے کیا کرتا تھا، اس نے صرف اس غرض سے کہ مدعیانِ روح

دھوکا کھایا چنانچہ چند مشہور پروفیسروں نے یہ خیال اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیا، اس پر
زولنرنے ایک رسالہ لکھا جس کا نام اوراق علیہ ہے، اس میں اُس نے نہایت زور وشور سے
اپنے مشاہدات کا حوالہ دیا، اور اُن کی صحت پر دلائل قائم کئے،

۱۸۹۰ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی اس کے ایک جلسہ میں پروفیسر لوورج نے
جو بہت بڑا ریاضی داں ہے، ایک لکچر دیا اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا کہ "اب وہ
وقت آگیا ہے کہ مادی اور روحانی عالم میں ابتک جو حد فاصل تھی وہ ٹوٹ جائے جس طرح
اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں، اس طریقہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ممکنات کی کچھ انتہا نہیں
اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں وہ بمقابلہ ان چیزوں کے جو ہم کو معلوم نہیں ہیں کچھ بھی
نسبت نہیں رکھتیں۔"

۲۲ جون ۱۸۹۰ء کو جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں پروفیسر درو تاش نے اپنی
اسپیچ میں کہا کہ "یہ خرقِ عادات جو اس وقت ہم نے مشاہدہ کئے اور جن کے ذکر سے ان
لوگوں کو طیش آجاتا ہے جو اپنے آپ کو عالم خیال کرتے ہیں اور جزئی مباحثِ علمیہ پر
گفتگو کیا کرتے ہیں، انہی متواتر مشاہدات کے سلسلہ میں داخل ہیں جو ایک مدت سے
ہمارے تجربہ میں آرہے ہیں اور جن کی نسبت شک کرنا اب غیر ممکن ہو گیا ہے۔"

۱۸۹۲ء میں بمقام میلان ایک بہت بڑی کمیٹی منعقد ہوئی جس کے ممبر حسب ذیل تھے،

الکزنڈر گزاکوف،

جیوفانی۔ میلان کے رصدخانہ کا سکرٹیری،

بھی کوئی چیز کوئی اثر پیدا کر سکتی ہے"۔

"لیکن محسوس حیرت خیز مشاہدات نے مجھکو مجبور کر دیا، کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں، اگرچہ ابھی تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار، روح سے سرزد ہوتے ہیں لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل پہ اثر کرنا شروع کیا، نہ بطریق استدلال و حجت بلکہ یہ مشاہدات کے پے در پے تواتر کا اثر تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ روح کے اقرار کے بغیر کوئی مفر نہ تھا۔"

پروفیسر الیسٹ جو امریکہ کی سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن ہے، اُس نے ایک میگزین میں لکھا کہ "چند روز پہلے مجھ کو اس خیال سے بھی تکلیف ہوتی تھی کہ مجھ کو ایک ایسا واقعہ لکھنا پڑیگا، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ اپنے اعتقاد کو اگر بد دیانتی سے چھپاتا ہوں تو میں اپنی عقلی ترقی کو گھٹاتا ہوں، یہ تمام سچے مشاہدات دیکھ کر اب میں چپ نہیں رہ سکتا ورنہ میں اخلاقی بزدلی کا مرتکب ہونگا"۔

جرمنی کا مشہور ہئیت داں زولنر بھی اسکی تحقیقات پر متوجہ ہوا، اس کے ساتھ اور چند مشہور فضلا شریک ہوئے، جنمیں سے بعض کے یہ نام ہیں،

ویبر

فیشنر، فزیکل سائنس کا استاد اور یونیورسٹی کا پروفیسر،

ونڈٹ، نہایت مشہور فاضل اور یونیورسٹی کا پروفیسر،

بالآخر بہت سی تحقیقات کے بعد ان تمام فاضلوں نے روح کے عجیب و غریب کرشموں کا اعتراف کیا، زولنر بہت بڑا عالم تھا، اس کے اعتراف پہ لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اس نے

متجاوز ہیں، لیکن ان کی بنا پر جو کلیات قائم ہوتے ہیں، اُن کو کامل فلامریان نے حسب ذیل شمار کیا ہے،

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجود مستقل رکھتی ہے،

(۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم موجودہ کی رو سے غیر معلوم تھیں،

(۳) روح حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہوسکتی ہے، یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے،

(۴) روح آیندہ واقعات سے واقف ہوسکتی ہے،

ان شہادتوں کو ہم روح کے ثبوت میں پیش نہیں کرتے بلکہ ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان میں ایک قوت ہو جس کو خواہ روح کہو خواہ ترکیب جسم کا خاصہ مانو، اُس سے ایسے عجیب و غریب افعال سرزد ہوتے ہیں جن کو علوم جدیدہ کے اساتذہ بھی خرقِ عادت سے تعبیر کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ وہ جسم اور مادہ کے دسترس سے باہر ہیں، اس بنا پر خوارقِ عادات سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہوسکتا، البتہ فرق یہ ہے کہ وہم پرست اور خوش اعتقاد لوگ ان چیزوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں، کہ بلاکسی سبب اور واسطہ کے براہ راست خود خدا کی قدرت سے سرزد ہوتے ہیں، اور خواص کا یہ اعتقاد ہے کہ عالم اسباب میں ہر چیز وابستۂ علت ہے، اسلئے ان خرقِ عادات کا بھی کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے،

کارل دوپرل۔ جرمنی کا مشہور ڈاکٹر،

جیوزوب جیرورزا، فزیکل سائنس کا پروفیسر،

پروفیسر شارل ریشیہ۔ فرانس کے طبی کالج کا پروفیسر،

لمبروزو،

ان علمانے ۱۷ اجلاس میں ان امور کی تحقیقات کی، اور بالآخر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "جو خوارقِ عادات ہم نے مشاہدہ کئے ان میں کسی قسم کی شعبدہ بازی یا چالاکی نہیں تھی، اور یہ مشاہدات یہ درجہ رکھتے ہیں، کہ مسائلِ علمیہ میں داخل کئے جائیں۔"

اس قسم کی سیکڑوں شہادتیں ہیں جن کو نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو گی، اسلئے ہم دائرۃ المعارف کے فقرۂ ذیل پر اکتفا کرتے ہیں،

وکثیرون من اهل امریکا واوربا الممتازین بالعلوم والفلسفة والحکمة والسیاسة یعتقدون وجود قوة لم یکشفها العلم تقوم بتلک الاعمال وان ما رأوه من الظواهر لا ینسب الی الخداع او لشعوذة وقالوا ان لم تکن حقیقة فهی

[illegible]

امریکہ اور یورپ کے بہت سے علما جو علوم فلسفہ حکمت اور سیاست میں ممتاز ہیں، اس بات کے معتقد ہیں کہ ایک ایسی قوت موجود ہے جس کو علم نے اب تک دریافت نہیں کیا تھا، وہ قوت ان اعمال کو انجام دے سکتی ہے ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ جو تجربے ان لوگوں نے کئے وہ فریب یا شعبدہ

جو خوارقِ عادات، ان تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہوئے اگرچہ وہ ہزاروں سے

"یہ امر بداہتہً ثابت ہے کہ تخیل اور توہم کا اثر جسم پر پڑتا ہے، مثلاً خوشی سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے بعض دفعہ محض وہم سے آدمی بیمار ہوجاتا ہے، بیٹھے بیٹھے انسان کو کسی کی طرف سے دل میں ناگوار خیالات آتے ہیں، ان خیالات سے غصہ پیدا ہوتا ہے، غصہ سے حرارت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ پسینہ آجاتا ہے، اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ مادیین کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ مادہ پر صرف مادہ ہی اثر ڈال سکتا ہے، خیال، وہم، غیظ، غضب مادہ نہیں بلکہ ایک کیفیت ہے، باوجود اس کے انکا اثر جسم پر پڑتا ہے،

جس طرح ان کیفیات سے، انسان خود متاثر ہوتا ہے، بعض انسانوں میں یہ قوت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر اثر ڈال سکتے ہیں، یہ قوت انسانوں میں علیٰ قدر مراتب قوی اور ضعیف ہوتی ہے، اور بعض انسانوں میں اس قدر قوی ہوتی ہے کہ اس سے نہایت عجیب و غریب افعال سرزد ہوتے ہیں"

"یہ قوت جس شخص میں فطری اور جبلی ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ وہ فطرۃً مقدس اور پاکیزہ خو ہوتا ہے، اور اس قوت کو اغراض حسنہ میں استعمال کرتا ہے، وہ نبی یا ولی ہوتا ہے، اور اگر اس قوت کے ساتھ فطرۃً بدطینت اور شریر ہوتا ہے اور اس قوت کو برے کاموں میں صرف کرتا ہے، تو وہ جادوگر اور شعبدہ گر ہوتا ہے"

امام غزالی نے معارج القدس میں جہاں انبیا کے مختصات لکھے ہیں، لکھتے ہیں،

ولا ینکر ان یکون من القوی	اور کچھ بعید نہیں کہ بعض لوگوں کے
النفسانیۃ ما ھو اقوی فعلاً	قوائے نفسانی ایسے ہوں جن کی قوت

اسلام میں جو حکماء اور عرفا گذرے ہیں مثلاً امام غزالی، ابن رشد، شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ سب نے ان خرق عادات کو اسباب کا معلول مانا ہے، اور ان اسباب کی تشریح کی ہے جن سے یہ خرق عادات سرزد ہوتے ہیں، امام غزالی نے تمام معجزات کی تین قسمیں قرار دی ہیں، حسی، خیالی، عقلی، پہلی قسم تو اشاعرہ کے استمالت کے لئے قائم کی ہے، باقی دو قسمیں جو اپنے مذاق کے موافق بیان کی ہیں وہ بالکل آج کل کی تحقیقات کے موافق ہیں چنانچہ ہم نے امام غزالی کی سوانحعمری میں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے، امام صاحب کی اصلی عبارت نقل کی ہے،

خرق عادات کی نسبت بوعلی سینا کی رائے

بوعلی سینا کو بھی ایک مدت تک خرقِ عادات سے انکار تھا لیکن جو صوفیہ اُس کے زمانہ میں موجود تھے، ان کے خوارقِ عادات اس کثرت سے خود اُس کے مشاہدہ میں آئے کہ بالآخر اس کو اقرار کے ساتھ ان کے اسباب وعلل پر غور کرنا پڑا، اشارات میں خود اسکے الفاظ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے، وہ خرقِ عادات کے بیان میں لکھتا ہے،

ولکنھا تجارب لما ثبتت طلب	لیکن یہ تجربے ہیں اور جب وہ ثابت ہوئے تو
اسبابھا ثم انی لو اقتصصت جزئیات	انکے اسباب کی جستجو ہوئی اور اگر میں اس قسم کے جزئیات
ھذا الباب فیما شاھدناہ وفیما	کا شمار کروں جو میں نے خود دیکھے یا ان لوگوں نے دیکھے
حکی عمن صدقناہ لطال الکلام	جنکو میں ثقہ سمجھتا ہوں، تو بہت طول ہو جائیگا،

بوعلی سینا نے مختلف خرق عادات کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں، ان میں سے اس نے سب سے بڑا سبب قوتِ نفسانی کا اثر قرار دیا ہے، اسکی تفصیل اسکے بیان کے موافق حسب ذیل ہے،

مفسرین میں جو محقق گذرے ہیں مثلاً قفال، ابومسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ، ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں، بہت کم خرقِ عادات مذکور ہیں، اور جو واقعی مذکور ہیں ان کی صحت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟

اخیر میں یہ جتا دینا بھی ضرور ہے کہ اشاعرہ اور آج کل کے عام مسلمانوں نے خرقِ عادت کے مفہوم کو جو وسعت دی ہے، اس کے رو سے ہر قسم کے محالات اور حقیقی ناممکنات بھی خرقِ عادت کے دائرہ میں آجاتے ہیں، اور ہم تاہم اُن کے امکان کا دعویٰ نہیں کرتے، مدت کے ڈوبے ہوئے آدمیوں کو، دریا میں ایک کنکری پھینک کر زندہ کر دینا خرقِ عادت نہیں بلکہ محال ہے، اور خرقِ عادت کے جواز سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ اس قسم کی دور از کار روایتوں کو صحیح تسلیم کیا جائے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

بَعَثَ فِی الْاُمِّیِّیْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ

نبوت کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا ایک بدیہی مسئلہ رہجاتا ہے، نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا اجزاے ذیل سے مرکب ہے، خود کامل ہو، دوسروں کو کامل کرسکتا ہو، اُس کے علوم و معارف، اکتسابی نہ ہوں، بلکہ منجانب اللہ ہوں، یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذاتِ مبارک میں موجود تھیں کیا ابتداے آفرینش سے آج تک اسکی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟

وتاثیراً من انفسنا نحن وحتی	اور تاثیر، ہمارے نفوس سے زیادہ ہو،
لایقتصر فعلہا فی المادۃ التی	یہانتک کہ ان کا اثر اپنے ہی جسم پر محدود
رسمہا وھو بدنہا بل اذا	نہ ہو بلکہ جس طرح اپنے اجسام پر
شاءت احدثت فی مادۃ العالم	وہ اثر ڈال سکتے ہیں، مادہ عالم پر بھی
ما یتصور فی نفسہا،	ایسا ہی اثر ڈال سکیں،

بوعلی سینا نے قوت نفسانی کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے، جدید تحقیقات کے بالکل مطابق ہے، اسپرچولیزم والے تو صاف اعتراف کرتے ہیں کہ روح ایک مستقل جداگانہ چیز ہے، اور یہ خوارقِ عادات اسی کے آثار ہیں، جو لوگ روح کے قائل نہیں ہیں ان کو بھی مشاہدات اور تجربوں کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑا کہ انسان میں کوئی ایسی قوت ہے جس سے وہ خوارقِ عادات سرزد ہوتے ہیں جو جسم اور مادہ سے سرزد نہیں ہو سکتے، چنانچہ اسکے متعلق یورپ کے بڑے بڑے علمائے علوم جدیدہ کی شہادتیں اوپر گذر چکیں،

غرض خرقِ عادت ایسی چیز نہیں کہ محض اس کی بنا پر کسی مذہب کو غلط کہدیا جائے البتہ چونکہ خرقِ عادت کوئی معمولی چیز نہیں، اسلئے یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ جب تک اسکے ثبوت کی قطعی شہادت موجود نہ ہو، ہم اس پر اعتبار نہ کریں، قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے اس لئے اس میں جہاں خرقِ عادت کا ذکر ہوگا، واجب التسلیم ہوگا، لیکن پہلے یہ امر نہایت غور اور دقتِ نظر سے طے کرنا پڑیگا کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ، اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں؟

اور خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے، جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوتے ہیں، انہی سے وہ ادل بدل کر ایک دوسری صورت بنا لیتا ہے، اب غور کرو کہ اگر اس فطرت کے رو سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں خدا کا خیال آتا تو اسی قسم کا خدا ہوتا جو اس زمانہ کے لوگوں کا تھا، لیکن آپ نے جس خدا کی تلقین کی وہ ایسا خدا تھا جو واحد محض ہے، جس کی ذات و صفات میں کسی شخص کو کسی قسم کا اشتراک نہیں، جو نہ زمین میں ہے، نہ آسمان میں، نہ اوپر نہ نیچے، نہ دائیں نہ بائیں، نہ زمان میں نہ مکان میں، اور پھر ہر جگہ ہے، جو ایک ایک ذرہ کو جانتا ہے، چیونٹی کے پاؤں کی آہٹ کو سن لیتا ہے، ہمارے دل کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے، ایسا منزہ، ایسا کامل، ایسا بالاتر خدا انسان خود اپنے خیال سے نہیں پیدا کر سکتا تھا، بلکہ وہی خدا یہ خیال پیدا کرا سکتا تھا جو ان صفات کے ساتھ موصوف ہے،

عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت اور انجیل کی تعلیم پائی تھی،

عیسائیوں نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے بہت کوشش کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھے لکھے تھے، توراۃ و انجیل سے واقف تھے، اور جرجیس نام ایک عیسائی سے تعلیم حاصل کی تھی، اگر یہ صحیح ہے تو خدا کی نسبت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خیال پیدا ہونا اور بھی زیادہ بعید بلکہ محال تھا، کیونکہ اس زمانہ کی توراۃ و انجیل اور عیسائی معلم اسی خدا کی تلقین کر سکتے تھے جو خود ان کا خدا تھا، فرانس کا مشہور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری اپنی کتاب اسلام[1] میں لکھتا ہے،

[1] یہ کتاب فرنچ زبان میں تھی، مصر کے ایک عالم نے عربی زبان میں اسکا ترجمہ کیا اور ۱۸۹۸ء میں چھاپ کر شائع کیا،

غور کرو وہ شخص جس نے کسی قسم کی ظاہری تعلیم نہ پائی ہو، جس نے آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش، بت پرستی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا ہو، جس کے کانوں میں ناقوس کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی ہو، جس نے الٰہیات، اخلاق، اصولِ معاشرت، قانونِ تمدن کے متعلق ایک حرف بھی کسی سے نہ سنا ہو، دفعۃً منظرِ عام پر آئے اور ایک طرف تو فلسفۂ اخلاق، تزکیۂ روح، الٰہیات، معاد، قانون معاشرت، اصول تمدن کے وہ دقائق اور نکات بتائے جو کسی حکیم، کسی فلسفی، کسی مقنن، کسی پیغمبر نے کبھی نہیں بتائے تھے، دوسری طرف تمام قوم کی قوم میں جو اس وقت جہالت و وحشت، جور و ظلم، فسق و فجور، سفاکی و خونریزی میں ڈوبی ہوئی تھی، پاکیزہ اخلاقی اور سچائی کی وہ روح پھونک دے کہ دفعۃً ان کی کایا پلٹ ہو جائے، بجز محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور کون ہو سکتا ہے؟

غور کرو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے وقت تمام دنیا کی کیا حالت تھی؟ ہندو اور مصری سینکڑوں خدا یا اوتار مانتے تھے، عیسائی تثلیث کے قائل تھے، صابئین ستارہ پرست تھے، مجوسی یزدان اور اہرمن دو خدا تسلیم کرتے تھے، یہودی توحید کے قائل تھے، مگر جس قسم کا خدا مانتے تھے، وہ انسان سے کچھ ہی بڑھکر بلکہ بہت سی باتوں میں برابر یا گھٹ کر تھا، اہلِ عرب یا تو خدا کے سرے سے قائل ہی نہ تھے، یا مانتے تھے تو اس قسم کا خدا مانتے تھے جس کے نہایت کثرت سے لڑکیاں (یعنی ملائکہ) تھیں بہت سے فرقے ہر دن کا الگ الگ خدا مانتے تھے،

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو خیال اس کے دل میں آتا ہے وہ انہی واقعات روایات

عقائد

سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی فکر و اجتہاد سے عقائد قائم کرنے چاہئیں یا دوسروں کی تقلید اور پیروی سے، اسلام سے پہلے جس قدر مذاہب تھے سب میں، ائمۂ دین کے سوا باقی تمام لوگ تقلید پر مجبور تھے، عیسائیوں میں پوپ، یہودیوں میں احبار یا ربیون، پارسیوں میں دستور، ہندوؤں میں نیون اور رشیوں کے سوا کوئی شخص نہ مذہبی عقیدہ کے متعلق کچھ کہہ سکتا تھا، نہ عقائد کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکتا تھا،

اسلام نے اس قسم کی تقلید کو شرک قرار دیا اور کہا کہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	عیسائیوں اور یہودیوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ آیت ۳۱)	احبار اور رہبانوں کو خدا بنا لیا ہے،

عقائد میں تقلید کرنا شرک ہے

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اہل کتاب نے بڑے تعجب سے کہا کہ ہم لوگ احبار اور رہبان کو خدا کہاں کہتے ہیں!!! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ تمھارا عقیدہ ہے کہ بطریق (پادری) جس چیز کو حلال کر دیتا ہے، حلال ہو جاتی ہے اور جس چیز کو حرام کر دیتا ہے حرام ہو جاتی ہے۔"

اسی مضمون کو ایک اور موقع پر فرمایا،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ	تو کہدے کہ اے کتابیو! آؤ ایک بات پر
سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	جو ہمارے اور تمھارے دونوں کے ہاں مسلم ہے،
اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا	وہ یہ کہ خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور خدا کیسا

"اُن روایات کا پتہ لگانا جن سے یہ ثابت ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عیسائیوں، یہودیوں اور ستارہ پرستوں کے عقائد بالمشافہ حاصل کئے تھے، فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ اس سے ان مقامات کی تشریح ہوتی ہے جہاں قرآن اور تورات کی آیتیں ہم مضمون ہیں، لیکن پھر بھی یہ دوم درجہ کی بحث ہے، کیونکہ گو یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن آسمانی کتابوں سے ماخوذ ہے، لیکن یہ مشکل حل نہیں ہوتی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں یہ مذہبی روح کیونکر پیدا ہوئی اور وحدانیت کا ایسا مضبوط اعتقاد کیونکر پیدا ہوا، جو ان کے جسم و روح پر بالکل چھا گیا"[1]

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے "یہ محال ہے کہ یہ اعتقاد تورات اور انجیل کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہو، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کتابوں کو پڑھا ہوتا تو ان کو اُٹھا کر پھینک دیا ہوتا کیونکہ وہ ان کی فطرت اور وجدان اور مذاق کے مخالف تھیں، اس قسم کے اعتقاد کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے ادا ہونا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رسولِ صادق اور پیغمبرِ مامون تھے۔"

اب ہم تفصیل کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت کے متعلق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اصول اور مسائل وحی کے ذریعہ سے تلقین فرمائے وہ اس قدر کامل اور اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ کسی حکیم اور مقنن کے خیال میں نہیں آئے، اور بغیر وحی الٰہی کے کسی خیال میں آ ہی نہیں سکتے تھے،

---

[1] ترجمہ کتاب مذکور بزبان عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۶،

وجود باری کی نسبت تمام اہل مذاہب کی غلطیاں

لیکن وہ کہتے تھے کہ عقیدہ کا سمجھ میں آنا ضرور نہیں، مصری کئی کرور خدا تسلیم کرتے تھے پارسیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نیکی و بدی، دونوں کا ایک خدا کیونکر ہو سکتا ہے، اس بنا پر اُنھوں نے نیکی و بدی کے الگ الگ خدا قرار دے رکھے تھے، ہندوؤں کے ہاں کم سے کم تین خدا تھے، برمہا، بشن، مہیش، اور اوتار توسیکڑوں بلکہ ہزاروں، یہود البتہ ایک خدا کے قائل تھے، لیکن اُس کے اوصاف ایسے قرار دئے تھے، کہ وہ ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے بڑھ کر نہ تھا،

یہ تو اُن کا حال تھا جو خدا کو کسی نہ کسی صورت میں مانتے تھے، اُس گروہ کی بھی کمی نہ تھی جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ تھے، یہ مختلف ناموں سے موسوم تھے، زندیق، دہریہ، مادیین وغیرہ وغیرہ،

دنیا اس عالمگیر تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دفعۃً اسلام نے آکر ان تمام غلط خیالات اور معتقدات کا پردہ چاک کر دیا، اُس نے بتایا کہ خدا واحد محض ہے اور زمان ومکان جہت و اشارہ، تحت وفوق، ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے مبرا ہے، یہ وہ تقدیس و تنزیہ تھی جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی، اور گبن نے کہا کہ "جب زمان ومکان و جہت و اشارہ، تمام خصوصیتوں کو الگ کر لیا جائے تو خیال کے لئے کیا باقی رہجاتا ہے" بے شبہہ اسلام کو ایسی ہی وسیع الخیالی کی بنیاد قائم کرنی تھی، جو جسمانی خصوصیات سے بالکل معرّا ہو،

توحید خالص اور ہر قسم کی بت پرستی کا استیصال

اسی تقدیس کی بنا پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی کا استیصال کر دیا کیونکہ اسلام

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران آیت ۲۷) — کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے ایک ایک کو اپنا رب نہ بنائے، خدا کو چھوڑ کر،

اسلام نے اس قسم کی جو آزادی دی، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ میں گو نہایت اختلاف مراتب تھا، لیکن عقائد میں کوئی شخص کسی کا مقلد نہ تھا، ایک جاہل بدو بھی عقائد میں بڑے سے بڑے صحابی کی تقلید نہیں کرتا تھا، بلکہ اپنی سمجھ اور عقل سے کام لیتا تھا، اسی کا اثر ہے کہ گو زمانہ مابعد میں جب اسلام کو تنزل ہوا تو تقلید کا رواج شروع ہوا، لیکن یہ مسئلہ آج تک مسلّم رہا کہ لا یجوز التقلید فی العقائد یعنی عقائد میں تقلید جائز نہیں،

اسلام کی یہی ہدایت تھی جو ہزار برس کے بعد لوتھر کے خیال میں آئی اور جس کی بنا پر اُس نے دنیا کو پوپ کی غلامی سے آزادی دلائی، یورپ میں ہر قسم کی مذہبی آزادی کی بنیاد درحقیقت گویا اسلام کی اسی ہدایت پر قائم ہوئی اور قائم ہے،

تفصیلی عقائد

ذات و صفات باری

عقائد میں اہم المسائل اور راس المسائل خدا کے وجود اور اُسکی ذات و صفات کا مسئلہ ہے، خوب غور سے دیکھو کہ ایسے بڑے ضروری مسئلہ کے متعلق، تمام اہلِ مذاہب بلکہ تمام عالم کس قسم کی عجیب و غریب غلطیوں میں مبتلا تھا، عیسائی تین خدا مانتے تھے، اور تین کو ایک اور ایک کو تین کہتے تھے، یہ اجتماع النقیضین خود انکی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا

تفصیلی عقائد

ہیں یہی خیال تھا جس نے رام، کرشن، زردشت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عین خدا، یا کم از کم مظہر خدا بنا دیا تھا، اسلام نے نہایت زور شور، نہایت آزادی، نہایت دلیری اور سختی سے صاف بتا دیا کہ انبیا بشریت کے دائرہ سے ایک ذرہ باہر نہیں ہیں،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	اے محمد! کہہ دو کہ میں تم ہی جیسا آدمی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے، کہ تمہارا خدا واحد ہے،
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (نساء ۱۲۱)	عیسیٰ کو اس بات سے عار نہیں کہ وہ خدا کے غلام ہیں،
قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام - ۵)	اے محمد! کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں جو مجھ پر آتی ہے
وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (اعراف ۲۳)	(اے محمد! کہہ دو کہ) اگر میں غیب کی بات جانتا تو بہت سا فائدہ جمع کر لیتا

دنیا میں جتنے مذہب گذرے ہیں سب نے خدائی اور نبوت کے ڈانڈے ملا دیئے تھے یا کم سے کم قریب کر دیئے تھے، صرف اسلام کو یہ عزت حاصل ہے کہ اس نے دونوں کی حدیں بالکل جدا کر دیں،

خوب غور کرو، ہم مسلمان، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمام انبیا سے بزرگ، اور افضل مانتے ہیں باوجود اس کے حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ، حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ، حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صرف رسول اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا، وہ ایسا نہ تھا کہ خدا کا تصور، جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر، دلوں میں نہ آسکے، ہندو، مصری، صابی، رومن کیتھولک سب خدا کے تصور کے لئے جسمانی تمثل کے محتاج تھے، اور اسی وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے، لیکن اسلام میں باوجود سیکڑوں ہزاروں فرقوں کے پیدا ہو جانے کے بھی کسی فرقہ کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آسکا، آج دنیا میں ہندو، عیسائی، پارسی وغیرہ جس قدر روشن ضمیر اور بلند خیال ہوتے جاتے ہیں، توحید خالص کے قریب آتے جاتے ہیں، علم و فن اور خیالات کی وسعت جس قدر بڑھتی جاتی ہے، خدا کی نسبت جسمانی قیود کا خیال مٹتا جاتا ہے،

درمیانی واسطوں کو مٹانا

خدا کے تسلیم اور اعتراف کے بعد ایک بڑا مرحلہ یہ تھا کہ بندہ کو خدا سے براہ راست کیونکر تعلق ہو سکتا ہے؟ اس ضرورت سے تمام فرقوں نے درمیانی واسطے قائم کئے تھے اور اوتاروں، دیوتاؤں، پیروں کا سہارا ڈھونڈتے تھے، اسلام نے بتایا کہ خدا اور بندہ کے درمیان کوئی واسطہ درمیانی نہیں، ہر شخص براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہے، اور اپنی ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں پیش کر سکتا ہے، خدا کا دربار سعی، سفارش، توسط اور شفاعت سے مبرا ہے، وہ ہر شخص کے پاس ہی، ہر شخص کی آواز سنتا ہے، ہر شخص اس تک پہنچ سکتا ہے،

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق-۲) ہم انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ اسکے قریب ہیں

نبوت

نبوت | توحید کے بعد **نبوت** کا درجہ ہے، اس کے متعلق تمام دنیا میں ایک عالمگیر غلطی پھیلی ہوئی تھی، ہر فرقہ اور ہر گروہ یہ سمجھتا تھا کہ انبیاء انسان کے درجہ سے بالاتر ہوتے

ہے، نیک و بد جس قدر افعال ہیں ان کا نیک یا بد اثر روح پر مترتب ہوتا ہے، اچھے کاموں سے روح کو انبساط ہوتا ہے، بُرے افعال سے انقباض، آلودگی اور نجاست کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ نتائج ہیں جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے، فرض کرو ایک شخص نے کسی کی کوئی چیز چرائی، اب اگر وہ شخص جس کی وہ چیز تھی معاف بھی کردے تو چوری کرنے سے اُس شخص کی عزت پر جو داغ آگیا وہ کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتا، غرض اچھے افعال سے روح میں جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے، اور بُرے کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے اسی کا نام عذاب و ثواب ہے، اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہے، امام غزالی مضنون به علی غیر اہلہ میں لکھتے ہیں،

اما العقاب علی ترك الامر و ارتكاب	امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا
النهی فلیس العقاب من اللّٰه غضبا	اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئیگا اور
و انتقاما و مثال ذالك ان من	وہ انتقام لیگا، بلکہ اسکی مثال یہ ہو کہ جو شخص
غادر الوقاع عاقبه اللّٰه بعدم	عورت کے پاس نہ جائیگا اُسکے اولاد نہ ہوگی
الولد فكذالك نسبة الطاعات	طاعت و معصیت کیوجہ سے قیامت میں جو
والمعاصی الی الآلام الآخرة و	ثواب و عذاب ہوگا اسکی بالکل یہی مثال ہو
لذاتها من غیر فرق فالسؤال	لہذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں
عن انه لم تقضی المعصیة الی	ہوتا ہے، گویا یہ سوال کرنا ہے کہ زہر
العقاب كالسؤال فی انه لم	کھانے سے جاندار کیوں مرجاتا ہے،

(مضنون به علی غیر اہلہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹)

صرف اسی قدر نہیں بلکہ نمازوں میں جب شہادت اوا کرتے ہیں تو رسالت کے اقرار سے پہلے عبدہٗ کا لفظ کہتے ہیں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ یعنی ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمدؐ خدا کے بندے ہیں، اور پھر رسول ہیں"۔ یہ کیوں؟ اسلئے کہ خدا کی توحید کا کمال یہی ہے کہ اس کے آگے کوئی شخص گو وہ کسی درجہ کا ہو، بندگی کے درجہ سے بڑھنے نہ پائے، چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خالص توحید دنیوں میں جانشین کرنی تھی، اسلئے ضرور تھا کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے صرف عبدیت اور رسالت کا سادہ لقب اختیار کیا جائے،

سزاوجزا

معاد اور عذاب و ثواب، سزاوجزا کے متعلق تمام اہل مذاہب کا یہ خیال تھا، اور آج بھی ہے، کہ انسان جب خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تو خدا اُس سے ناراض ہوتا ہے اور چونکہ دنیا دار العمل ہے، اسلئے یہاں تو انسان کو سزا نہیں ملتی، لیکن جب قیامت میں خدا مسند حکومت پر متمکن ہوگا تو تمام معاملات اُسکے حضور میں پیش ہونگے اور خدا حسب مراتب لوگوں کو ان کی نافرمانیوں کی سزا دیگا، اسی طرح جن لوگوں نے اطاعت اور فرماں برداری کی ہے، اُن کو صلے اور انعامات ملیں گے،

یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے اور عام لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طرز نہیں ہوسکتا،

حقیقت

لیکن یہ عذاب و ثواب کی اصلی حقیقت نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنے کا ایک پیرایہ ہے، اصل یہ ہے کہ جس طرح عالم جسمانیات میں اسباب و علل اثر اور موثر کا سلسلہ ہے، مثلاً سنکھیا قاتل ہے، گلاب محرک نزلہ ہے، املتاس مسہل ہے، اسی طرح یہی سلسلہ روحانیات میں بھی قائم

گناہ گاروں کو دوزخ میں عذاب گوناگوں دیگا،" لیکن عذاب و ثواب کی جو حقیقت ہم نے
بیان کی، اسکو اگر ملحوظ رکھا جائے تو ملاحدہ کا اعتراض خود بخود اُٹھ جاتا ہی،

اسلام نے عذاب و ثواب کے متعلق، عام طور پر اگرچہ بیان کا وہی پیرایہ اختیار کیا جو
تمام اہلِ مذاہب کا تھا اور عام طبائع کے لئے وہی طریقہ ناگزیر بھی تھا، لیکن اس باب میں
اسلام کو جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے اصل حقیقت بھی صراحۃً اور کنایۃً ظاہر کی، اور یہی
وہ خصوصیت ہے جو ہر موقع پر، اسلام کو تمام اور مذاہب سے ممتاز کرتی ہے، تمام دیگر مذاہب میں
صرف عوام کی تلقین و ہدایت کا لحاظ ہے، اصل حقیقت سے یا خود بانیانِ مذہب بے خبر
تھے، یا اگر باخبر تھے، تو وہ خواص کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصد نہیں قرار دیتے تھے، بخلاف
اسکے اسلام تمام دنیا کی ہدایت کے لئے آیا جسمیں، عالم و جاہل، احمق و دانا، عارف و عامی
زاہد و صوفی، ظاہر پرست اور حکیم سب داخل تھے،

عذاب و ثواب اور معاد کی اصل حقیقت کی طرف قرآن مجید میں جابجا اشارے
بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں،

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ	ہاں اگر تم کو علم الیقین ہوتا تو تم
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝	دوزخ کو دیکھ لیتے،

امام غزالی جواہر القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

اَیْ اِنَّ الْجَحِيْمَ فِيْ بَاطِنِكُمْ	یعنی دوزخ خود تمھارے اندر موجود ہی

ایک اور مقام پر ہے،

امام صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی تصریح کردی ہے کہ خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن باتوں سے روکا ہے اسکی مثال یہ ہے جس طرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے، مریض اگر طبیب کے حکم کے موافق عمل نہیں کرتا تو اسکو ضرر ہوتا ہے، یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مریض نے بدپرہیزی کی، لیکن عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی اسلئے ضرر ہوا حالانکہ ضرر کی اصلی علت بدپرہیزی ہے فرض کرو، کہ طبیب بدپرہیزی سے منع نہ بھی کرتا تاہم بدپرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا اسی طرح خدا گناہوں کے ارتکاب سے منع نہ بھی کرتا تاہم ان گناہوں کے ارتکاب سے روح کو وہی صدمہ اور عذاب ہوتا،

ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا کو گناہ پر عذاب دینے سے کیا حاصل؟ سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے جس کو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو، یا پہنچنے کا اندیشہ ہو، اور خدا اس سے بری ہے اگر تمام عالم فسق و فجور میں پڑ جائے یا نماز روزہ نہ بجا لائے، تو اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے اس صورت میں انتقام لینا بے فائدہ ہے،

ملاحدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت تمام اہل مذاہب نے خدا کا تصور بالکل انسانی حیثیت سے کیا ہے، اور چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بادشاہوں کو احکام کی نافرمانی سے سخت طیش اور ملال ہوتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سخت سزائیں دیتے ہیں، اسلئے اہل مذاہب نے خدا کی نسبت بھی یہی خیال قائم کیا، کہ وہ گناہوں سے ناراض ہوتا ہے، اور قیامت میں

لے امام صاحب کی اصل عبارت ہم نے الغزالی میں نقل کی ہے،

مسئلہ عبادت کے متعلق تمام دیگر مذاہب کی غلطیاں

چیز ہے اور اُس کا مقصد صرف خدا کی اطاعت کا اظہار ہے، اسکی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک بادشاہ نے اپنے کسی نوکر کی وفاشعاری کا اطاعت کا امتحان لینا چاہا اور اس بنا پر حکم دیا کہ وہ تمام شب ایک پاؤں کھڑا رہے، اس سے نہ بادشاہ کا کوئی نفع ہے، نہ نوکر کا کوئی فائدہ، بلکہ صرف نوکر کی اطاعت کا امتحان ہے، اسی طرح ہم جو نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، تو اس سے فقط امتثالِ امر مقصود ہے، خدا نے حکم دیا، ہم بجالائے، جس قدر ہم تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے، مہینوں کھانا چھوڑ دینا، ایک پاؤں پر رات رات بھر کھڑا رہنا، ہاتھ کو ہوا میں معلق رکھکر خشک کر دینا، جاڑوں میں برہنہ آسمان کے نیچے سونا، چالیس چالیس دن کا چلہ کھینچنا، شادی نہ کرنا، تمام عمر جوگی پن اور رہبانیت میں بسر کرنا، اس قسم کی جو باتیں ہندوؤں، عیسائیوں، اور دیگر مذاہب میں پائی جاتی ہیں، سب کی بنیاد اسی خیال پر ہے،

اس خیال نے یہاں تک ترقی کی کہ جان کی قربانی تک نوبت آئی، بہت سے لوگ خود اپنے آپ کو بل چڑھا دیتے تھے، ان سے گھٹ کر اولاد کی قربانی کرتے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو خیال یا خیالات آسکتے ہیں، وہ صرف وہی ہوتے ہیں جو گرد و پیش کی چیزوں سے پیدا ہو سکتے ہیں، انسان کسی ایسی چیز کا خیال نہیں کر سکتا جو اُسکے حواس سے بالاتر ہو، اُس نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہی، اُسی کو بڑھا کر، گھٹا کر، گا کر، یا ترتی دیکر، ظاہر کرتا ہے، لیکن کوئی خیال خود پیدا نہیں کر سکتا،

انسان کے دل میں جب خدا کا خیال ایک شاہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے آیا

یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ	کفار تجھ سے کہتے ہیں کہ عذاب جلد آجائے،
جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکَافِرِیْنَ	حالانکہ دوزخ نے کافروں کو ہر طرف سے چھالیا ہے

امام غزالی اس آیت کے متعلق، جواہر القرآن میں لکھتے ہیں،

ولم یقل انما ستحیط بل قال هی محیطة	خدا نے یہ نہیں کہا کہ دوزخ آیندہ محیط ہو جائیگی بلکہ یہ کہا کہ محیط ہے

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے،

اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا	ہم نے ظالموں کیلئے ایسی آگ مہیا کر رکھی ہی جسکے
اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا	پردوں نے ظالموں کو گھیر لیا ہی،

امام غزالی اس کے متعلق لکھتے ہیں،

ولم یقل یحیط بهم	خدا نے یہ نہیں کہا کہ آیندہ گھیر لیگی بلکہ یہ کہا کہ اسوقت گھیر لیا ہی

امام صاحب ان آیتوں کی یہ تفسیر لکھ کر لکھتے ہیں،

فان لم تفهم المعانی کذالک	تو اگر تم مطالب کو اسطرح نہیں سمجھتے تو تم کو
فلیس لک نصیب من القرآن	قرآن سے صرف اس کا چھلکا ہاتھ آیا ہی جس طرح
الا فی قشوره کما لیس للبهیمة	بہائم کو گیہوں میں سے صرف بھوسی
نصیب من البر الا فی قشره،	ہاتھ آتی ہی،

عبادت اس مسئلہ کے متعلق بھی تمام مذاہب کو ہمیشہ غلطیاں واقع ہوتی آئیں، تمام مذاہب نے اس مسئلہ کے متعلق نہ صرف ایک بلکہ متعدد اور نہ صرف ایک طرح کی بلکہ مختلف قسم کی غلطیاں کیں، سب سے بڑی یہ غلطی ہے کہ عموماً لوگ سمجھتے آتے ہیں کہ عبادت خود ایک مقصود بالذات

عبادت

یہ وہ اصول ہیں جو اس زمانۂ ترقی میں یورپ نے دریافت کئے جب کہ فطرت کے
رازہاے سربستہ کا طلسم کھل گیا ہے، لیکن قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے یہ اسرار بتادئے
تھے، سب سے پہلے یہ بتایا کہ خدا کو بندوں کی عبادت کی کچھ پروا نہیں،

مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ	جو شخص محنت اُٹھاتا ہے تو اپنے
لِنَفْسِهٖ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ	لئے اُٹھاتا ہے، خدا تمام عالم
عَنِ الْعَالَمِيْنَ،	سے بے نیاز ہے،

پھر کلی طور سے بتایا کہ عبادات سے خود انسان کو فائدہ پہنچتا ہے، اور خدا نے جو عبادات
کا حکم دیا ہے خود انسان کے فوائد کے لحاظ سے دیا ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ	جو شخص اچھا عمل کرتا ہے اپنے لئے
مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا،	کرتا ہے اور جو بُرا کرتا ہے تو اپنے لئے،
مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ	خدا یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے
حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ	اوپر کچھ دقت پیدا کرے بلکہ وہ یہ چاہتا
وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ	ہے کہ تمکو پاک کرے اور تمپر اپنی نعمت کو تمام کرے،

پھر عبادات میں سے ایک ایک عبادت کے الگ الگ نتائج اور فائدے بیان کئے،

نماز کی نسبت کہا

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ	نماز فحش اور لغویات سے روکتی ہے،

روزہ کی نسبت فرمایا،

توضرور تھا کہ اُس کے صفات بھی اُسی شاہنشاہی رتبہ کی حیثیت سے ذہن میں آئیں، انسان نے شاہوں اور شہنشاہوں کے متعلق جو کچھ دیکھا یا سنا تھا یہی تھا کہ وہ اظہارِ اطاعت سے خوش ہوتے ہیں، جان نثاری، ادب، عاجزی، خشوع اور تعظیم کو پسند کرتے ہیں، اور جو شخص جس قدر زیادہ ان خدمات کو بجا لاتا ہے، وہ انعامِ سلطانی کا اسی قدر زیادہ مستحق ہوتا ہے انہی خیالات کے لحاظ سے انسان کو خدا کی عبادت کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ ہر مذہب میں عبادت کے جس قدر اقسام ہیں سب میں انہی اصول کا عنصر پایا جاتا ہے، یہی بات ہے جس کی بنا پر یورپ کے ملاحدہ کہتے ہیں، کہ مذہبی خیالات، خود انسان نے اپنے حالات کے اقتضا سے پیدا کر لئے ہیں، یورپ میں حکماے حال نے جب فطری مذہب کے اُصول و فروع منضبط کئے تو عبادت کی حقیقت پر غور کیا چنانچہ اُنھوں نے اس کے لئے

یہ اُصول قرار دیئے،

(۱) انسان کے جس قدر فرائضِ زندگی ہیں، مثلاً کسب معاش، پرورشِ اولاد، محبتِ وطن، وغیرہ وغیرہ ان سب کو عبادات میں شمار کیا جائے[۱]،

(۲) عباداتِ جسمانی مثلاً نماز روزہ وغیرہ مقصود بالذات نہ قرار دیجائیں بلکہ غرض یہ ہو کہ اُن پر کوئی اخلاقی نتیجہ مترتب ہو،

اعتدال کی حد سے متجاوز نہ ہوں،

(۴) یہ قرار دیا جائے کہ خدا کو عبادت سے کچھ غرض نہیں عبادت سے خود ہمارا فائدہ ہے،

۱؎ پروفیسر ژول سیماں (تطبیق صفحہ ۳)

اولاد کی خواہش کو صلحا و مقربین کے خصائص میں شمار کیا، قرآن مجید میں جہاں خواص امت کے اوصاف گنائے ایک وصف یہ بیان کیا،

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ ۝،

اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا ہماری بیویوں سے اور ہماری اولاد سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی کر،

اسی بنا پر تمام صحابہؓ جو اسلام کی اصلی تصویر تھے، زندگی کی ضروریات کو سچائی اور دیانت داری سے انجام دینا عبادت سمجھتے تھے، آج بھی مسلمانوں کا خیال ہو کہ صحابہؓ کا چلنا پھرنا، کھانا پینا، نکاح کرنا، خانہ داری کے کاموں کو انجام دینا، سب عبادت تھا؛ صحابہؓ کی تخصیص نہیں، ہر شخص کے یہ افعال عبادت ہیں، بشرطیکہ اسی طرح کئے جائیں جس طرح صحابہؓ کرتے تھے،

حقوق انسانی

حقوق انسانی، انسان کو مختلف طبقات انسان سے جو تعلقات ہیں وہ انسان پر مختلف حقوق پیدا کرتے ہیں، اور یہی حقوق علم الاخلاق اور قانون، بلکہ اصول تمدن کی بنیاد ہیں، دنیا میں جس قدر مذاہب ہیں سب نے کم و بیش ان حقوق سے اُس حد تک بحث کی ہے جہاں تک وہ اخلاق کے دائرہ میں آسکتے ہیں، بعض مذاہب نے زیادہ وسعت حاصل کی، اور نکاح و وراثت و وصیت وغیرہ کو بھی اپنے دائرہ میں داخل کر لیا ہے لیکن یہ تعلقات ایسے مشتبہ، نازک اور دقیق ہیں کہ اُن کے متعین کرنے میں اور پھر اُن سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں، اُن کے قرار دینے میں اکثر غلطیاں واقع ہوتی ہیں، ان تمام مسائل میں، اسلامی شریعت میں جو نکتہ سنجی پائی جاتی ہے، اس کی نظر بانیان مذہب

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ — غالباً تم پرہیزگار ہو جاؤگے،

حج کی نسبت فرمایا،

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (حج) — تاکہ اپنے فائدہ کی جگہ آئیں،

زکوٰۃ کے فوائد محتاجِ بیان نہیں،

ان باتوں کے ساتھ تمام عبادات میں اس بات کو ملحوظ رکھا کہ اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائیں اور اُن کے ادا میں کسی قسم کی دقت اور دشواری نہ پیش آئے

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۝ — خدا تم سے آسانی چاہتا ہے نہ دشواری،

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۝ — خدا نے مذہب میں تم پر کسی قسم کی دقت نہیں رکھی،

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ — خدا چاہتا ہے کہ تمہارا بوجھ ہلکا کردے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — خدا کسی کو اُسکی سکت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

اِن سب باتوں سے بڑھکر یہ کہ انسان کی تمام ضروریاتِ زندگی کو عبادت قرار دیا اور اُنکے ادا اور بجالانے کی تاکید کی،

تجارت کے متعلق فرمایا،

فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۝ — دنیا میں پھیل جاؤ اور خدا کے عطیہ (رزق) کو ڈھونڈھو۔

بات کو جائز رکھتے تھے، کہ ضعیف اولاد ضائع کر دیجائے، ارسطو کی رائے تھی کہ لنگڑے لڑکے پرورش کے قابل نہیں، اسپارٹا میں جب لڑکا پیدا ہوتا تھا، تو بزرگانِ قوم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، اگر وہ تندرست اور قوی ہوتا تھا تو زندہ رکھا جاتا تھا، ورنہ ٹایجٹس پہاڑ پر سے اُس کو گرا دیتے تھے، اور بہت سی قوموں میں اس قسم کا رواج پایا جاتا تھا، سب سے پہلے قرآن مجید نے اس جور و ظلم کو مٹایا،

اسلام نے قتل اولاد کو مٹایا،

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ	اپنی اولاد کو قتل نہ کرو،
وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ	اور اسی طرح ان کے شرکوں نے
الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ	اولاد کے قتل کرنے کو ان کی نظر
شُرَكَاۗؤُهُمْ	میں اوچھا دکھلایا،

عورتوں کے حقوق، عورت جو نوعِ انسانی کا نصف حصہ ہے، اسکے حقوق کی نسبت دنیا کے مختلف حصوں میں سیکڑوں ہزاروں قانون بنے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اسوقت تک اس فرقہ نے اپنے حقوق کی داد نہ پائی، جب تک اسلام دنیا پر سایہ افگن نہ ہوا،

دنیا کے مختلف ممالک کو فطرت نے خاص خاص خصوصیتوں میں ممتاز پیدا کیا تھا، ان میں سے رومن کو قانون سے خاص مناسبت تھی جس طرح یونان کا فلسفہ، اٹلی کی مصوری ایران کی نفاست پسندی، شہرتِ عام رکھتی تھی، اسی طرح، رومن کا قانون تمام دنیا میں اعلیٰ اور افضل تسلیم کیا جاتا تھا، رومن کے قانون آج بھی تمام یورپ کے قوانین کا سنگِ بنیاد ہیں، اس اعلیٰ ترین قانون میں عورتوں کے جو حقوق تھے وہ یہ تھے: عورت شادی کے بعد

اور حکما کسی کے ہاں نہیں مل سکتی، اور یہ اس بات کی قطعی دلیل ہو کہ شارع اسلام ﷺ نے جو کچھ کہا وہ الہام اور وحی تھا، ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ جن نکتوں تک بڑے بڑے حکما کی بھی رسائی نہ ہوسکی، وہ ریگستان عرب کے ایک اُمی کی زبان سے ظاہر ہوتے،

حقوق انسانی کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے آپ پر کیا حق حاصل ہی، جہاں تک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے تمام دنیا میں یہ مسئلہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ہر شخص اپنے نفس کا آپ مالک ہے، اسی بنا پر خودکشی کرنا کوئی جرم نہیں خیال کیا جاتا تھا، یونان کے بڑے بڑے حکما خودکشی کو جائز سمجھتے تھے، یہاں تک کہ وہاں کے بعض نامور حکما نے اپنے تئیں آپ ہلاک کرلیا تھا،

خودکشی کا مسئلہ

سب سے پہلے قرآن مجید نے اس نکتہ کو ظاہر کیا اور اس بنا پر خودکشی کی ممانعت کی،

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو،

اسلام نے خودکشی کو مٹا دیا،

اس مسئلہ نے اولاد کے حقوق پر بڑا اثر کیا تھا، انسان، اولاد کو درحقیقت اپنا ہی ایک دوسرا وجود خیال کرتا ہے، اسی بنا پر اولاد کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہے اور چونکہ انسان اپنے نفس کا آپ مالک ہے، اس لئے جس قسم کا اختیار اس کو اپنی ذات پر ہے اولاد کی نسبت بھی خیال کرتا ہے، اسی بنا پر مختلف شکلوں میں قتل اولاد کی بنیاد قائم ہوگئی تھی، ہندوستان اور کارتھج میں عین تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی اولاد کو بتوں اور دیویوں پر نذر چڑھاتے تھے، ہندوستان اور خود عرب میں نہایت کثرت سے دخترکشی جاری تھی، اسپارٹا اور رومن میں بدصورت اولاد کو راستہ پر پھینک دیتے تھے، ارسطو اور افلاطون جیسے نامور حکیم اس

تمام دنیا میں قتل اولادکسی نہ کسی صورت میں رائج اور جائز تھا

کے باپ کو ملتی تھی،

ہندوؤں کے ہاں بعینہٖ رومن لا کے سے قواعد تھے یعنی اسکی جائداد، شوہر کو مل جاتی تھی، وہ کسی قسم کی خود مختارانہ معاملہ معاہدہ کی مجاز نہ تھی، بیوی، لڑکی، ماں وغیرہ کو میراث کا کوئی حصہ (بجز حق پرورش کے) نہیں ملتا تھا،

عرب جو اسلام کا سرچشمہ ہے وہاں یہ حالت تھی کہ عورت کو وراثت کا مطلقاً کوئی حصہ نہیں پہنچتا تھا، باپ مرتا تھا تو اسکی بیویاں، بیٹے کو وراثت میں ملتی تھیں اور وہ ان کو اپنی بیویاں بنا لیتا تھا، نکاح کے چار طریقے تھے جن میں سے تین طریقے حسب ذیل تھے، دو شخص اپنی بیویوں کو مدت معین کے لئے آپس میں بدل لیتے تھے، چند آدمی ایک عورت کے ساتھ مباشرت کرتے تھے اور دوسرے تیسرے دن وہ عورت ان میں سے کسی کے پاس کہلا بھیجتی تھی کہ تم سے مجکو حمل رہ گیا ہے، پھر وہ اسکی اولاد قرار پاتی تھی، چند آدمی ایک عورت کے ساتھ ہم صحبت ہوتے تھے، اور جب لڑکا پیدا ہوتا تھا تو قیافہ شناس یہ فیصلہ کرتا تھا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے چنانچہ وہ اسکی اولاد قرار پاتا تھا چنانچہ نکاح کی یہ تینوں صورتیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے مذکور ہیں،

اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق دیئے،

اب دیکھو قرآن مجید نے عورتوں کے حق میں کیا کیا، لیکن اسکے بتانے کے قبل اس امر کا ذکر کرنا ضرور ہے، کہ یورپ کے اکثر مصنفوں کا دعویٰ ہے کہ "اسلام میں جس قدر احکام اور مسائل ہیں وہ سب دوسرے مذاہب کی نقل ہیں، شارع اسلامؐ نے اپنی طرف سے خود کوئی نیا مسئلہ اضافہ نہیں کیا، عورتوں کے متعلق عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں کے،

عورتوں کے حقوق

شوہر کی زر خرید جائداد ہوجاتی تھی، اس کا تمام مال و متاع خود بخود شوہر کی ملک ہوجاتا تھا وہ جو کچھ زر و مال پیدا کرتی تھی سب شوہر کا مملوکہ ہوجاتا تھا، وہ کوئی عہدہ نہیں پا سکتی تھی، وہ کسی کی ضامن نہیں ہوسکتی تھی، وہ ادائے شہادت کے قابل نہ تھی، وہ کسی سے کوئی معاہدہ نہیں کرسکتی تھی، یہاں تک کہ مرنے کے وقت کوئی وصیت بھی نہیں کرسکتی تھی[1]،

رومن سلطنت نے جب عیسائی مذہب قبول کیا تو کچھ کچھ اصلاحیں ہوئیں، لیکن وہ اصلاحیں محض وقتی تھیں یعنی چند روز کے بعد پھر وہی پرانے اصول قائم ہوجاتے تھے، ۵۸۶ء میں ایک بہت بڑا جلسہ یورپ میں اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے منعقد ہوا

رومن لا

کہ عورت کی روح ہے یا نہیں، جلسہ نے بڑی فیاضی سے کام لیکر اس قدر تسلیم کیا کہ عورت نوع آدم میں داخل ہے، اور اسلئے ذی روح بھی ہے، لیکن اسکے پیدا کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ مرد کی خدمت کرے،

انگلستان میں ایک مدت تک اسی قسم کے قوانین جاری رہے یعنی نکاح کے بعد عورت کا وجود شوہر کا وجود ہوتا تھا، وہ خود کسی قسم کا معاہدہ نہیں کرسکتی تھی، اسکی تمام جائداد شوہر کی ملک ہوجاتی تھی، اور وہ اس کو جس طرح چاہتا صرف کرسکتا تھا، تیس برس سے کم ہوئے کہ وومن ایکٹ بنا جس سے ان قوانین میں اصلاح ہوئی تاہم بہت سی بے اعتدالیاں اب تک قائم ہیں،

یہودیوں کے ہاں نکاح درحقیقت عورت کا خرید لینا تھا، اور اُسکی قیمت عورت

---

[1] برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا، لفظ وومن (عورت)

يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا	ان دونوں میں سے بڈھا ہو جائے تو نہ
اَوْكِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ	جھڑک انکو اور نہ ڈانٹ بتا، اور اُن سے
وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا	ادب کی بات کر، اور ان کے آگے
كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ	پیار سے عاجزی کے کندھے جھکا
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ	اور کہہ کہ اے خدا ان پر رحمت
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا،	کر جس طرح دونوں نے مجکو بچپن میں پالا،

ماں کے حقوق کو زور دے کر بیان کیا،

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ	ماں نے اسکو پیٹ میں تکلیف کیساتھ
كُرْهًا (احقاف-۲)	رکھا، اور تکلیف سے جنا،

رومیوں اور ہندوؤں کے اس قانون کے مقابلہ میں کہ عورت کا مال و متاع سب شوہر کا ہو جاتا ہے، قرآن نے یہ کہا،

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا	مرد جو کمائیں وہ ان کا ہے، اور عورتیں
وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ	جو کمائیں وہ انکا،

ہندوؤں میں اور خود عرب جاہلیت میں عورت جو میراث سے بالکل محروم رہتی تھی اس کے مقابلہ میں یہ کہا،

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ	باپ ماں اور رشتہ داروں کی
وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ	وراثت میں مردوں کا حصہ ہے اور (سلسلہ)

ہاں جو قواعد تھے وہ تم پڑھ چکے، اب خیال کرو کہ اسلام نے اُن کی نقل کی ہے یا خود ایسے فلسفیانہ اُصول اور مسائل قائم کئے، جن کی طرف کبھی کسی کا خیال بھی نہیں پہنچا تھا،

سب سے پہلے قرآن مجید نے یہ بتایا کہ عورت و مرد میں کس قسم کا فطری تعلق ہے اور یہ کہ عورت، انسانی معاشرت کی جزو اعظم اور مرد کی راحت و تسلی ہے،

وَخَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا	اور تمہارے لئے خود تمہاری ہی جنس سے
لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم	جوڑے پیدا کئے تاکہ تم انکے پاس آرام پاؤ
مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (روم)	اور تم دونوں میں محبت اور پیار پیدا کیا،

پھر مختلف پیرایوں میں یہ ظاہر کیا کہ مرد، عورت، برابر درجہ کے دو رفیق ہیں، دونوں ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں، دونوں کے تعلقات، دونوں کی حیثیت، دونوں کے حقوق برابر درجہ کے ہیں،

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ)	عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اُنکا،
لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ	عورتوں پر مردوں کے جو حقوق ہیں
بِالْمَعْرُوفِ،	اسی قسم کے اُنکے حقوق مردوں پر ہیں،

قرابت کے تعلقات کے جو مدارج ہیں، اُن میں مرد عورت، ایک درجہ پر ہیں، مثلاً ماں باپ کا ایک درجہ ہے، بہن، بھائی کی ایک حیثیت ہے، چچا اور پھوپھی کا یکساں مرتبہ ہے، قرآن مجید میں باپ ماں کا جہاں ذکر ہے، برابر درجہ کی حیثیت سے ہے،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَإِمَّا	اور ماں باپ سے نیکی کرنا، اور جو کوئی

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ — اور معاشرت کرو عورتوں سے بہ طرز معقول

زن و شوئی کے تعلقات میں سب سے اہم اور نازک مسئلہ طلاق کا مسئلہ ہے، اس بحث کے نازک اور مشکل ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجودیکہ دنیا کی تمام قوموں نے اسکے متعلق مختلف پہلو اختیار کئے، لیکن سب کے سب غلط تھے، اور آج بھی جب کہ دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے، یہ غلطیاں قائم ہیں، عیسائیوں میں اس قدر سختی ہے کہ زنا کے سوا کسی حالت میں طلاق ہو ہی نہیں سکتی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل یورپ میں جو تہذیب و تمدن کا مرکز ہے، اس مسئلہ کی وجہ سے ہمیشہ نہایت سخت ناگوار اور پُر فضیحت واقعات پیش آتے رہتے ہیں، سیکڑوں زن و شو ہیں جن میں حد درجہ کی سوء مزاجی اور نااتفاقی ہے، ناموافقت نے دونوں کا عیش تلخ کر دیا ہے، ملنا جلنا بالکل بند ہے، ازدواج کے جو فوائد اور مقاصد ہیں، وہ بالکل معدوم ہیں، سالہا سال اسی کوفت میں بسر ہوتے ہیں، لیکن اس مصیبت سے چھوٹنے کی صرف یہ تدبیر ہے کہ زنا کا واقعہ ثابت کیا جائے، بڑے بڑے امرا اور اعیانِ سلطنت، عدالتوں میں اپنی بیویوں کی زناکاری کا دعویٰ کرتے ہیں، اور سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں اس شرمناک واقعہ کی شہادت پیش کرتے ہیں، مدتوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، اور اسکے متعلق جو کاغذات مرتب ہوتے ہیں، وہ ہر قسم کی فضیحتی، رسوائی، بے شرمی اور بے حیائی کا انبار ہوتے ہیں، لیکن یہ سب اسلئے گوارا کرنا پڑتا ہے کہ ان بے حیائیوں کے بغیر عورت کے پنجہ سے رہائی نہیں ہو سکتی، ہندو قانون بھی اس باب عیسائیوں ہی کے مشابہ ہے،

مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ، — باپ، ماں، اور رشتہ داروں کی وراثت میں عورتوں کا حصہ ہی،

دختر کشی کی رسم کو ان لفظوں سے مٹایا اور اس طرح مٹایا کہ تیرہ سو برس سے آج تک مسلمانوں میں ایک واقعہ بھی وجود میں نہ آیا،

وَاِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ، (کورت ۱۰) — اور جبکہ مَوْءُودَة (زندہ دفن کی ہوئی لڑکی) سے قیامت میں سوال ہوگا کہ کس جرم پر وہ قتل کی گئی تھی،

جاہلیت میں دستور تھا، کہ جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو اُس کے بھائی زبردستی اُسکی بیوہ سے نکاح کر لیتے تھے، یا اُس کو نکاح سے باز رکھتے تھے، اور جب اُس سے کچھ رقم وصول کر لیتے تھے تب شادی کی اجازت دیتے تھے، ان رسموں کو یہ کہکر مٹایا،

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا وَّلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ، — تمکو یہ جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کو وراثت میں لیلو اور نہ یہ کہ انکو روکے رکھو تاکہ جو کچھ انکو مل چکا ہی اس میں سے کچھ لے لو،

مہر جو لڑکی کے باپ کو ملتا تھا، اور جس کے عوض وہ گویا لڑکی کو فروخت کر دیتا تھا، اس کے بجائے یہ کہا،

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ — اور دو عورتوں کو اُنکے مہر خوشی سے،

روزانہ معاشرت میں عورتوں کے ساتھ جس لطف، محبت، یگانگت، مساوات کے ساتھ پیش آنا چاہیے، اُسکو ان جامع الفاظ میں ادا کیا،

عَلَيْهِمَا اَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا — کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں صلح کرلیں

صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (نساء) — اور صلح اچھی چیز ہے،

پھر عورت کی بدخوئی اور بدمزاجی کے رفع کرنے کی تدبیریں بتائیں کیونکہ بدمزاجی کو ہمیشہ برداشت کرتے رہنا حقیقت میں تکلیف مالا یطاق ہے،

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ — اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمکو خوف

وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ — ہو تو انکو نصیحت کرو اور انکو چھوڑ دو انکی

اضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ — خوابگاہ میں، اور انکو مارو (خفیف طور پر) پھر

فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا۔ — وہ اگر کہا مان لیں، تو انکے خلاف حیلے

اس پر بھی اگر اتفاق اور آشتی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں قبل اسکے کہ خود مرد اور عورت کوئی فیصلہ کریں، اس بات کا حکم دیا کہ قوم کو اس معاملہ میں مداخلت کرنی چاہئے کیونکہ اس قسم کے معاملات میں، جو تمدن اور معاشرت انسانی سے تعلق رکھتے ہیں، ہر شخص مجموعہ قومی کا ایک جزو ہے، اور اس کے افعال اور اعمال کا اثر تمام قوم پر پڑتا ہے، اس لئے پبلک اور قوم کو اس میں مداخلت کا حکم دیا اور فرمایا،

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا — اور اگر تم کو خوف ہو کہ آپس میں ناراضی

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ — ہو جائیگی تو ایک پنچ مرد کے گھرانے سے

حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا — اور ایک عورت کے گھرانے سے مقرر کرو،

یہ تدبیر بھی اگر کارگر نہ ہوئی اور مرد نے قطعی ارادہ کرلیا کہ طلاق دیگا، تو اس ناگزیر

دوسری طرف یہودی ہیں، جن کے ہاں بات بات پر طلاق جائز بلکہ مستحسن ہے، کھانے میں نمک تیز ہو جائے یا اپنی بیوی سے زیادہ خوبصورت عورت ہاتھ آ جائے تو بے تکلف طلاق دیجا سکتی ہے، اب دیکھو اسلام نے اس نازک اور دقیق مسئلہ کو کیونکر حل کیا، قرآن مجید نے پہلے مختلف پیرایوں میں یہ تلقین کی کہ مرد و عورت کا تعلق، نفس پرستی اور رفع شہوت کیلئے نہیں ہے، بلکہ حسن معاشرت اور پائدار ربط والفت کے لئے ہے،

مُحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ (نساء) — قید میں رہنے کو نہ مستی نکالنے کو،

وَخَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً — اور تمہاری جنس سے تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم تسکین پاؤ ان سے اور تم دونوں میں پیار اور محبت پیدا کی،

اب فرض کرو کہ کسی مرد کو عورت ناپسند آئے اور اس سے قطع تعلق کرنا چاہے، اس صورت میں اسلام نے تاکید کی کہ مرد کو تحمل اور صبر سے کام لینا چاہیئے،

فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا (نساء) — تو اگر تم انکو ناپسند کرو، تو یہ ہو سکتا ہے کہ تمکو ایک چیز ناپسند ہو، اور خدا اس میں بہت کچھ بھلائی پیدا کرے،

یہی تلقین عورت کو بھی کی،

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ — اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کیطرف سے ناراضی یا بیرخی کا ڈر ہو تو اس میں

اس کے ساتھ یہ قرار دیا کہ طلاق دینا کوئی خانگی معاملہ نہیں، بلکہ اُسکو قوم کے سامنے ظاہر کرنا اور شہادت دلوانا پڑیگا،

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ،

پھر جب وہ پہنچیں اپنی عدت کو، تو یا رکھو انکو معقول طریقہ پر، یا چھوڑ دو معقول طریقہ پر، اور گواہ مقرر کرو اپنے معتبر آدمی اور ٹھیک گواہی دو خدا کے لئے،

اس سے یہ غرض ہے کہ طلاق جب ایک پبلک معاملہ قرار پائیگا، اور اسکے ثبوت کے لئے گواہ اور شاہد مقرر کرنے ہونگے تو غیرت مند آدمی مشکل سے طلاق پر آمادہ ہوگا،

ان تمام باتوں کے ساتھ مرد نے طلاق دے ہی دی تو اس صورت میں قواعد ذیل کی پابندی ضروری قرار دی،

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ (طلاق-۱) اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ، وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا (طلاق-۱)

عدت کے زمانہ میں عورتوں کو انکے گھروں سے نہ نکالو ان کو رہنے کا مکان دو، جہاں تم خود رہتے ہو اپنے مقدور کے موافق، اور انکو نقصان نہ پہنچاؤ دق کرنے کو، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو بچہ جننے تک انکا نان و نفقہ دو اور اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو ان کو اجرت دو اور آپس میں نیکی کیسا

صورت میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی لیکن اس کے ساتھ کس قدر مختلف باتوں کا لحاظ رکھا،

سب سے پہلے یہ کہ طلاق کا یہ طریقہ بتایا کہ تین مہینے میں بتدریج طلاق دی جائے، یعنی ہر مہینہ میں ایک طلاق (اصطلاح میں اس فاصلہ کو عدت کہتے ہیں) یہ فاصلہ اس غرض سے مقرر کیا کہ شاید اس اثنا میں سوچ سمجھ کر، مرد اپنی رائے سے باز آجائے،

اس کے ساتھ پھر فرمایا،

وَبُعُولَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِی ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوا اِصْلَاحًا (بقرہ، رکوع ۲)	اور اُنکے خاوندوں کو زیادہ حق ہے کہ واپس لے لیں، اگر چاہیں صلح کرنی،

پھر یہ قاعدہ مقرر کیا کہ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ،	پھر اگر مرد نے طلاق دیدی تو اب وہ عورت اسکے لئے کبھی جائز نہ ہوگی جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کرے (اور شوہر ثانی بھی اسکو طلاق نہ دیدے)

اس قید کے لگانے سے یہ غرض ہے کہ مرد کو یہ خیال پیدا ہو کہ اگر میں نے طلاق دیدی اور آئندہ چل کر، میری طبیعت اتفاقاً پھر اسکی طرف مائل ہوئی تو اب اسکے ہاتھ آنے کی کوئی صورت نہ رہے گی، بجز اسکے کہ وہ دوسرے کے تصرف میں رہکر آئے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس عار کو کون گوارا کریگا، ع

عیبِ کُنندہ نامِ دگر چہ کار آید

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ) مرد پر ان کا کھانا اور کپڑا ہے دستور کے موافق

اکثر یہ ہوتا تھا کہ نکاح کے وقت مہر بہ تعداد کثیر باندھتے تھے، لیکن جب طلاق دیتے تھے تو مہر کا دینا گراں گذرتا تھا، اسلئے مختلف تدبیروں سے عورت پر زور ڈال کر مہر کو گھٹاتے تھے، اس کے لئے فرمایا،

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ	اور اگر تم چاہو ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری
مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ	بیوی کرنی اور دے چکے ایک کو (یعنی پہلی بیوی کو)
قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا	خزانہ تو اب اُن سے کچھ واپس نہ لو، کیا تم لینا
اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا	چاہتے ہو ناحق اور صریح گناہ سے اور کیونکر
وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى	لے سکتے ہو، حالانکہ ایک دوسرے تک پہنچ چکا
بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (نساء۔ ۳)	(یعنی زناشوئی کے تعلقات وقوع میں آچکے)

ان تمام احکام کا ماحصل یہ ہے کہ مرد نہایت سخت مجبوریوں سے اگر عورت کو طلاق دے تو تین مہینے کی مدت میں بہ تدریج ایک ایک طلاق دے، طلاق کے بعد عدت کے زمانہ تک جس کی تعداد تین مہینے ہے اس کے مصارف کا بار شوہر کے ذمہ ہوگا، اس مدت میں عورت کو کافی موقع ملے گا، کہ اپنے لئے نیا شوہر ڈھونڈھے، اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل اور اس کے بعد دو برس تک اور عورت کے مصارف شوہر کے ذمہ ہونگے، اس کے علاوہ مہر جو مقرر ہوا تھا وہ کل کا کل ہاتھ آئیگا، اور عورت کو تنگدستی کے ہاتھوں تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی،

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ،

اور مطلقہ عورتوں کو دستور کے موافق کھانا کپڑا دینا یہ حق ہے پرہیزگاروں پر،

اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ طلاق دیکر، عورت کو محبوس رکھتے تھے، اور اسکو نکاح ثانی کرنے نہیں دیتے تھے جس سے کبھی تو خواہ مخواہ عورت کو ستانا منظور ہوتا تھا، کبھی یہ مقصد ہوتا تھا کہ اس کو دق کر کے مہر معاف کرالیں، یا کوئی حصہ چھڑوالیں، کبھی صرف اس خیال سے روکتے تھے کہ اپنی بیوی کا دوسرے کے نکاح میں آنا عار خیال کیا جاتا تھا، ان باتوں کی اس طرح اصلاح کی،

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (بقرہ)

اور ان کو اس غرض سے روک نہ رکھو کہ ان پر ظلم کرو، اور جو شخص ایسا کریگا تو اپنے نفس پر ظلم کریگا،

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ (بقرہ - ۳)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور انکی عدت پوری ہو جائے تو اس بات سے انکو نہ روکو کہ وہ اپنے (آیندہ) شوہروں سے شادی کرلیں،

اگر مطلقہ عورت کو حمل ہے، تو بچہ جننے کے دو برس بعد تک مرد کو اسکا کھانا کپڑا دینا پڑیگا،

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس تک دودھ پلائیں جو شخص یہ چاہے کہ پوری مدت تک دودھ پلوائے، اور

ہیں تقسیم ہو کر پھیلے سی قدر زیادہ مفید ہے متمدن اور وحشی ممالک میں یہی چیز میز اور فارق ہے، شخصی سلطنتوں میں عموماً یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ بادشاہ اور اُس کے ارکان و مقربین دولت مند ہوتے ہیں، باقی تمام لوگ عموماً نادار اور کم مایہ ہوتے ہیں، بخلاف اسکے شایستہ ممالک میں بادشاہ سے لیکر انفار کے طبقہ تک، دولت درجہ بدرجہ علی قدرالمراتب اترتی آتی ہے،

اسلام کے قواعد وراثت تمامتر اصول عقلیہ پر مبنی ہیں،

اس اصول کا لحاظ، صرف اسلام کے قواعد وراثت میں پایا جاتا ہے، اسلامی قانون کے مطابق میت کے تمام رشتہ دار و قریب، درجہ بدرجہ وراثت سے متمتع ہوتے ہیں، ماں باپ چچا، دادا، بھائی، بہن، پھوپھی، خالہ، ماموں وغیرہ سب وراثت میں کچھ نہ کچھ حصہ رکھتے ہیں، وراثت کا اصلی اصول میت کا تعلق اور قرابت ہے یعنی جن لوگوں کو میت سے تعلق تھا، اور جو لوگ میت کے شریک رنج و راحت اور اُس کے اعضاء و جوارح تھے، اُن کو میت کی جائداد میں سے حصہ ملنا چاہیے، اس اصول کے موافق یہ نہایت تنگدلی ہے کہ صرف ایک قسم کے رشتہ دار، وراثت کے لئے خاص کر دئیے جائیں، بے شبہہ رشتہ داروں کے مراتب متفاوت ہیں، اور فرقِ مراتب کا لحاظ ضرور ہے، لیکن یہ صریح ظلم اور ناانصافی ہے کہ بجز ایک قسم کے رشتہ دار کے باقیوں کو بالکل محروم کر دیا جائے، اور یورپ کا یہ قانون تو بالکل خلافِ عقل ہے، کہ صرف اولادِ اکبر وارث ہو، اولاد کو جو تعلق میت سے ہے وہ تمام اولاد کو یکساں حاصل ہے، باوجود اس کے صرف کبیر السن ہونے کی وجہ سے ایک کو ترجیح دینا اور باقیوں کو بالکل محروم کر دینا بالکل اصولِ فطرت کے

کیا اس سے زیادہ، کوئی حکیم اور کوئی مقنن، عورتوں کے لئے عمدہ قانون بنا سکتا ہے؟ اور کیا اسلام کے سوا، دنیا کے کسی اور مذہب میں، اس رحم اور مراعات کی نظیر مل سکتی ہی؟[له]

وراثت، منجملہ ان قوانین کے جن میں دنیا کی قومیں ہمیشہ مختلف الآرا رہی ہیں اور آج بھی ہیں یہ مسئلہ بھی ہے، عیسائیوں میں صرف اولاد اکبر، جائداد غیر منقولہ کی وارث ہوتی ہے باقی اولاد کو گذارہ ملتا ہے، اولاد کے سوا باقی رشتہ دار بالکل محروم رہتے ہیں، ہندوؤں میں کل اولاد ذکور وارث ہوتی ہے لیکن اولاد ذکور کے سوا، اور قرابت داروں کو کچھ نہیں ملتا، لڑکیوں کو صرف نان و نفقہ ملتا ہے، عرب میں عورتوں کو مطلق وراثت نہیں پہونچتی تھی، بلکہ جہاں تک معلوم ہے اولاد ذکور کے سوا، باپ، بھائی، ماں، بہن وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ حصہ نہیں ملتا تھا، یورپ آج کل اس قدر تہذیب و تمدن میں ترقی کر گیا ہے، لیکن وراثت کا ابتک وہی قاعدہ ہے کہ صرف اولاد اکبر وارث ہوتی ہی،

وراثت

اب غور کرو کہ تمدن اور اصول فطرت کے لحاظ سے وراثت کے کیا اصول ہونے چاہئیں، اس بحث کا مدار دو سوالوں پر ہے ایک یہ کہ دولت کا زیادہ افراد میں منقسم ہونا اور پھیلنا بہتر ہے، یا ایک دو فرد میں محدود رہنا، دوسرے یہ کہ کسی شخص کے مرجانے پر اسکی جائداد اس کے عزیزوں کو کیوں ملتی ہی،

وراثت کس اصول پر مبنی ہے

علم تمدن کے اساتذہ نے یہ طے کر دیا ہے کہ دولت کی مقدار جس قدر زیادہ افراد

له اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہی کہ یہ احکام وہ ہیں جو قرآن مجید اور احادیث کے رو سے ثابت ہیں،

قدیم عیسائیوں کے عروج کا اصلی زمانہ رومن امپائر کا زمانہ ہے، یہ سلطنت ایک مدت دراز تک قائم رہی، اور اسکو وہ سطوت و شان حاصل ہوئی کہ دنیا کے دور و دراز حصوں میں اُن کے نام سے لرزہ پڑجاتا تھا، لیکن یہ عظیم الشان حکومت کیا تھی؟ فرنچ کی انسائیکلوپیڈیا میں اس کا خاکہ ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

"رومن کا نظامِ سلطنت کیا تھا، وہ بیرحمی اور سفاکی جس نے قانون کا لباس پہن لیا تھا، اس کے جو فضائل تھے یعنی شجاعت مگر پیش بینی، ترتیب، اتحاد باہمی وہ بعینہ چوروں اور ڈاکوؤں کے فضائل تھے، اسکی طینت بالکل وحشیانہ تھی، بے انتہا حُبِ جاہ، اجنبی قوموں کے ساتھ کینہ پروری، رحمدلی کے احساس کا فنا ہو جانا، ان چیزوں کے سوا وہاں اور کچھ نظر نہ آتا تھا، عظمت و شان جس چیز کا نام تھا وہ تیغ بازی، دزہ زنی، قیدیانِ جنگ کو سزا دینا، بچوں اور بوڑھوں سے گاڑی کھچوانا تھا"

یہودیوں نے غیر قوموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کے اندازہ کرنے کے لئے صرف یہ کافی ہے کہ خود توراۃ میں مذکور ہے کہ "خدا نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ دشمنوں کے ساٹھ ہزار آدمی جو گرفتار ہوئے تھے، اُن میں سے عورتیں اور بچے بھی زندہ نہ رہنے پائیں اور سب کے سب قتل کر دیئے جائیں"

اب دیکھو اسلام نے کیا کیا؟

قوم اور نسل کی تمیز تو سرے سے اٹھا دی، اسلام کا سرچشمہ عرب تھا لیکن اُس نے پارسی

لے تطبیق صفحہ ۳۲،

خلاف ہے،

اسلام نے نہایت دقیق اور نازک فرقِ مراتب کا لحاظ رکھا ہے میت کو جن جن رشتہ دارول سے جس درجہ کا تعلق تھا، نہایت دقتِ نظر سے اُن کے مراتب متعین کئے اور اسی نسبت سے ان کے مختلف اور کم و بیش حصے مقرر کئے،

حقوق عامۂ ناس، اسلام نے عام جماعتِ انسانی سے، نیکو کاری، خوش خلقی، فیاضی، رحمدلی کے ساتھ پیش آنے کا حکم نہایت اصرار اور تاکید کے ساتھ دیا ہے، لیکن ہم اس موقع پر اُن کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ اخلاقِ حسنہ کی عام تعلیم، تمام مذاہب کا اصل اصول ہے، اور اس میں کسی خاص مذہب کی خصوصیت نہیں، البتہ جو چیز ترجیح اور تفوق کا معیار رہے وہ یہ ہے کہ اور مذاہب نے غیر مذاہب والوں یا غیر قوموں کے ساتھ کس قسم کے سلوک کی تعلیم کی ہے؟

دنیا میں بڑی بڑی قومیں جو تمام دنیا پر چھا گئی تھیں، ہندو، پارسی، عیسائی اور یہودی تھے، ہندو مذہب نے ہندوستان کی تمام قوموں کو جو آرین نہ تھیں شودر کا لقب دیا، اور باوجود اتحادِ مذہب کے اُن کے لئے وہ قاعدے بنائے جس سے زیادہ سخت اور ذلت وہ قاعدے، کسی کے خیال میں نہیں آسکتے، وہ ہر قسم کی عزت، آزادی، عہدہ اور اختیارات سے محروم کردیئے گئے، انتہا یہ کہ اگر وید مقدس کی آواز، اتفاقیہ کسی شودر کے کان میں پڑ جائے تو اُس کے کان میں سیسہ پلا دینا چاہیئے، کیونکہ اُسکے ناپاک کان اس مقدس آواز کے بھی مستحق نہیں،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ	خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے
يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ	ہیں، اور اس حد سے آگے نہ بڑھو، خدا حد سے
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝	بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا
وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا	اگر تم بدلہ لو تو اسی طرح جیسا تم سے لیا گیا، اور
عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ	اگر صبر کرو تو صبر اچھا ہے، صبر کرنے
لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ (نحل-۱۲۰)	والوں کے لئے،
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ	کسی قوم کی دشمنی، تم کو اس بات پر آمادہ
أَنْ لَا تَعْدِلُوا ۝	نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو،

قرآن مجید میں اس قسم کے بھی اکثر الفاظ آئے ہیں کہ "کافروں کو جہاں پاؤ قتل کرو" "تمام کافروں سے لڑو" "کافر خدا کے دشمن ہیں" ان آیتوں سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ ہر مخالف مذہب سے دشمنی اور عداوت رکھنا مسلمانوں کا فرض مذہبی ہے۔

اسی بنا پر بعض متعصب مسلمانوں نے قرار دیا کہ پہلی قسم کی آیتیں منسوخ ہو گئیں لیکن اس تناقض کو خدا نے خود رفع کر دیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا،

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ	جو لوگ تم سے مذہبی لڑائی نہیں لڑے
يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ	اور تمکو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا انکی نسبت خدا
مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا	تمکو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم انکے ساتھ
إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ	بھلائی کرو اور انکے ساتھ انصاف کرو،

اسلام نے غیر مذہب اور غیر قوموں کو کیا حقوق دیئے

ہندو، ترک، تاتار، حبشی، افغانی غرض تمام دنیا کی قوموں کو اسلام قبول کرنے کے ساتھ عرب کا ہمسر بنا دیا، یورپ آج اس قدر آزادی کا مدعی ہے لیکن غیر قوموں کے ساتھ اُس نے جو تفرقہ قائم رکھا ہے، اس کو کسی طرح وہ مٹا نہیں سکتا، اگر کوئی شخص عیسائی ہو کر یورپ والوں کا ہم مذہب ہو جائے، تو پیشوایانِ مذہب اس کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ "قیامت میں وہ اُن کا ہمرتبہ ہوگا لیکن اس دارِ فانی میں جو حدِ فاصل قائم تھی وہ قائم رہے گی" برخلاف اس کے اسلام نے یہ کیا کہ غزنویہ، دیلمیہ، سلاجقہ، ترک، چراکسہ وغیرہ کو جن میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا، نوبت بہ نوبت شاہنشاہیاں بخش دیں، اور خود عرب کو اُن کا محکوم بنا دیا،

مخالفینِ مذہب کی اسلام نے دو قسمیں قرار دیں،

(۱) **ذمی** اور معاہد یعنی وہ لوگ جو اسلام کی حکومت میں رہتے ہیں یا جن سے صلح اور دوستی کا معاہدہ ہے،

(۲) **حربی** یعنی جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے، اور لڑائی اور مخاصمت قائم ہے یا قائم ہو سکتی ہے،

ذمیوں کو اسلام نے جان، مال، آزادی، عزت اور دیگر تمام حقوق کے لحاظ سے بالکل مسلمانوں کا ہمسر بنا دیا، لیکن چونکہ ہم نے اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام **حقوق الذمیین**[۱] ہے، اسلئے اس موقع پر ہم اُسکی تفصیل نہیں کرتے،

حربیوں کے ساتھ اسلام نے جس مراعات اور سلوک کا حکم دیا ہے: وہ آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوگا

[۱] دیکھئے مقالات شبلی حصہ اوّل (مذہبی) مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ،

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ، یہ اسلام بالکل سادہ صاف اور مختصر ہے، اور یہی سادگی ہو
جس کی بنا پر اسلام کو اور تمام مذاہب پر ترجیح ہے، یہی سادگی پر یورپ کا ایک محقق
ان الفاظ میں حسرت ظاہر کرتا ہے، اگر کوئی حکیم عیسائی مذہب کے طول طویل اور پرپیچ عقائ
مذہبی پر نظر ڈالے گا تو بول اُٹھے گا کہ آہ میرا مذہب ایسا سادہ اور صاف کیوں نہ ہوا کہ میں
ایمان لاتا ایک خدا پر اور اُس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، یہی دو لفظ تھے جن کے زبان پر
لانے سے اور یقین کرنے سے دفعتہً کافر مسلمان، گمراہ ہدایت یافتہ، شقی سعید، اور مردود
مقبول بن جاتا تھا لیکن زمانہ کے امتداد اور طبایع کے اختلاف نے اس متن پر سیکڑوں
حاشیے بڑھا دیئے، اور اب اسلام ایک ایسے مجموعہ مسائل کا نام ہوگیا ہی جس کو قرون اولی
کے لوگ سمجھانے سے بھی نہ سمجھتے اور عرب جن پر قرآن اُترا تھا، وہ تو آج بھی نہیں سمجھ سکتے،
طرہ یہ کہ یہی نوزائیدہ مسائل، کفر اور اسلام کا معیار قرار پاگئے، قرآن مجید مخلوق ہے یا قدیم؟
صفات الٰہی عین ذات ہیں یا غیر؟ اعمال جزو ایمان ہیں یا خارج؟ قرن اوّل میں ان مسائل
کا پتہ بھی نہ تھا لیکن زمانۂ مابعد میں انہی کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دیا گیا، تاریخ علم کلام میں
تم پڑھ چکے ہوگے کہ ان مسائل کی بنا پر کیا کیا قیامتیں برپا ہوئیں، بہرحال اب یہ مسائل
علم کلام کے ساتھ ایسا تعلق رکھتے ہیں کہ جدید علم کلام میں نفیاً یا اثباتاً ان کے ذکر سے چارہ نہیں

ان مسائل پر دو حیثیتوں سے بحث کرنی چاہئے،

(۱) ان مسائل کی نوعیت،

(۲) علم کلام کو واقعی ان سے کس حد تک تعلق ہی،

اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ	خدا تو تمکو ان لوگوں سے دوستی رکھنے کو
فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ	منع کرتا ہے جو تم سے مذہبی لڑائی لڑے اور
وَظَاھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْ	تمکو تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے
ھُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ	پر اعانت کی اور جو لوگ ایسے لوگوں سے دوستی
ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (ممتحنہ-۲)	کرتے ہیں وہ ظالم ہیں،

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ بجز اُس صورت کے کہ مخالفین مذہب مسلمانوں سے مذہبی لڑائی لڑیں، ورنہ ان کو اُن کے ملک سے نکال دیں، یا نکال دینے پر اعانت کریں اور کسی صورت میں، اُن سے دوستی رکھنا یا ان کے ساتھ بھلائی کرنا ممنوع نہیں۔ عیسائی اور بعض اور مذہبوں میں بظاہر اِس سے زیادہ فیاضانہ احکام نظر آتے ہیں، مثلاً انجیل میں ہے کہ "اگر تمھارے ایک گال پر کوئی شخص تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی پھیر دو کہ یہ بھی حاضر ہے" لیکن یہ اُس قسم کی باتیں ہیں جو بظاہر نہایت خوش نما ہیں، لیکن واقع میں فضول ہیں، کیونکہ فطرت انسانی کے خلاف ہیں' اور اِس وجہ سے عملی صورت میں کبھی ان کا ظہور نہیں ہو سکتا' اسلام کو جو تمام مذاہب پر ترجیح ہے وہ اسی بنا پر ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے الگ ہے، اور اس کے جس قدر احکام ہیں، تمام فطرت انسانی کے موافق ہیں،

بقیہ عقائد

بقیہ عقائد

اسلام کی اصلی بنیاد جن اُصولوں پر قائم ہے، وہ صرف توحید اور نبوت ہے من حال

مسائل عقائد جو قرآن میں مذکور نہیں،

دوسری بحث، پہلی قسم کے مسائل یعنی جن کا ذکر قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں سرے سے نہیں ہے، وہ درحقیقت علم کلام میں داخل نہیں[1] لیکن چونکہ آج چھ سات سو برس سے وہ گویا اسلام کے اجزا بن گئے ہیں، اسلئے اُن کا ذکر ضرور ہے، چنانچہ وہ حسب ذیل ہیں،

اشاعرہ	دیگر فرق
(۱) خدا کسی جہت میں نہیں،	حنابلہ اور اکثر محدثین اسکے مخالف ہیں،
(۲) خدا کے جسم نہیں ہے،	کرامیہ اسکے مخالف ہیں ابن تیمیہ بھی جسم کے قائل ہیں
(۳) خدا جوہر یا عرض نہیں،	ابن تیمیہ وغیرہ کے نزدیک جوہر ہے،
(۴) خدا کسی زمانہ میں نہیں یعنی زمانی چیز نہیں	
(۵) خدا کسی غیر کے ساتھ متحد نہیں ہوسکتا،	وحدۃ وجود والوں کے نزدیک ہر چیز خدا ہے
(۶) خدا کی ذات میں کوئی حادث چیز قائم نہیں ہوسکتی،	کرامیہ اسکے مخالف ہیں،
(۷) خدا کی صفات، عین ذات نہیں،	حکمائے اسلام اور اکثر معتزلہ کے نزدیک عین ذات ہیں
(۸) خدا قادر بالذات ہے یعنی فعل اور ترک فعل کا مختار ہے،	بوعلی سینا وغیرہ کے نزدیک، موجب بالذات ہے یعنی جس طرح آفتاب سے روشنی صادر ہوتی ہے اسی طرح خدا سے افعال صادر ہوتے ہیں،
(۹) خدا تمام ممکنات کا فاعل بالذات ہے،	بوعلی سینا وغیرہ کے نزدیک خدا واحد بالذات

[1] شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۹۰ میں یہ تقسیم کی ہے، اور اس پہلی قسم کی نسبت لکھتے ہیں کہ کسی شخص کا اہلسنت وجماعت سے ہونا ان مسائل کی بنا پر نہیں ہے،

مسائل عقائد کی نوعیت

پہلی بحث ۔ یہ بحث علم کلام کی تاریخ میں ہم مفصلاً لکھ چکے ہیں، یہاں صرف اس قدر بتادینا ہے کہ یہ مسائل دو قسم کے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید یا احادیث میں سرے سے نہیں ہے لیکن چونکہ متکلمین کے نزدیک وہ توحید اور نبوت کے عوارض ذاتی ہیں، اسلئے ان سے بحث کرنی ضرور ہے، کیونکہ اون کے بغیر توحید اور نبوت کی تکمیل نہیں ہوسکتی، مثلاً قرآن مجید کا حادث یا قدیم ہونا، یہ مسئلہ اگرچہ بتصریح قرآن و حدیث میں مذکور نہیں، لیکن جو عقائد قرآن مجید میں مذکور ہیں، ان کے لوازم میں سے ہے، کیونکہ قرآن کلام الٰہی ہے اور کلام الٰہی خدا کی صفات میں ہے، اور جو چیز کسی چیز کی صفت ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اب اگر قرآن مجید حادث ہو، تو ذات باری بھی حادث ہوگی، کیونکہ جو چیز حوادث کا محل ہوتی ہے خود بھی حادث ہوتی ہے، یہ بجائے خود ثابت ہوچکا ہے کہ ذات باری قدیم ہے، اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہیں،

بعض مسائل ایسے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں لیکن چونکہ اُن کی کیفیت مذکور نہیں اس لئے ہر فرقہ نے اپنے اجتہاد کے موافق کیفیت کی تعیین کی، اس تعیین سے بالذات اور بواسطہ بہت سے مسائل پیدا ہوگئے، مثلاً معاد کی کیفیات۔ قرآن مجید میں نہایت کثرت سے معاد کا ذکر ہے لیکن کیفیت کی تصریح نہیں، اشاعرہ نے اس کی کیفیت یہ قرار دی کہ بعینہٖ وہی جسم دوبارہ پیدا کیا جائیگا، جو دنیا میں موجود تھا، حکماے اسلام کے نزدیک معاد کو جسم سے تعلق نہیں، عذاب وثواب جو کچھ ہوگا روح پر ہوگا، اور روح کو دوبارہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ روح جوہر بسیط ہے اور وہ پیدا ہوکر فنا نہیں ہوتی،

دیگر فرق	اشاعرہ
	سے متعلق ہو سکتے ہیں،
	(۱۶) کلام باری میں کثرت نہیں بلکہ وہ واحد محض ہے
	(۱۷) خدا کا کلام نفسی مسموع ہو سکتا ہے،

ان عقائد کے سوا اور بھی بہت سے عقائد ہیں، لیکن مہات مسائل یہی ہیں، اسلئے ہم نے انہی پر اکتفا کی،

دوسری قسم کے عقائد وہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے،

جو امور قرآن میں مذکور ہیں لیکن انکی کیفیت مذکور نہیں،

یہ عقائد زیادہ تر اُن چیزوں سے متعلق ہیں جو روحانیات یا عالم غیب میں داخل ہیں، مثلاً وجود ملائکہ، حشر ونشر، بہشت و دوزخ، صراط، میزان وغیرہ، چونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں تھا اسلئے اجمالاً تمام اسلامی فرقوں نے ان کو مانا، لیکن ان کی حقیقت اور ماہیت کے متعین کرنے میں اختلاف ہوا، بعض فرقوں نے الفاظ کے بالکل ظاہری معنی لئے، بعض نے مجاز اور استعارہ کو دخل دیا، بعض نے خاص خاص الفاظ میں کچھ تاویل نہیں کی، بلکہ یہ کہا کہ روحانیات کے سمجھانے کا یہ ایک طریقہ ہے، یہ اختلاف اگرچہ خود مقتضائے فطرت تھا، لیکن ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ خود قرآن مجید میں اس کا اشارہ موجود تھا،

قرآن مجید میں ایک آیت ہے،

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ	قرآن مجید کی بعض آیتیں صاف ہیں اور وہی اُم الکتاب ہیں، اور بعض مبہم ہیں

اشاعرہ	دیگر فرق
	ہے، اور جو چیز واحد بالذات ہے، اس سے بالذات صرف ایک ہی چیز صادر ہوسکتی ہے، چنانچہ خدا نے صرف عقلِ اول کو پیدا کیا، اور پھر عقلِ اول سے واسطہ در واسطہ تمام مخلوقات پیدا ہوئی
(۱۰) خدا کا ارادہ قدیم ہے،	معتزلہ کے نزدیک حادث ہے،
(۱۱) خدا کا کلام، قدیم ہے، اور وہ کلام نفسی ہے	حنبلیوں کے نزدیک خدا کا کلام گو قدیم ہے لیکن کلام نفسی نہیں بلکہ حرف اور صورت کا نام ہے، معتزلہ کے نزدیک، کلام الٰہی حادث ہے اور حرف وصوت کا نام ہے،
(۱۲) انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ خدا کے اختیار سے سرزد ہوتے ہیں، انسان کی قدرت اور اختیار کو کچھ دخل نہیں،	معتزلہ کے نزدیک انسان کا ارادہ اور قدرت خود اُس کے افعال کی علت ہے، البتہ یہ ارادہ اور قدرت، خدا نے اس میں پیدا کی ہے،
(۱۳) خدا کے افعال معلل بالاغراض نہیں،	معتزلہ کے نزدیک، خدا کے ہر فعل کی غرض و غایت ہے،
(۱۴) بقا ایک صفتِ وجودی ہے جو اصل وجود پر زائد ہے	
(۱۵) سمع و بصر جو خدا کے اوصاف ہیں تمام محسوسات	

(۱) یہ عقائد جن آیتوں میں مذکور ہیں وہ مبہم ہیں یا نہیں ؟

(۲) مبہم ہیں تو اُن کی تاویل کرنی چاہیئے یا نہیں ؟

(۳) تاویل کرنی چاہیئے تو کیونکر ؟

چونکہ آیندہ ہر جگہ تاویل کی بحث آئیگی، اس لئے سب سے پہلے ہمکو تاویل کا فیصلہ کرنا چاہیئے یعنی یہ کہ تاویل کی کیا حقیقت ہے، تاویل مطلقاً ناجائز ہے یا کہیں جائز ہے؟ اور کہیں ناجائز؟ اگر بعض موقع پر جائز ہے تو جواز کا کیا قاعدہ ہے؟ تاویل کو کفر و اسلام کا معیار کہاں تک قرار دیا جا سکتا ہے؟

تاویل کی حقیقت

تاویل کے معنی اصل لغت میں مرجع و مسیر کے ہیں اور اصطلاح میں تعبیر اور تفسیر کو کہتے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ اکثر انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے. سَأُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا لیکن علمی یا تفسیری اصطلاح میں تاویل کے یہ معنی ہیں کہ کسی لفظ کے ظاہری اور لغوی معنی چھوڑ کر کوئی اور معنی لئے جائیں،

اسلام میں جس قدر فرقے ہیں حشویہ کے سوا باقی سب نے تاویل کو جائز رکھا ہے، امام احمد ابن حنبل کی نسبت اگرچہ روایت ہے کہ وہ تاویل کے کل مخالف تھے، تاہم تین موقع پر وہ بھی تاویل کو جائز رکھتے تھے، غرض اصل تاویل کے جواز میں (بجز حشویہ کے) اور کسی کو کلام نہیں، گفتگو جو کچھ ہے وہ تاویل کے موقع اور محل میں ہو، یعنی کہاں جائز ہے اور کہاں نہیں ؟ اسلامی فرقوں میں ظاہر پرستی اور دقیقہ سنجی کے لحاظ سے جو فرقِ مراتب تھا اسی نسبت سے تاویل کا دائرہ بھی محدود اور وسیع ہوا، سب سے پہلا درجہ ارباب ظاہر کا ہے، ان کے نزدیک کہیں تاویل جائز

فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا	توجن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ مبہم
تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ	آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فسا
وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ	پیدا کریں، اور تاکہ ان کی تاویل کریں
تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ	حالانکہ اُن کی تاویل بجز خدا کے کوئی
فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ	نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں پکے
(آل عمران - ۱)	ہیں، وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے

اختلاف اس طرح پیدا ہوا کہ ایک فریق نے وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کو الگ جملہ قرار دیا جس کی رو سے یہ معنی ہوئے کہ جو آیتیں مبہم ہیں اُن کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، باقی جو لوگ راسخ فی العلم ہیں، وہ صرف یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ دوسرے فریق کے نزدیک وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ الگ جملہ نہیں ہے، بلکہ پہلے جملہ پر عطف ہے، اس تقدیر پر معنی یہ ہوئے کہ مبہم آیتوں کی تاویل بجز خدا کے اور بجز اُن لوگوں کے جو علم میں پکے ہیں اور کوئی نہیں جانتا، پہلے معنی کے قائل، حضرت عائشہؓ حسن بصری، مالک بن انس، کسائی، فراء اور جبائی وغیرہ ہیں، دوسرے معنی کے قائل، مجاہد، ربیع بن انس اور اکثر متکلمین ہیں، عبداللہ ابن عباسؓ سے دونوں روایت ہے، اس اختلاف سے ایک اور اختلاف پیدا ہوا، یعنی یہ کہ کون سی آیتیں محکم ہیں اور کون سی مبہم، اس بناء پر عقائد، مبحوث فیہا میں متعدد اختلافات پیدا ہوئے۔

لہ تفسیر کبیر آیت هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ،

ہے، تو تمکو یہ جاننا چاہیئے کہ ان علوم کا خفی و جلی ہونا ایسی بات ہے جس سے کوئی صاحب فہم انکار
نہیں کر سکتا صرف وہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جنھوں نے بچپن کے زمانہ میں کچھ سُن لیا اور اسی پر جم
گئے، اُنھوں نے بلندی کی طرف اور علما و اولیا کے مقامات کی طرف ترقی نہیں کی اور یہ خود شریعت
کے دلائل سے ثابت ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ قرآن کے معنی ایک ظاہر ہیں اور ایک باطن،
ایک حد ہے اور ایک مطلع (یہ حدیث صحیح نہیں مترجم) حضرت علیؓ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے
فرمایا کہ "اس میں بڑے بڑے علوم ہیں، کاش اُنکا کوئی حامل ملتا" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ
ہم پیغمبر لوگ ہیں، ہم کو یہ حکم ہے کہ ہم لوگوں سے اُن کی عقل کے موافق بات کریں" (یہ حدیث بھی
مرفوع نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا قول ہی) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی بات کسی قوم کے
سامنے بیان کیجائے اور وہ اُن کی عقل سے باہر ہو تو اُن کے حق میں فتنہ ہو گی" خدا نے کہا ہے "وَتِلْكَ
الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ"، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ہے کہ "بعض
علوم پوشیدہ ہیں جن کو صرف عارفانِ الٰہی جانتے ہیں، الخ" اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "جو کچھ میں
جانتا ہوں، اگر تم بھی جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ"

اب بتاؤ اگر یہ راز کی باتیں نہ تھیں جن کے ظاہر کرنے سے آپ کو اس بنا پر منع کیا گیا
تھا کہ لوگ ان کو نہیں سمجھ سکتے تھے یا اور کوئی مصلحت تھی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انکو ظاہر کیوں
نہیں فرمایا؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیان کرتے تو لوگ بہر حال تصدیق کرتے
ابن عباسؓ نے اس آیت کے متعلق "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ"
کہا ہے کہ اگر اس آیت کی تفسیر میں بیان کروں تو تم لوگ مجھ کو پتھر مارو گے اور دوسری

نہیں، مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے آسمان و زمین سے کہا کہ بخوشی یا بکراہ حاضر ہو، دونوں نے کہا ہم مطیعانہ حاضر ہیں؛ یا مثلاً قرآن میں ہے کہ جب ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے" ارباب ظاہر کے نزدیک ان آیتوں میں وہی لغوی معنی مراد ہیں یعنی یہ کہ فی الواقع زمین و آسمان نے یہ الفاظ کہے تھے اور فی الواقع خدا ہر چیز کے پیدا ہونے کے وقت کن کا لفظ کہا کرتا ہے، امام ابو الحسن اشعری کا مذہب اسی کے قریب قریب ہے، قرآن مجید میں ہے کہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، امام موصوف نے کتاب الابانۃ میں تصریح کی ہے کہ ان الفاظ کے اصلی معنی مراد ہیں، کوئی مجاز یا استعارہ نہیں ہے؛

ارباب ظاہر کے بعد عام اشاعرہ، پھر ماتریدیہ پھر معتزلہ، پھر حکمائے اسلام ہیں، اس بحث میں سب سے اہم امر تاویل کے اصول کا انضباط ہے، یعنی کن موقعوں پر تاویل جائز ہے، اور کن موقعوں پر نہیں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں اس پر نہایت خوبی سے بحث کی ہے، اس لئے ہم اس کا لفظی ترجمہ نقل کرتے ہیں احیاء العلوم جزو اول کتاب قواعد العقائد فصل ثانی میں ہے،

تاویل کے متعلق امام غزالی کی رائے

اگر تم یہ کہو کہ اس بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن جن میں سے بعض نہایت واضح ہیں، اور ابتداءً ذہن میں آجاتے ہیں بعض خفی ہیں جو مجاہدہ، ریاضت، دلکاوش اور فکر صحیح سے حاصل ہوتے ہیں، اور وہ بھی اس وقت کہ دنیا کی تمام چیزوں سے فارغ الذہن ہو کر انہی پر توجہ کیجائے، حالانکہ یہ بات بظاہر شریعت کے مخالف معلوم ہوتی ہے، کیونکہ شریعت میں ظاہر و باطن دو الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ شریعت کا جو ظاہر ہے وہی باطن ہے، جو مخفی ہے، وہی آشکا

خلافِ شریعت ہے اور یہ کفر ہے کیونکہ شریعت ظاہر کا نام ہے، اور حقیقت باطن کا، اور اگر شریعت وحقیقت دونوں ایک ہی ہیں تو پھر دو قسمیں کیسی؟ اس صورت میں شریعت میں کوئی قابلِ اخفا راز نہ ہوگا، اور ظاہر وپنہاں ایک ہوگا،

تو تمکو جاننا چاہئے کہ یہ سوال ایک بڑی مہم کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے، اور علم مکاشفہ کی طرف منجر ہوتا ہے اور علم المعاملہ کی غرض وغایت سے دور جا پڑتا ہے، حالانکہ ان تصنیفات کا مقصد صرف علم المعاملہ ہے، کیونکہ جو عقائد اوپر مذکور ہوئے، وہ اعتقاداتِ قلبی میں داخل ہیں، اور ہم نے اُن پر تقلیداً یقین کیا ہے، نہ کہ کشفِ حقیقت کے طور پر، کیونکہ تمام لوگ کشفِ حقیقت پر مجبور نہیں کئے گئے ہیں، اور اگر یہ اعتقاد اعمال میں داخل نہ ہوتے تو ہم اس کتاب میں اُنکا ذکر بھی نہ کرتے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ دل کی ظاہری حالت سے متعلق ہیں نہ باطنی تو ہم اس کتاب کے حصہ اوّل میں اس کا ذکر نہ کرتے، باقی حقیقی انکشاف ہونا تو یہ قلب کے باطن سے متعلق ہے، تاہم چونکہ گفتگو کا موقع ایسا آپڑا ہے کہ ظاہر وباطن میں تناقض کا خیال پیدا ہوتا ہے، اس لئے مختصر طور پر اس عقدہ کا حل کرنا ضرور ہے،

وہ اسرار جن کا فاش کرنا منع ہے، انکی پانچ قسمیں ہیں،

جو شخص یہ کہتا ہے کہ شریعت وحقیقت یا ظاہر وباطن باہم مخالف ہیں، وہ اسلام کے بجائے کفر سے زیادہ قریب ہے، اصل یہ ہے کہ جو اسرار مقربین سے مخصوص ہیں، اور جن کو اور لوگ نہیں جانتے اور جن کا فاش کرنا منع ہے، اُن کی پانچ قسمیں ہیں،

(۱) پہلی قسم یہ ہے کہ وہ بات فی نفسہٖ دقیق ہے، اور اکثر طبیعتیں اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں، تو وہ خواہ مخواہ مقربین کے ساتھ مخصوص ہوگی، اور ان کا فرض ہوگا کہ اسکو نا اہلوں پر ظاہر

روایت میں ہے کہ تم کہو گے کہ عبداللہ بن عباسؓ کافر ہے"، اور ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دو قسم کی باتیں یاد کیں، ایک کو شائع کیا، اور دوسرے کو اگر شائع کروں تو میری یہ گردن کاٹ ڈالی جائے گی، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ابوبکرؓ کو جو فضیلت تم لوگوں پر ہے وہ زیادہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے نہیں ہے، بلکہ اس راز کی وجہ سے ہے جو اس کے سینہ میں امانت ہے"، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ راز مذہبی ہی اصول کے متعلق تھا، اور جو چیز مذہبی اصول میں داخل تھی وہ ظاہری طور پر اوروں سے بھی مخفی نہیں ہو سکتی تھی، سہل تستری کا قول ہے کہ علما کے پاس تین قسم کے علوم ہوتے ہیں، (۱) علم ظاہر جس کو وہ اہل ظاہر کے سامنے پیش کرتے ہیں، (۲) علم باطن جو صرف ان لوگوں پر ظاہر کیا جاتا ہے جو اسکے اہل ہوتے ہیں (۳) وہ علم جس کا تعلق صرف خدا سے ہوتا ہے اور کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا جاتا، بعض عرفا کا قول ہے کہ ربوبیت (خدائی) کا بھید ظاہر کرنا کفر ہے، بعضوں کا قول ہے کہ "ربوبیت ایک ایسا راز ہے، کہ اگر ظاہر کر دیا جائے تو نبوت بیکار ہو جائے، اور نبوت ایک ایسا راز ہے کہ اگر ظاہر کر دیا جائے تو علم بیکار ہو جائے، اور علما کو خدا کے ساتھ ایسا راز ہے کہ اگر ظاہر کر دیا جائے تو تمام احکام باطل ہو جائیں" اس قائل کا غالباً مطلب یہ ہے کہ **نبوت** کوتاہ بینوں کے نزدیک باطل ہو جائے گی، ورنہ اگر یہ مطلب نہ ہو تو یہ قول غلط ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ ان دونوں میں تناقض نہیں کیونکہ کامل وہی ہے جس کا نورِ معرفت نورِ تقویٰ کو بجھا نہ دے، اور تقویٰ کا مرکز نبوت ہے، اگر تم یہ کہو کہ ان آیات اور روایات میں تاویل ہو سکتی ہے، ورنہ ظاہر و باطن میں کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے، کیونکہ باطن اگر ظاہر کا مخالف ہے، تو شریعت باطل ہو جائیگی اور یہ وہی بات ٹھہرے گی کہ حقیقت

آپ پر قیاس کرکے دوسروں کی ذات وصفات کا بھی تصور کرتا ہے، اور یہ بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ دونوں میں شرف وکمال کے لحاظ سے فرق ہی، اس بنا پر انسان جو کچھ کرسکتا ہی، اس سے زیادہ نہیں کرسکتا، کہ خود اس میں جو اوصاف پائے جاتے ہیں، مثلاً فعل، قدرت، علم وغیرہ انہی کو خدا میں بھی ثابت کرے، صرف یہ فرق ہوگا کہ خدا کی صفات کو اپنی صفات سے نہایت بالاتر قرار دیگا، تو انسان درحقیقت اپنے ہی صفات کا اثبات کرتا ہے، نہ اُن صفات کا جو خدا کے مخصوص صفات ہیں، اسی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "اے خدا! میں تیری توصیف اس طرح نہیں کرسکتا، جس طرح تو نے کی ہے"، اس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کے صفات معلوم تھے اور اُن کو ادا نہیں کرسکتے تھے، بلکہ آپ کو اعتراف تھا کہ "میں خدا کی صفات کی حقیقت سمجھنے سے معذور ہوں"، بعض بزرگوں نے کہا کہ خدا کی حقیقت خدا ہی سمجھ سکتا ہے، اور حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے کہ "وہ خدا تعریف کا مستحق ہے جس نے اپنے پہچاننے کا یہ طریقہ رکھا ہے کہ اس کے نہ پہچان سکنے کا اقرار کیا جائے"۔

"یہاں پہنچکر ہم کو قلم کی زبان روک لینی چاہیئے، اور اپنے مقصد کی طرف واپس آنا چاہئے، اور وہ یہ ہی کہ ان پانچ قسموں میں سے ایک وہ مسائل ہیں جو فہم کے دائرہ سے باہر ہیں، انہی میں روح کا مسئلہ بھی ہے، خدا کے بعض صفات بھی اس میں داخل ہیں، حدیث ذیل میں بھی اسی طرف اشارہ ہے، "خدا کے ستر پردے ہیں، جو نور کے ہیں، اور اگر وہ کُھل جائیں تو دیکھنے والے جل کر رہ جائیں،

(۲) دوسری قسم کے اسرار جن کو انبیاء اور صدیقین ظاہر نہیں کرتے وہ وہ ہیں کہ بجائے

کریں ورنہ ان کے حق میں وہ موجب فساد ہوگی، کیونکہ ان کے فہم کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی
اسی بنا پر جب لوگوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روح کی حقیقت پوچھی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے اعراض کیا، کیونکہ روح کی حقیقت عام لوگوں کے فہم میں نہیں آسکتی، اور وہم اسکی حقیقت کے
دریافت سے عاجز ہے، یہ نہ سمجھو کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی روح کی حقیقت معلوم نہ تھی، کیونکہ
جو شخص روح کی حقیقت نہیں جانتا وہ اپنی حقیقت نہیں جانتا اور جو شخص اپنی حقیقت نہیں
جان سکتا وہ خدا کو کیا پہچان سکتا ہے، بعض علما اور اولیا کو روح کی حقیقت معلوم ہوتی ہے
لیکن وہ لوگ آداب شریعت کا لحاظ رکھتے ہیں اور اس وجہ سے جس موقع پر انبیاؑ نے سکوت
کیا ہے، وہ بھی سکوت کرتے ہیں، روح پر کیا موقوف ہے، خدا کی صفات میں وہ باریکیاں
ہیں جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے، چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے صرف ظاہری صفات
مثلاً علم، قدرت وغیرہ بیان کیں، ان کو بھی لوگوں نے اس وجہ سے سمجھا کہ وہ خود بھی علم اور قدرت
رکھتے تھے، اس لئے خدا کی قدرت اور علم کو اُس پر قیاس کر سکے، ورنہ اگر خدا کے وہ اوصاف
بیان کئے جائیں جن کے مشابہ کوئی صفت انسان میں موجود نہیں ہے، تو انسان اس کا تصور
نہیں کر سکتا، بلکہ جماع کی لذت کو اگر کسی بچہ یا نامرد کو سمجھانا چاہو تو وہ نہیں سمجھ سکتا بجز اس کے
کہ یہ کہا جائے کہ کھانے میں جو لذت ہے اس کے مشابہ ہے لیکن یہ سمجھنا درحقیقت سمجھنا نہیں ہے کہ خدا
علم و قدرت اور انسان کے علم و قدرت میں جو فرق ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے، جس قدر
کھانے کی لذت اور جماع کی لذت میں ہے،

مختصر یہ کہ انسان صرف اپنی ذات اور صفات (موجودہ یا گذشتہ) کا تصور کرتا ہے پھر اپنے

جاتا ہے، کہ سننے والے کے دل میں اس کا اثر قوی ہوتا ہے، اور مصلحت اسی کی مقتضی ہو کہ دل پر زیادہ قوی اثر ہو، مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے فلاں کو دیکھا کہ وہ سور کی گردن میں موتیوں کا ہار پہناتا تھا، اور اس سے مراد یہ ہو کہ وہ نااہلوں کو تعلیم دے رہا تھا، تو سننے والا ظاہری معنی سمجھے گا، لیکن محقق شخص جب غور کریگا، اور اُسکو معلوم ہو گا کہ وہاں نہ سور تھا نہ موتی تو اصل غرض کی طرف اُس کا خیال منتقل ہو گا، چنانچہ شاعر نے کہا ہے،

رَجُلَانِ خَيَّاطٌ وَآخَرُ حَائِكٌ ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ مُتَقَابِلَانِ عَلَى السِّمَاكِ الْأَعْزَلِ

لَا زَالَ يَنْسِجُ ذَاكَ خِرْقَةَ مُدْبِرٍ ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ وَيَخِيطُ صَاحِبُهُ ثِيَابَ الْمُقْبِلِ

ان شعروں میں شاعر نے آسمانی اقبال و ادبار کو دو کاریگروں سے تعبیر کیا ہے، اس قسم کی تعبیر میں معنی مقصود کو ایسی صورت کے ذریعہ سے بیان کیا جاتا ہے، جو عین معنی یا اُسکی مثال پر مشتمل ہوتی ہے، اسی قسم میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول داخل ہے، کہ مسجد تھوک سے اس طرح کبیدہ ہو کر سمٹ جاتی ہے جس طرح چمڑا آگ پر رکھنے سے" حالانکہ بظاہر مسجد میں انقباض نہیں پیدا ہوتا، لیکن مقصود یہ ہے کہ مسجد قابلِ تعظیم چیز ہے، اور اس میں تھوکنا اسکی تحقیر ہے، اسلئے یہ فعل مسجد کی شان کے اس قدر مخالف ہے کہ گویا چمڑے کو آگ میں ڈال دیا ہے" اسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع سے سر اٹھاتا ہے وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ خدا اسکے سر کو گدھے کا سر بنا دے" گرچہ ظاہری صورت کے لحاظ سے ایسا کبھی واقع نہیں ہوا اور نہ کبھی ہو گا، لیکن اصل مقصد کے لحاظ سے یہ صحیح ہے، کیونکہ گدھے کے سر میں صورت و شکل کے لحاظ سے کوئی خصوصیت نہیں، اسکی جو کچھ خصوصیت ہے وہ حماقت و غباوت کے لحاظ سے ہے، اور جو شخص امام سے پہلے

خود قابلِ فہم ہیں، لیکن اُنکا ذکر اکثروں کے حق میں مضر ہے، گو انبیا اور صدیقین کے حق میں مضر نہیں،
مثلاً جبر و قدر کا مسئلہ جس کا ظاہر کرنا اہلِ علم کو نا جائز ہے، اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں، کہ بعض حقائق
کا ذکر بعض لوگوں کے حق میں مضر ہو، مثلاً آفتاب کی روشنی چمگادڑ کے حق میں، اور گلاب کی خوشبو
گُبریلے کے حق میں مضر ہے، مثلاً یہ عقیدہ کہ کفر، زنا، معاصی اور بُرائیاں سب خدا کے حکم اور
ارادہ اور مشیت سے ہیں فی نفسہ سچ ہے، لیکن یہی بات اکثروں کے حق میں مضر ہے، کیونکہ
یہ امر اُن کے نزدیک سفاہت کی دلیل ہے، اور حکمت کے خلاف ہے، اور گویا برائی اور
ظلم کو جائز رکھنا ہے، چنانچہ ابن الراوندی اور بعض نالائق اسی بنا پر ملحد ہو گئے؛ قضا و قدر کے
مسئلہ کا بھی یہی حال ہے کہ اگر وہ ظاہر کر دیا جائے تو اکثر لوگوں کو خدا کے عجز کا گمان ہو گا، کیونکہ اس
شبہہ کا جو اصلی جواب ہے وہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا،

اسکی مثال ایک شخص یوں دے سکتا ہے کہ اگر یہ بتا دیا جائے قیامت کے آنے میں ہزار
برس یا کم و بیش کی دیر ہے تو ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا تھا، لیکن اگر یہ تعین کر دیجاتی تو خلاف
مصلحت ہوتا، اور اس میں خلق کو ضرر پہنچتا کیونکہ اگر قیامت کے آنے میں زیادہ دیر ہے تو لوگ
اس خیال سے کہ ابھی بہت دن ہیں، قیامت کی چنداں پروا نہ کرتے، اور اگر قیامت کا
زمانہ قریب ہے اور وہ متعین کر دیا جاتا تو لوگوں پر اس قدر خوف طاری ہو جاتا کہ کام
کاج چھوڑ دیتے اور دنیا برباد ہو جاتی، یہ مثال اگر صحیح ہو تو اسی دوسری قسم کی مثال ہو گی،

(۳) تیسری قسم کے وہ امور ہیں کہ اگر صاف طور پر کہہ دیئے جائیں تو سمجھ میں آ جائیں
اور اس میں کچھ ضرر بھی نہیں، لیکن ان کو استعارہ اور رمز کے پیرایہ میں اس غرض سے بیان کیا

ہدایت جو لوگوں کو نفع رساں ہے قائم اور دیرپا ہے،

اس تیسری قسم کے لوگوں نے زیادہ وسعت دی ہی، یہانتک کہ قیامت میں ترازو پُل صراط وغیرہ وغیرہ کا جو ذکر ہے اُن کو بھی اسی پر محمول کیا ہی، لیکن یہ بدعت ہے، کیونکہ کوئی حدیث اس کے موافق منقول نہیں اور اسکے ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی استحالہ نہیں اسلئے ظاہری ہی معنی لینے چاہئیں[۱]،

(۴) چوتھی قسم یہ ہے کہ انسان ایک چیز کو پہلے اجمالاً جانے پھر تحقیق اور ذوق سے اسکی حقیقت اس طرح سمجھے کہ ایک حالت طاری ہوجائے، ان دونوں علموں میں ایسا فرق ہے، جیسا چھلکے اور مغز میں یا ظاہر و باطن میں، اسکی یہ مثال ہے کہ جس طرح کسی شخص کو کوئی چیز تاریکی میں یا بہت دور سے نظر آئے، اس صورت میں اسکو ایک قسم کا علم حاصل ہوگا لیکن جب روشنی میں یا قریب سے دیکھے گا تو دونوں صورتوں میں تفاوت معلوم ہوگا دوسری حالت پہلی حالت کی مناقض نہ ہوگی، بلکہ اسکی تکمیل ہوگی، علم تصدیق اور ایمان کی بھی یہی حالت ہے، انسان عشق، بیماری، یا موت کا یقین رکھتا ہی، لیکن جب خود اسکو یہ موقع پیش آتے ہیں تو وہ یقین پہلے یقین سے کہیں زیادہ کامل ہوتا ہے، بلکہ انسان کو شہوت اور عشق اور تمام دیگر جذبات کے متعلق مختلف حالتیں ہوتی ہیں، وہ یقین جو وقوع کے قبل ہوتا ہے، جو وقوع کے بعد ہوتا ہے، جو ختم ہوجانے کے بعد ہوتا ہے آپس میں

---

[۱] امام صاحب اخیر میں وہی اشاعرہ کی بولی بول گئے، اور احیاء العلوم جیسی کتاب میں اس قسم کا پردہ رکھنا ضرور تھا لیکن امام صاحب نے دوسری تصنیفات میں اس راز کو فاش کر دیا ہی،

سر اُٹھاتا ہے، حماقت کے لحاظ سے اس کا سر گویا گدھے کا سر ہے، کیونکہ یہ انتہائے حماقت ہے کہ ایک شخص کسی کے پیچھے چلنا چاہے اور پھر اس سے آگے نکل جائے، یہ امر کہ اس موقع پر ظاہری معنی مقصود نہیں، دو طرح پر ثابت ہوتا ہے، یا دلیل عقلی سے یا دلیل شرعی سے، دلیل عقلی یہ کہ ظاہری معنی لینے ممکن نہ ہوں، مثلاً آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول کہ "مسلمانوں کا دل خدا کی دو انگلیوں میں ہے"! حالانکہ اگر مسلمانوں کے دل کو دیکھا جائے تو اس میں کہیں انگلیاں نظر نہ آئیں گی، اس سے معلوم ہوا کہ انگلیوں سے یہاں قدرت مراد ہے کیونکہ انگلی کی اصلی حقیقت یہ قدرت اور طاقت ہے اور قدرت کی تعبیر انگلی سے اسلئے کی گئی کہ کمال اقتدار کی تعبیر کا یہ نہایت موثر طریقہ ہے اور اسی طرح کمال اقتدار کو ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے، إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (جب ہم کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے) یہاں ظاہری معنی کسی طرح نہیں لئے جا سکتے کیونکہ جو چیز معدوم ہے وہ قابل خطاب نہیں تفہیم کا کیا ذکر، اور اگر پیدا ہونے کے بعد یہ خطاب ہے، تو تحصیل حاصل ہے، لیکن چونکہ کمال اقتدار کے ظاہر کرنے کا یہ عمدہ پیرایہ ہے، اسلئے اس طریقہ سے اسکو ادا کیا گیا، دلیل شرعی کے یہ معنی کہ ظاہری معنی کا مراد لینا ممکن ہو لیکن روایت سے ثابت ہوگیا ہو کہ وہ معنی مراد نہیں، جیسا کہ اس آیت میں، أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا الآیۃ پانی سے قرآن اور وادیوں سے دل مراد ہیں جنمیں سے بعض میں بہت سا خس وخاشاک ہے بعض میں کم، اور بعض میں بالکل نہیں، اور جھاگ سے کفر و نفاق مراد ہے، کیونکہ گو وہ نمایاں ہے، اور پانی پر تیرتا رہتا ہے، لیکن ناپائدار ہے اور

الفاظ حرف اور صورت کے ذریعہ سے خدا نے اُن سے کہے، زمین اور آسمان نے اُنکو سمجھا اور جواب دیا کہ ہم حاضر ہیں، لیکن نکتہ شناس جانتا ہے کہ یہ زبانِ حال ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ زمین و آسمان خدا کے ارادہ کے وابستہ ہیں، اسی طرح پر خدا کا یہ قول ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ — ایک چیز بھی ایسی نہیں جو خدا کے حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو،

کون آدمی اس آیت سے یہ سمجھتا ہے کہ جمادات میں حیات، عقل اور گویائی ہے اور وہ حقیقۃً سبحان اللہ کا لفظ ادا کرتے ہیں، لیکن نکتہ داں جانتا ہے کہ زبانِ قال مراد نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ خود جمادات کا وجود خدا کی تسبیح، خدا کی تقدیس اور خدا کی وحدانیت کی شہادت ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے،

وَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ اٰیَۃٌ — تدل علی انہ الواحد

محاورہ میں کہتے ہیں کہ یہ عمدہ صنعت گری کاریگر کے حسنِ صنعت اور کمالِ فن کی شہادت ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ صنعت گری زبان سے بولتی ہے، بلکہ اس کی حالت سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح جو چیز ہے وہ کسی موجد کی محتاج ہے جو اسکو پیدا کرتا ہے اور اس کو اور اسکے اوصاف کو قائم رکھتا ہے اور اسکی حالتوں کو بدلتا رہتا ہے، یہ محتاج ہونا خود موجد کی تقدیس کی شہادت ہے، لیکن اس شہادت کو صرف اہلِ نظر سمجھتے ہیں نہ اربابِ ظاہر جن کی سمجھ صرف ظاہر پر محدود ہے، اس لئے خدا نے کہا،

وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ — لیکن تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے،

مختلف ہیں مثلاً بھوک جب زائل ہوجاتی ہے، تو اُس کے یقین کی حالت اس سے مختلف ہوتی ہے، جو عین بھوک کی حالت میں تھی، اسی طرح علوم دین کی حالت ہے، کہ وجدان کے مرتبہ کو پہنچکر کامل ہوتے ہیں، کمال سے جو پہلی حالت تھی وہ گویا ظاہر ہے، اور کمال کی حالت گویا باطن ہے، ایک بیمار کے ذہن میں صحت کا جو مفہوم ہے، وہ اس سے کہیں مختلف ہے جو ایک صحیح کے ذہن میں ہے،

ان چاروں اقسام میں لوگوں کی حالت متفاوت ہے، حالانکہ ان سب حالتوں میں باطن، ظاہر کا مناقض نہیں، بلکہ اس کا متمم ہے، جس طرح مغز چھلکے کا متمم ہے،

(۵) یہ وہ صورت ہے کہ زبانِ حال کو زبانِ قال سے تعبیر کیا جاتا ہے، کوتاہ فہم ظاہر پر اٹکتا ہے اور اسکو حقیقی نطق سمجھتا ہے لیکن حقیقت شناس اصلی راز کو سمجھتا ہے، یہ ایک ضرب المثل ہے، کہ دیوار نے کھونٹی سے کہا کہ تو مجھکو کیوں چھیدتی ہے، کھونٹی نے کہا کہ اس سے پوچھو جو مجھکو ٹھوک رہا ہے، کیونکہ میں خود مختار نہیں ہوں، یہاں زبانِ حال کو زبانِ قال سے ادا کیا ہے، اسی طرح قرآن کی یہ آیت،

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ	پھر خدا آسمان کی طرف بڑھا جبکہ وہ دھواں
دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ	تھا اور اس سے اور زمین سے خطاب کر کے کہا کہ
ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَا	تم دونوں بخوشی یا بہ اکراہ حاضر ہو،
اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ،	دونوں نے کہا ہم بخوشی آتے ہیں،

احمق آدمی اس کے یہ معنی قرار دیتا ہے کہ آسمان اور زمین بھی عقل و فہم رکھتے ہیں، اور

انھی لوگوں میں ہیں، وہ کن فیکون کی تاویل سے بھی منع کرتے ہیں، اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا ہر چیز کے پیدا کرنے کے وقت کُن کا لفظ بولا کرتا ہے، یہاں تک کہ میں نے امام احمد بن حنبل کے بعض مقلدین سے سنا کہ امام موصوف نے بجز تین حدیثوں کے تاویل کو بالکل ناجائز قرار دیا، وہ تین موقع یہ ہیں: "حجر اسود دنیا میں خدا کا دایاں ہاتھ ہے" "مسلمان کا دل خدا کی دو انگلیوں میں ہے" "مجھکو یمن سے خدا کی بو آتی ہے" امام احمد بن حنبل کی نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ استوار علی العرش اور نزول کے معنی استقرار اور انتقال کے سمجھتے ہوں گے، البتہ انھوں نے تاویل کو بلحاظ پیش بندی اور نفعِ عام کے سرے سے روکا ہوگا، کیونکہ جب ایک دفعہ دروازہ کھل جاتا ہے، تو بات قابو سے باہر ہوجاتی ہے، اور اعتدال قائم نہیں رہتا، کیونکہ جب اعتدال سے آگے قدم بڑھاؤ تو اُسکی کوئی حد نہیں قرار پاسکتی، اس بنا پر اس قسم کی روک ٹوک میں کچھ مضائقہ نہیں، سلف کے طریقہ سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، وہ لوگ ان موقعوں کی نسبت کہتے تھے کہ جس طرح روایت میں ہے، اسی طرح رہنے دو،

امام مالک سے کسی نے استوار علی العرش کے متعلق پوچھا تو اُنھوں نے کہا "استوار تو معلوم ہے لیکن اسکی کیفیت مجہول اور اس پر ایمان لانا واجب اور سوال کرنا بدعت ہے"

بعض لوگوں نے اعتدال کا طریقہ اختیار کیا، تو یہ کیا کہ خدا کے صفات کے متعلق جو نصوص ہیں اُن کی تاویل کی اور قیامت کے متعلق جو کچھ آیا ہے اُن کو بحال خود رہنے دیا، اور اُن میں تاویل کرنے سے ممانعت کی، یہ لوگ اشعریہ ہیں، معتزلہ نے ان پر ترقی کی یعنی صفاتِ الٰہی میں سے مرئی ہونے اور سمیع و بصیر ہونے کی تاویل کی، معراج کو غیر جسمانی قرار دیا، عذابِ قبر

کوتاہ نظر تو مطلقاً نہیں سمجھ سکتے علماے راسخین اور مقربین سمجھتے ہیں، لیکن وہ بھی کنہ اور ماہیت نہیں سمجھتے، کیونکہ اشیاء جو خدا کی تقدیس کی شہادت دیتی ہیں اُنکی شہادت مختلف قسم کی ہے، اور ہر شخص اپنی عقل و بصیرت کے درجہ کے لحاظ سے اُنکو سمجھتا ہے، ان شہادتوں کے اقسام کم گنا علم معاملہ کی حد سے باہر ہے،

غرض یہ وہ مرحلہ ہے جس میں ارباب ظاہر اور ارباب باطن میں تفاوت اور فرق ہے اور یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ باطن اور ظاہر میں فرق ہے،

اس مقام میں لوگوں نے افراط و تفریط کی ہے بعض اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ سرے سے ظاہر کو اڑا دیتے ہیں، یہانتک کہ جسقدر ظواہر و براہین ہیں کل یا قریباً کل کو بدل دیتے ہیں مثلاً خدا کے ان ارشادات کو

وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ،	اور ہم سے اُن کے ہاتھ باتیں کریں گے اور اُن کے پاؤں شہادت دیں گے،
وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ	اور وہ لوگ اپنے بدن کی کھال سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی، کھالیں کہیں گی کہ ہمکو اُس خدا نے گویا کر دیا،
(فصلت-۳)	

اسی طرح منکر و نکیر کے سوال و جواب، میزان، پل صراط، حساب و کتاب، دوزخیوں اور بہشتیوں کے مناظرے، دوزخیوں کا یہ کہنا کہ ہمکو تھوڑا سا پانی یا جو کچھ خدا نے تم کو دیا ہے دو، ان تمام باتوں کو یہ لوگ زبانِ حال قرار دیتے ہیں،

دوسرے گروہ نے اس قدر مبالغہ کیا کہ سرے سے سد باب کر دیا، امام احمد بن حنبل

تاویل کے متعلق امام غزالی کی کتاب فیصل التفرقۃ کا خلاصہ

امام صاحب نے اس نازک اور دقیق مضمون میں مبحوث اور مشتبہ مسائل کے جو پانچ اقسام قرار دیئے ہیں اُن سے **تاویل** کا مسئلہ بہت کچھ حل ہوجاتا ہے، تاہم خاص اس بحث پر کہ تاویل کے کس قدر اقسام ہیں؟ تاویل کے جواز کے کیا شرائط ہیں، اور جواز کی حیثیت سے ان اقسام میں کیا ترتیب ہے، امام صاحب کا ایک خاص رسالہ ہے جس نے اس بحث کا پورا فیصلہ کردیا ہے، اسلئے اس کا نقل کرنا بھی اس موقع پر ضرور ہے،

وہ لکھتے ہیں کہ اشیا کے وجود کی پانچ قسمیں ہیں،

(۱) **وجود ذاتی** یعنی وجود حقیقی، مثلاً آسمان و زمین کا وجود،

(۲) **وجود حسّی** یعنی وہ وجود جو صرف صاحب حس کے ساتھ خاص ہے مثلاً خواب کے واقعات، یا مثلاً بعض بیماروں کو بیداری کی حالت میں صورتیں نظر آتی ہیں، انبیا علیہم السلام کو ملائکہ کی جو صورتیں نظر آتی ہیں، امام صاحب اسکو بھی اسی قسم میں داخل کرتے ہیں، چنانچہ اس قسم کے تحت میں لکھتے ہیں،

بل قد يتمثل للانبياء والاولياء	بلکہ کبھی انبیاء اور اولیاء کو بیداری اور صحت
في اليقظة والصحة صور جميلة	میں خوبصورت صورتیں نظر آتی ہیں، جو
محاكية لجواهر الملائكة	جواہر ملائکہ کے مشابہ ہوتی ہیں انہی صورتوں
وينتهي اليهم الوحي والالهام	کے ذریعہ سے انبیاء اور اولیا کو وحی اور الہام
بواسطتها فيتلقون من امر الغيب	ہوتا ہی، تو غیب کے امور جو اوروں کو خواب
ما يتلقاه غيرهم في النوم	میں معلوم ہوتے ہیں انبیا اور اولیا کو صفائی

میزان، پل صراط وغیرہ کی بھی تاویل کی تاہم اس بات کا اعتراف کیا کہ معاد جسمانی ہوگا، اور بہشت میں تمام ماکولات، مشمومات ومنکوحات اور دیگر لذات جسمانی ہونگی، اسی طرح دوزخ کا عذاب بھی جسمانی ہوگا، اس میں ایسا آتشیں مادہ ہوگا، جس سے بدن کی کھال جل جائے گی فلاسفہ (اسلام) نے اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور کہا کہ قیامت کے باب میں جو کچھ وارد ہے وہ لذتیں یا تکلیفیں سب روحانی ہیں، یہ لوگ معاد جسمانی کے منکر اور بقائے نفس کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ نفس پر جو کچھ عذاب وثواب ہوگا وہ حسّی نہیں ہوگا،

یہ لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں، فلاسفہ کی اس آزادی اور حنبلیوں کے جمود میں جو بین بین کا درجہ ہے، وہ باریک اور غامض ہے اور اسکو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو توفیق یافتہ ہیں، اور جو تمام چیزوں کو روایت سے نہیں، بلکہ خدائی روشنی سے دیکھتے ہیں، پھر جب اُن پر حقائق امور منکشف ہوجاتے ہیں تو وہ روایت اور الفاظ پر نظر ڈالتے ہیں، ان میں سے جو الفاظ انکشاف کے موافق ثابت ہوتے ہیں، اُن کو بحال خود رہنے دیتے ہیں، اور جو مخالف ہوتے ہیں، اُنکی تاویل کرتے ہیں، باقی جن لوگوں کا مدار صرف روایت پر ہے، تو ان کا قدم کسی مقام پر ٹھہر نہیں سکتا، اور نہ اُن کا کوئی مستقر قرار پا سکتا، اور جو شخص محض روایت پر بھروسہ کرتا ہے، اسکو یہی مناسب ہے کہ امام احمد بن حنبل کا طریقہ اختیار کرے، کیونکہ اعتدال حقیقی کا ظاہر کرنا علم مکاشفہ میں داخل ہے، اور اس میں گفتگو کرنی طول کھینچتی ہے اسلئے ہم اس میں نہیں گھستے،

مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ظاہر وباطن مخالف نہیں ہیں بلکہ موافق ہیں، ان پانچوں اقسام کی تفصیل سے بہت سی باتیں حل ہوگئیں۔"

المصدقين وانما التكذيب — ہے، تکذیب کرنے والا وہ شخص ہے جو

ان ينفي جميع هذه المعاني — ان تمام معانی کی نفی کرتا ہو،

اس کے بعد امام صاحب نے ان مراتب کی ترتیب بتائی ہو، یعنی یہ کہ جس چیز کا ذکر قرآن وحدیث میں ہو، پہلے اُس کا وجود ذاتی ماننا چاہئے، اگر کسی دلیل سے ثابت ہو کہ اس شئے کا وجود ذاتی نہیں ہو سکتا تو حسی، پھر خیالی، پھر عقلی، پھر شبہی، اس کے بعد ان مراتب کی مثالیں دی ہیں، اور لکھا ہے کہ تاویل سے کسی فرقہ کو گریز نہیں، مثلاً احادیث میں آیا ہو کہ اعمال تولے جائیں گے، چونکہ اعمال عرض ہیں اور عرض تولا نہیں جا سکتا، اسلئے ہر فرقہ کو تاویل کرنی پڑی، اشعری نے یہ تاویل کی کہ اعمال نہیں بلکہ اعمال کے کاغذات تولے جائیں گے، معتزلہ نے کہا نہیں وزن سے مراد اندازہ کرنا ہے، حقیقی ترازو مراد نہیں،

امام صاحب نے جو اقسام قرار دیئے اور اُن کی حقیقت بیان کی وہ تاویل کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تمام متاخرین مثلاً امام رازی، آمدی وغیرہ نے تاویل کا فیصلہ اسی بنا پر کیا، لیکن ایک امر پھر بھی مشتبہ رہ گیا، اور امام غزالی کے بعد سے آج تک سیکڑوں غلطیاں جو ہوتی ہیں سب اسی کی بدولت ہیں، امام صاحب نے تاویل کا ایک اصول یہ قرار دیا کہ جب اس بات پر دلیل قطعی موجود ہو کہ ظاہری معنی مراد نہیں ہو سکتے تب اور معانی کی طرف رجوع کرنا چاہئے،' یہ اصول فی نفسہ بالکل صحیح ہے، لیکن دلیل قطعی کا لفظ تشریح طلب ہے، اور یہی لفظ ہے جس کی غلط فہمی نے سیکڑوں غلطیوں کا سلسلہ قائم کر دیا ہے،

وذلك لشدة صفاء باطنهم کماقال اللہ تعالیٰ فتمثل لها بشراً سویاً وکما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رای جبریل کثیراً،

باطن کی وجہ سے بیداری میں معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ خدا نے کہا ہے کہ مریم کے سامنے جبریل ٹھیک آدمی کی صورت بن کر آیا اور جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جبریل کو اکثر دفعہ دیکھا تھا،

(۳) وجود خیالی یعنی وجود ذہنی،

(۴) وجود عقلی، مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ چیز ہمارے ہاتھ میں ہے اور اس سے مراد قبضہ و قدرت ہوتی ہے تو یہ ہاتھ کا وجود عقلی ہے، کیونکہ ہاتھ کی اصلی غرض قبضہ اور قوت ہے،

(۵) وجود شبہی یعنی خود وہ شے موجود نہیں بلکہ اس کے مشابہ ایک چیز موجود ہے، اسکی مثال امام صاحب نے (آگے چل کر) خدا کے غضب وغیرہ سے دی ہے، کیونکہ غضب کے اصلی معنی دل کے خون کا جوش میں آنا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا ان چیزوں سے بری ہے، لیکن خدا میں ایک ایسی صفت پائی جاتی ہے، جو غضب سے مشابہ ہے،

ان اقسام کے بیان کرنے کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں،

اعلم ان کل من نزل قولاً من اقوال الشرع علی درجۃ من هذه الدرجات فهو من

جان لو کہ جو شخص شرع کی کسی بات کو ان درجات میں سے کسی ایک درجہ پر محمول کرتا ہے تو وہ شرع کی تصدیق کرنیوالوں

شخص کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ کشادہ دست ہی، توکیا ان الفاظ کے اصلی معنی مراد لینے میں کوئی استحالہ لازم آتا ہے، کیا اُس شخص کے ہاتھوں کا واقعی کھلا ہونا ناممکن ہے. باوجود اس کے کوئی شخص ان الفاظ کے اصلی معنی مراد نہیں لیتا، بلکہ اس سے سخاوت اور فیاضی کا مفہوم سمجھتا ہی، ہر زبان میں سیکڑوں مجازات ہوتے ہیں کیا ان تمام مجازات میں حقیقی معنی کا مراد لینا کسی محال کا مستلزم ہوتا ہے؟

ان بحثوں کے بعد **محال** کی بحث باقی رہجاتی ہے، محالِ عقلی خود ایک بحث طلب چیز ہے، ایک شخص ایک چیز کو محال سمجھتا ہے، دوسرا نہیں سمجھتا، خدا کا ذوجہت ہونا امام غزالی کے نزدیک محال ہے حنبلیوں کے نزدیک ممکن ہے، موت کا مجسم ہوکر مینڈھا بن جانا اشاعرہ کے نزدیک محال ہے، بہت سے محدثین کے نزدیک ممکن ہے، امام صاحب نے اس بحث کا لحاظ رکھا، اور حنبلیوں کو اس بنا پر کافر نہیں قرار دیا کہ وہ جن چیزوں کو مانتے ہیں مثلاً خدا کا ذوجہت اور ذو اشارہ ہونا وہ گو فی نفسہٖ محال ہے لیکن چونکہ اُن کے نزدیک محال نہیں، اسلئے وہ معذور ہیں، بے شبہہ یہ امام صاحب کی فیاض دلی ہی، لیکن یہ فیاض دلی حنبلیوں ہی تک کیوں محدود رکھی جائے، حکماے اسلام کے نزدیک اعادۂ معدوم عقلاً محال ہے اسلئے وہ حشر اجساد کے قائل نہیں، اُن کو امام صاحب کیوں کافر کہتے ہیں،

لفظ محال کی غلط تعبیر نے وہم پرستیو کی بنیاد ڈالی،

اسی مسئلہ کی غلط فہمی نے ہزاروں وہم پرستیوں کی بنیاد ڈالی ہی، امام غزالی اور امام رازی وغیرہ نے محالِ عقلی کو جن معنوں میں لیا، اسکے لحاظ سے بجز ایک دو چیز کے باقی تمام چیزیں ممکن تھیں، اس لئے ہر جگہ ظاہری معنی کی پابندی کرنی پڑی، اور اسکی بنا پر سیکڑوں دوراز کار

امام صاحب اور امام رازی وغیرہ دلیل قطعی کے یہ معنی قرار دیتے ہیں کہ جب وجود ذاتی یعنی ظاہری معنی کے مراد لینے میں کوئی محال لازم آتا ہو، تو تاویل کرنی چاہئے، محال کا لفظ استعمال میں، محالِ عادی بلکہ مستبعدات پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن امام صاحب محالِ عقلی کی قید لگاتے ہیں، جس کی بنا پر تاویل کا یہ اصول ٹھہرا کہ جب ظاہری معنی کے مراد لینے میں محالِ عقلی لازم آتا ہو، تب تاویل کرنا چاہئے، اس بنا پر امام صاحب حشرِ اجساد کے منکر کو کافر کہتے ہیں، کیونکہ اُن کے نزدیک اجسام کا قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا محالِ عقلی نہیں، اس لئے تاویل کی کوئی ضرورت نہیں،

سب سے پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ خود امام صاحب اور دیگر ائمۂ کلام نے اس اصول کی پابندی کہاں تک کی ہے، امام غزالی اسی کتاب (فیصل التفرقہ) میں حضرت جبریلؑ کے وجود کو جب کہ وہ حضرت مریمؑ کو نظر آئے تھے وجود ذاتی نہیں قرار دیتے، حالانکہ اُن کے نزدیک حضرت جبریلؑ کا وجود ذاتی ممکن بلکہ وقوعی چیز ہے، جمادات کی تسبیح کا قرآن مجید میں جو ذکر ہے، امام صاحب اسکو اصلی معنی پر محمول نہیں کرتے، بلکہ زبانِ حال قرار دیتے ہیں، حالانکہ امام صاحب کے نزدیک جمادات کا تسبیح پڑھنا محالاتِ عقلی میں داخل نہیں، قرآن مجید میں ہے کہ خدا جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے، تو کہتا ہے کہ "ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے"۔ اس کو امام صاحب اصلی معنی پر محمول نہیں کرتے، بلکہ زبانِ حال قرار دیتے ہیں، حالانکہ خدا کا یہ کہنا کوئی محال امر نہیں، اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں، جن کا شمار نہیں ہو سکتا،

امام غزالی وغیرہ کی تحقیقات پر بحث،

اب ہم کو بجائے خود دیکھنا چاہئے کہ یہ اُصول کہاں تک صحیح ہے، ہم جب کسی

استعارات، تشبیہات سبھی کچھ ہیں اور اُسی طرح ہیں جو زبانِ عرب کا عام انداز ہی،

مجازات اور استعارات کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اصلی معنی مراد لینے میں کوئی استحالہ لازم آتا ہو حمالۃ الحطب کے معنی لکڑیاں چننے کے ہیں، لیکن چغل خور کو بھی کہتے ہیں، قرآن مجید میں ابو لہب کی جورو کو حمالۃ الحطب کہا ہے، یہاں اصلی معنی مراد لینے بھی ممکن ہیں، لیکن اہل لغت چغل خور کے معنی لیتے ہیں، اور کوئی شخص اُن کو اس بنا پر کافر یا گمراہ نہیں کہتا کہ اُنھوں نے بلا وجہ اصلی معنی سے عدول کیا،

ظاہری معنی سے عدول کرنے کے لئے یہ لازم نہیں کہ اس کا مراد لینا محالِ عقلی ہو بلکہ اکثر جگہ سیاقِ کلام اور طرزِ استعمال خود بتاتا ہے کہ اصلی معنی مقصود نہیں، قرآن میں ہو کہ ہم نے آسمان و زمین سے کہا کہ تمھاری جی چاہے یا نہ چاہے تم کو حاضر ہونا چاہیئے، دونوں نے کہا کہ ہم خوشی حاضر ہیں، یہاں طرزِ کلام خود بتارہا ہے کہ قدرتِ کاملہ کے اظہار کا یہ ایک پیرایہ ہے،

بعض جگہ سیاقِ کلام دلالت نہیں کرتا، لیکن ظاہری معنی مراد لینے بالکل مستبعد اور دور از کار و ہم پرستی ہوتی ہے، اسلئے وہاں مجازی معنی لئے جاتے ہیں،

تاویل درحقیقت تاویل نہیں ہو۔

ایک اور نکتہ قسم بالشان اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جن چیزوں کو تاویل کہا جاتا ہو اُن پر تاویل کا اطلاق حقیقت میں صحیح نہیں، تاویل کے معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ ظاہری معنی چھوڑ کر دوسرے معنی اختیار کئے جائیں، لیکن ظاہری معنی کی تعبیر غلط کی گئی ہو، استعمال اور محاورہ بھی ظاہری معنی میں داخل ہے، لیکن اسکو لوگ تاویل کہتے ہیں، لغت کی یہ کیفیت ہے کہ اصل میں ایک لفظ کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں، پھر تناسب اور تعلق کے لحاظ سے

باتوں کا قائل ہونا پڑا، اور یہ سلسلہ برابر ترقی کرتا گیا،

روایتوں میں ہے کہ "آفتاب ہر روز عرش کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے"۔ "آسمان پر اس کثرت سے فرشتے ہیں کہ اُن کے بوجھ سے آسمان سے چرچرانے کی آواز آتی ہے"۔ "خدا نے ازل میں حضرت آدمؑ کو جب پیدا کیا تو اُن کی بائیں پسلی نکال لی، اور اُسی سے حضرت حواؑ کو بنایا"۔ "ازل میں حضرت آدمؑ کی پیٹھ سے اُن کی تمام اولاد پیدا کی، پھر اُن سے اپنی خدائی کا اقرار لے کر اُنکو اُن کی پیٹھ میں بھر دیا"۔ "سامری نے حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کے سُم کی خاک اُٹھا لی اور مٹی کا بچھڑا بنا کر وہ خاک اُس کے پیٹ میں ڈال دی، اس کا یہ اثر ہوا کہ بچھڑا بولنے لگا"۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام واقعات میں ظاہری معنی مراد لینے میں اشاعرہ کے نزدیک محال عقلی لازم نہیں آتا، اس لئے ظاہری معنی لینے پڑے،

محال عقلی ہی کی یہ تشریح ہے، جس نے تمام مسلمانوں کو آج وہم پرستیوں میں مبتلا کر رکھا ہے، ایک شخص آکر کہتا ہے کہ فلاں درویش نے دریا کا تمام پانی دودھ کر دیا، فلاں مجذوب نے اپنے بدن کی کھال اُتار کر رکھدی، فلاں بزرگ نے سیکڑوں مردے زندہ کر دیئے، چونکہ یہ تمام واقعات اشاعرہ کی تشریح کے موافق محال نہیں ہیں، اسلئے راوی کے متعلق کسی قسم کی تحقیق و تنقید کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ یہ کہکر تسلیم کر لئے جاتے ہیں کہ ان میں استحالہ کیا ہے؟ اور جب کوئی استحالہ نہیں تو نہ ماننے کی کیا وجہ ہے،

اصل یہ ہے کہ قرآن مجید اگرچہ خدا کا کلام ہے، لیکن عرب کی زبان میں اُترا ہے، اسلئے زبان عرب کی جو خصوصیات ہیں سب اس میں پائی جاتی ہیں، اور پائی جانی چاہئیں، اس میں مجازات،

بعض ایسے ہیں جو اگر صاف صاف بیان کر دیئے جاتے تب بھی سمجھ میں آسکتے تھے لیکن ان کو استعارہ اور تشبیہ کے پیرایہ میں اس غرض سے بیان کیا گیا کہ یہ طریقہ زیادہ موثر اور واقع فی النفس ہے مثلاً خدا کی قدرتِ کاملہ کو ان لفظوں سے ادا کیا گیا کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے "ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے،، امام غزالی اس صورت کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں نے قیامت کے واقعات مثلاً میزان، پل صراط وغیرہ کو اسی قسم میں داخل کیا ہے، لیکن یہ بدعت ہے، کیونکہ ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی استحالہ لازم نہیں آتا"

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ امام صاحب کی یہ رائے احیاء العلوم اور کتب کلامیہ کیساتھ مخصوص ہے، ورنہ جواہر القرآن اور مضنون وغیرہ میں واقعاتِ قیامت کے متعلق اُن کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

بعض جگہ حال کو زبانِ قال سے ادا کیا ہے مثلاً جمادات کی تسبیح،

ان مختلف اقسام کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت میں جب کسی چیز کے وجود کا ذکر ہو تو یہ ضرور نہیں کہ خواہ مخواہ وجود خارجی مقصود ہو، بلکہ ممکن ہو کہ وجود حسی یا خیالی یا عقلی یا شبہی مراد ہو، جیسا کہ امام غزالی نے یہ تفصیل بیان کیا،

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل مطلب شروع کرتے ہیں،

اور اور معنی پیدا ہوتے جاتے ہیں، مثلاً اخبات کے اصلی معنی پستی میں آنے کے ہیں لیکن تواضع اور انکسار کو بھی اخبات کہتے ہیں، اور اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ تواضع کرنا گویا پستی میں آنا ہے لفظ کے اصلی معنی پھینکنے کے ہیں، پھر لفظ کو اس وجہ سے لفظ کہنے لگے کہ وہ بھی گویا زبان سے پھینکے جاتے ہیں، یہ معانی حقیقت میں درجہ دوم کے معنی ہیں جن کو انگریزی میں سکنڈری معنی کہتے ہیں، لیکن اس قسم کے تمام معانی لغت میں داخل کر لئے گئے ہیں، اور اصلی معنی قرار پا گئے ہیں، عربی زبان میں جو ایک لفظ کے دس دس اور بیس بیس معنی ہوتے ہیں، ان میں اصلی معنی درحقیقت ایک ہی ہوتے ہیں، لیکن مناسبت کی وجہ سے اور اور معنی پیدا ہوتے جاتے ہیں، اور وہ سب اصلی قرار پاتے ہیں، ورنہ اگر صرف اصلی معنی پر حصر کیا جائے تو لغت کی کتابوں کی ضخامت آدھی بلکہ چوتھائی سے کم رہ جائے،

اس بنا پر جس چیز کو تاویل کہتے ہیں، وہ تاویل نہیں کیونکہ جس معنی میں اُن کا استعمال ہوا ہے وہ بھی ظاہری ہی معنی ہیں،

غرض فذلکۂ سخن یہ ہے کہ شرع میں جو امور بظاہر قابلِ بحث نظر آتے ہیں، ان کی متعدد صورتیں ہیں، بعض امور ایسے ہیں جو عام ادراک سے باہر ہیں، اُن کی حقیقت کے اظہار سے یا تو شریعت نے بالکل اعراض کیا ہے یا تشبیہ و تمثیل کے طریقہ سے بیان کیا ہے کہ ایک سرسری اور اجمالی خیال قائم ہو سکے،

بعض ایسے ہیں جو چنداں دقیق نہیں لیکن اسکی حقیقت کا اظہار جمہور عوام کے حق میں مضر ہے،

یہ دعویٰ جس قدر عجیب و غریب ہے، دلیل اس سے زیادہ عجیب ہے،

لانا نری الجسم الکبیر من	کیونکہ ہم بڑے جسم کو دور سے چھوٹا دیکھتے
البعید صغیرا وما ذالک	ہیں اور اسکی صرف یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ ہمکو
الا لانا نری بعض اجزائہ	اسکے بعض اجزا نظر آتے ہیں اور بعض نہیں،
دون البعض مع تساوی الکل	حالانکہ جو شرائط رویت کے ہیں وہ تمام
فی حصول الشرائط	اجزا میں پائے جاتے ہیں،

یہی طفلانہ استدلالات اور احتمالات ہیں جنھوں نے آج قوم کی قوم کو نظر بندی اور اور بیسیوں دور از کار باتوں کا معتقد بنادیا ہے،

لیکن اشاعرہ ظاہرین کے سوا اور لوگ اس قسم کے دور از کار خیالات کے کیونکر قائل ہوسکتے تھے، امام غزالی، شیخ الاشراق، شاہ ولی اللہ صاحب اور اور محققین نے اصل حقیقت پر توجہ کی اور اس عقدہ کو حل کیا، ان لوگوں کا مذہب ہے کہ شریعت میں جن چیزوں کا ذکر ہے، اُن کی دو قسمیں ہیں، محسوسات عام، غیر محسوسات عام، رویت، احساس اور تجربہ یہ تمام چیزیں صرف محسوسات عام سے متعلق ہیں، غیر محسوسات کو ان چیزوں سے واسطہ نہیں لیکن باایں ہمہ غیر محسوسات بھی حقائق موجودہ ہیں، کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ جو شے خارج میں موجود یا محسوس عام نہ ہو، وہ واقع میں بھی نہ ہو کیونکہ واقعیت وجود خارجی پر محدود نہیں،

روحانیات کا وجود کس قسم کا ہے،

لیکن چونکہ حقائق واقعیہ کے لئے آخر کسی نہ کسی قسم کا وجود ضرور ہے، اسلئے محققین

رُوحانیاتؔ[1] یا غیر محسوسات

ملائکہ ۔ وحی ۔ واقعاتِ قیامت وغیرہ وغیرہ

چونکہ یہ تمام چیزیں قرآن مجید میں مذکور ہیں، اسلئے ان پر ایمان لانا واجب، اور شرط اسلام ہے اور اس لئے تمام اسلامی فرقوں میں اجمالاً یہ عقائد مسلّم ہیں لیکن چونکہ قرآن مجید میں اُن کی کیفیت مذکور نہیں، اسلئے ان کی تشریح مختلف فرقوں نے مختلف طریقوں سے کی اشاعرہ نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شے موجود ہو اور نظر بھی آئے، اس بنا پر ممکن ہے کہ یہ تمام چیزیں موجود ہوں اور نظر نہ آئیں،

شرحِ مواقف میں رویتِ باری کی بحث میں ہے،

لا نسلم وجوب الرؤیۃ عند	ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ رویت کی جب آنکھوں میں شرطیں
اجتماع الشروط الثمانیۃ	موجود ہوں، تو خواہ مخواہ وہ شے نظر آئے

[1] کتاب کا یہ باب بہت ناقص ہے، اس میں ملائکہ اور واقعاتِ قیامت وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، باقی مباحث کا تعلق غیر مادی مرئیات اور مسموعات سے ہے، جو انبیاء کو محسوس ہوتے ہیں، یا برزخ میں پیش آتے ہیں، البتہ علامہ ابن تیمیہ کی عبارت بے شبہہ بہشت و دوزخ کی کیفیات سے متعلق ہے، مگر عبارت پوری نہیں نقل کی گئی ہے، "س، س، ن"

والسلام یرون ذالک فی الیقظة | کی حالت میں دیکھتے ہیں، اور یہ چیزیں اُن سے
وتخاطبھم ھذہ الاشیاء فی الیقظة | بیداری کی حالت میں خطاب کرتی ہیں،

قبر کے واقعات کو بھی امام صاحب اسی عالم کے واقعات قرار دیتے ہیں چنانچہ الغزالی میں ہم نے امام صاحب کے اصلی الفاظ نقل کئے ہیں،

شیخ الاشراق کا مذہب

شیخ الاشراق کا یہ مذہب ہے کہ عالم محسوسات کے سوا، ایک اور عالم ہے، جسکو عالمِ اشباح یا عالمِ امثال کہتے ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ میں یا آئینہ میں جو صورتیں نظر آتی ہیں، وہ درحقیقت متخیلہ اور آئینہ میں موجود نہیں ہیں، بلکہ یہ چیزیں اُن کے ظہور کا ایک آلہ ہیں، اور چونکہ اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ واقعی چیزیں ہیں اسلئے ضرور ہے کہ ایک عالم اشباح اور امثال تسلیم کیا جائے جہاں ان صورتوں کا اصلی وجود ہے، شیخ الاشراق جن اور شیاطین کو بھی اسی عالم میں شمار کرتے ہیں، ان کے نزدیک حشر اجساد اور بہشت و دوزخ وغیرہ سب کا وجود اسی قسم میں داخل ہے،

چنانچہ حکمۃ الاشراق میں عالم اشباح کا ذکر کر کے لکھتے ہیں،

وبہ تحقق بعث الاجساد | قیامت میں اجسام کا زندہ ہونا، اور
والاشباح الربانیۃ وجمیع | اشباح ربانی اور نبوت کے تمام وعدے
مواعید النبوۃ، | اسی عالمِ اشباح سے ثابت ہوتے ہیں

اسی کتاب میں ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

وما یسمع المکاشفون | اور اہلِ کشف (یعنی پیغمبر و اولیا)

محققینِ اسلام نے اس کے مختلف نام رکھے،

امام غزالی اس وجود کو وجود حسّی سے تعبیر کرتے ہیں اور اسکی تعریف جیسا کہ ہم تاویل کی بحث میں اُن کی اصلی عبارت نقل کر آئے ہیں، یہ لکھتے ہیں کہ یہ وجود صرف خاص شخص کے حاسّہ سے تعلق رکھتا ہے،

انبیا کو ملائکہ کی صورت جو نظر آتی ہے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حضرت جبرئیل جس طرح مرئی ہوتے ہیں، حضرت مریمؑ نے حضرت جبرئیلؑ کو جس صورت میں دیکھا تھا، امام صاحب سب کو اسی وجود کے تحت میں داخل کرتے ہیں، چنانچہ تاویل کی بحث میں، امام صاحب کی اصلی عبارت ہم نقل کر آئے ہیں،

مضنون بہ علی غیر اہلہ میں امام صاحب نے معجزات کی بحث میں اس وجود کو خیالی کے نام سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

ان لسان الحال لیصیر مشاھدًا	زبانِ حال، بطور تمثیل کے مشاہد
محسوسًا علی سبیل التمثیل وھذا	اور محسوس بن جاتی ہے، اور یہ
خاصة الانبیاء والرسل علیھم	انبیا اور رُسل کا خاصہ ہے جس طرح
الصلوٰة والسلام کما ان لسان	کہ خواب کی حالت میں زبانِ حال
الحال یتمثل فی المنام لغیر	عام لوگوں کے لئے متمثل ہو جاتی ہے تو
الانبیاء ویسمعون صوتًا وکلامًا	وہ لوگ آوازیں اور باتیں سنتے ہیں،
فالانبیاء علیھم الصلوٰة و	تو انبیا علیہم السلام، ان چیزوں کو بیداری

وقد یری الصور التی تخاطب	نہایت لطیف صنعتی پیکروں میں
کالتماثیل الصناعیۃ فی غایۃ	نظر آتی ہیں، اور کبھی پُر خطر معلوم
اللطف وقد ترد علیھم فی	ہوتی ہیں، اور کبھی وہ لوگ معلق مثالیں
خطرۃ وقد یرون مثلاً معلقۃ	دیکھتے ہیں، اور جو کچھ خواب میں پہاڑ
وجمیع ما یری فی المنام	دریا، زمین سخت آوازیں اور
من الجبال والبحور والارضین	اشخاص نظر آتے ہیں، یہ سب مثالی
والاصوات العظیمۃ والا	صورتیں ہیں جو بذاتِ خود قائم ہیں،

شاہ ولی اللہ صاحب کی رائے

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس بحث کو زیادہ مفصل لکھا ہے، اُنھوں نے ان نصوص کو جنمیں اس قسم کی موجودات کا ذکر ہے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے، پھر لکھا ہو کہ ان نصوص پر جو شخص نظر ڈالے گا، اس کو مجبوراً تین باتوں سے ایک کا قائل ہونا پڑیگا، یا یہ تسلیم کرے کہ محسوسات کے علاوہ ایک عالمِ مثال بھی ہے،، (شاہ صاحب اس عالمِ مثال کو محدثین کے اصول کے موافق بتاتے ہیں) یا اس بات کا قائل ہو کہ خاص اس شخص کو ایسا نظر آتا ہے گو اس کے حاسہ سے باہر اس کا وجود نہیں یا یہ کہ یہ واقعات بطورِ تمثیل کے بیان ہوئے ہیں، ان احتمالات کو لکھ کر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص صرف تیسرے ہی احتمال پر قناعت کرتا ہے، میں اسکو اہلِ حق سے نہیں سمجھتا، شاہ صاحب تو فقط تیسرے احتمال کو باطل قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے علماء دو پہلے احتمالات کو بھی تسلیم کرلیں تو بڑا مرحلہ طے ہو جائے، اور فلسفہ زبانِ حال سے بول اُٹھے کہ

كالانبياء[1] والاولياء من الاصوات
الهائلة لا يجوز ان يقال انه
تموج هواء في دماغ فان الهواء
تموجه بتلك القوة لمصاكته
الدماغ لا يتصور بل هو مثال
الصوت اي الموجود في عالم المثال

جو ہیبت ناک آوازیں سنتے ہیں اُن کی
نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دماغ
میں ہوا کے تموج سے پیدا ہوئی ہیں کیونکہ
ہوا کا تموج جو اس زور کے ساتھ دماغ
سے ٹکرائے خیال میں نہیں آ سکتا بلکہ وہ اس
آواز کی تصویر ہے جو عالم مثال میں موجود ہے

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

وما يتلقى الانبياء والاولياء
وغيرهم من المغيبات فانها
قد ترد عليهم في اسطر مكتوبة
وقد ترد بسماع صوت قد
يكون لذيذا وقد يكون
هائلا وقد يشاهدون صورا
الكائنات وقد يرون صورا
حسنة انسانية تخاطبهم
في غاية الحسن فتناجيهم بالغيب

اور پیغمبروں کو اور اولیاء کو عالم غیب کی
جو باتیں معلوم ہوتی ہیں تو وہ کبھی لکھی ہوئی
سطروں میں نظر آتی ہیں، کبھی آواز
کی صورت میں جو کبھی لذیذ ہوتی ہے اور
کبھی مہیب اور کبھی وہ لوگ کائنات
کی صورتیں دیکھتے ہیں جو اُن سے نہایت
لطف کے ساتھ خطاب کرتی ہیں اور
ان سے غیب کی باتیں کہتی ہیں، اور
کبھی وہ صورتیں جو خطاب کرتی ہیں

---

[1] اس عبارت میں جو تفسیری جملے ہیں شرح حکمۃ الاشراق کے ہیں،

وقال ان البقرة وآل عمران
تأتيان يوم القيامة كانهما
غمامتان او غيايتان او فرقان
من طير صواف تحاجان من اهلهما
وقال تجئ الاعمال يوم القيمة
فتجئ الصلوة ثم تجئ الصدقة
ثم تجئ الصيام الحديث وقال
ان المعروف والمنكر لخليقتان
تنصبان للناس يوم القيمة
فاما المعروف فيبشر اهله
واما المنكر فيقول اليكم اليكم ولا
يستطيعون له الا لزوما وقال
ان الله تعالى يبعث الايام
يوم القيمة كهيئتها ويبعث
الجمعة زهراء منيرة وقال
يؤتى بالدنيا يوم القيمة في
صورة عجوز شمطاء زرقاء نابها

پناہ مانگ کر تیرے پاس پناہ ڈھونڈتا
ہے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ
سورہ بقرہ اور آل عمران قیامت میں بادل
یا سائبان یا صف بستہ پرندوں کی شکل
میں آئیں گی اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت
کریں گی جنھوں نے ان کی تلاوت کی ہے
اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے
کہ قیامت میں اعمال حاضر ہونگے تو پہلے
نماز آئے گی، پھر خیرات، پھر روزہ الخ
اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ نیکی او
بدی دو مخلوق ہیں، جو قیامت میں لوگوں
کے سامنے کھڑی کی جائیں گی، سو نیکی
نیکی والوں کو بشارت دیگی، اور برائی والوں
کو کہے گی کہ ہٹو ہٹو لیکن وہ لوگ اس سے چمٹے ہی
رہیں گے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے
کہ قیامت میں اور جتنے دن ہیں وہ معمولی
صورت میں حاضر ہونگے لیکن جمعہ کا دن

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح افتاد

بہر حال ہم شاہ صاحب کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں،

باب ذکر عالم المثال

اعلم انہ دلت احادیث کثیرۃ
علی ان فی الوجود عالماً غیر عنصری
یتمثل فیہ المعانی باجسام
مناسبۃ لہا فی الصفۃ و یتحقق
ھنالک الاشیاء قبل وجودھا
فی الارض نحواً من التحقق فاذا
وجدت کانت ھی ھی بمعنی
من معانی ھو ھو،
وان کثیرا من الاشیاء مما لا
جسم لہا عند العامۃ تنتقل
و تنزل ولا یراھا جمیع الناس
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما خلق اللہ
الرحم قامت فقالت ھذا
مقام العائذ بک من القطیعۃ

عالمِ مثال کا ذکر

جاننا چاہیے کہ بہت سی حدیثوں سے ثابت
ہوتا ہے کہ عالمِ موجودات میں ایسا عالم بھی
ہے جو غیر عنصری ہے اور جس میں معانی اُن اجسام کی
صورت میں متشکل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے
اُنکے مناسب ہیں، پہلے اس عالم میں اشیاء کا ایک
گونہ وجود ہو لیتا ہے تب دنیا میں ان کا وجود
ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے
بالکل اس عالمِ مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے
اکثر وہ اشیاء جو عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں
اس عالم میں منتقل ہوتی ہیں اور اترتی ہیں اور
عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ہے کہ جب خدا نے رحم کو پیدا
کیا تو وہ کھڑی ہو کر بولی کہ یہ اس
شخص کا مقام ہے جو قطعِ رحم سے

ربطت الهرة حتى ماتت	ہاتھ پھیلایا کہ بہشت میں سے انگور کا ایک خوشہ توڑلوں
ورای فی الجنة امرأة	لیکن دوزخ کی گرمی کی لپیٹ سے رک گیا اور حدیث
مومسة سقت الکلب و	میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجیوں کے چور
معلوم ان تلك المسافة	کو اور ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی
لا تسع الجنة والنار باجسادهما	کو باندھکر مار ڈالا تھا اور ایک فاحشہ عورت کو بہشت
المعلومة عند العامة	میں دیکھا جس نے کتے کو پانی پلایا تھا اور یہ ظاہر ہے
وقال حفت الجنة بالمکارہ	کہ بہشت اور دوزخ کی وسعت جو عام لوگوں کے
وحفت النار بالشهوات	خیال میں ہے وہ اسقدر مسافت (یعنی کعبہ کی دیواری) میں نہیں سما سکتی اور حدیث میں ہے کہ بہشت کو مکروہات نے اور دوزخ کو شہوات نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے
ثم امر جبریل ان ینظر الیهما	پھر جبرئیل کو خدا نے حکم دیا کہ دونوں کو دیکھیں
وقال ینزل البلاء فیعالجها	اور حدیث میں ہے کہ بلا اترتی ہے تو دعا اس کا
الدعاء وقال خلق الله	توڑ کرتی ہے اور حدیث میں ہے کہ خدا نے عقل کو
العقل فقال له اقبل فاقبل	پیدا کیا اور اس سے کہا کہ آگے آ تو وہ آگے آئی پھر
وقال له ادبر فادبر وقال	کہا کہ پیچھے ہٹ تو ہٹ گئی اور حدیث میں ہے
هذان کتابان من رب	کہ یہ دونوں کتابیں پروردگار عالم کی
العالمین الحدیث وقال	طرف سے ہیں الخ اور حدیث میں ہے کہ موت ایک
یؤتی بالموت کانه کبش	مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی پھر دوزخ
فیذبح بین الجنة والنار	اور بہشت کے درمیان ذبح کردی جائیگی

مشوه خلقها وقال هل ترون
ما ارى فانى لارى مواقع الفتن
خلال بيوتكم كمواقع القطر
وقال فى حديث الاسراء
فاذا اربعة انهار نهران
باطنان ونهران ظاهران
فقلت ما هذا يا جبريل قال
اما الباطنان ففى الجنة واما
الظاهران فالنيل والفرات
وقال فى حديث صلوة الكسوف
صورت لى الجنة والنار
فى لفظ بينى وبين جدار
القبلة وفيه انه بسط
يده ليتناول عنقودا من الجنة
وانه تكعكع من النار
نفح من حرها وراى فيها
سارق الحجيج والامرأة التى

چمکتا دمکتا ہوا آئیگا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے
فرمایا ہے کہ قیامت میں دنیا ایک بڑھیا کی
صورت میں لائی جائیگی جس کے بال کھچڑی
دانت نیلے اور صورت بدنما ہوگی اور آنحضرت (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جو میں دیکھتا ہوں کیا تم
بھی دیکھتے ہو، میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے
گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح بادل
کے قطرے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معراج
کی حدیث میں فرمایا کہ اچانک چار نہریں نظر
آئیں، دو نہریں اندر تھیں اور دو باہر، میں نے
جبریل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، بولے اندر کی
نہریں تو جنت کی ہیں اور باہر کی نیل اور
فرات ہیں، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسوف
کی نماز کے متعلق فرمایا کہ بہشت اور دوزخ میرے
سامنے مجسم کرکے لائی گئیں اور ایک روایت
میں ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیواروں کے بیچ
میں بہشت و دوزخ مجسم ہوکر آئیں ہیں نے

والمغرب وقال النبي صلى الله
عليه وسلم ليسلط على الكافر
في قبره تسعة وتسعون
تنينا تنهسه وتلدغه
حتى تقوم الساعة وقال اذا
ادخل الميت القبر مثلت
له الشمس عند غروبها فيجلس
يمسح عينيه ويقول دعوني
اصلي واستفاض في الحديث
ان الله تعالى يتجلى بصور
كثيرة لاهل الموقف وان
النبي صلى الله عليه وسلم
يدخل على ربه وهو على كرسيه
وان الله يكلم ابن آدم شفاها
الى غير ذالك مما لا يحصى
كثرة،
والناظر في هذه الاحاديث

سنتی ہیں، اور حدیث میں ہے کہ قبر میں کافر
کے اوپر ننانوے اژدہے مسلط ہوتے ہیں
جو اس کو کاٹتے ہیں، تا بہ قیامت،
اور حدیث میں ہے کہ جب مردہ قبر میں
آتا ہے تو اُس کو نظر آتا ہے کہ آفتاب
غروب ہو رہا ہے، وہ اُٹھ بیٹھتا ہے اور
کہتا ہے کہ ٹھہرو میں نماز پڑھ لوں اور
حدیث میں اکثر جگہ آیا ہے کہ قیامت
میں خدا بہت سی مختلف صورتوں
میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا
اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے پاس
اس حالت میں جائیں گے کہ خدا
اپنی کرسی پر بیٹھا ہوگا، اور یہ کہ خدا
انسانوں سے بالمشافہ بات چیت کریگا،
اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں
جن کا شمار نہیں ہو سکتا،
ان حدیثوں کو جو شخص دیکھے گا

وقال تعالیٰ فارسلنا الیها	اور خدا نے فرمایا کہ ہم نے روح، مریم
روحنا فتمثل لها بشرا سویا	کے پاس بھیجی تو وہ اُن کے سامنے ٹھیک
واستفاد فی الحدیث ان	آدمی کی شکل بنکر آئی، اور حدیث سے ثابت
جبرئیل کان یظهر للنبی صلی اللّٰه	ہوتا ہے کہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
علیه وسلم ویتراای له	آتے تھے اور آپ سے باتیں کہتے تھے
فیکلمه ولا یراه سائر	اور کوئی انکو نہیں دیکھتا تھا، اور حدیث میں ہے
الناس وان القبر یفسح سبعین	کہ قبر ہفتاد در ہفتاد گز چوڑی ہو جاتی ہے
ذراعا فی سبعین او یضم حتیٰ	یا اس قدر سمٹ آتی ہے کہ مردہ کی پسلیاں
تختلف اضلاع المقبور	بھرکس ہو جاتی ہیں اور حدیث میں ہے کہ فرشتے
ان الملئکة تنزل علی المقبور	قبر میں آتے ہیں اور مردہ سے سوال
فتسأله وان عمله یتمثل	کرتے ہیں، اور مردہ کا عمل مجسم ہو کر
له وان الملئکة تنزل	اُسکے سامنے آتا ہے، اور نزع کی حالت
الی المحتضر بایدیهم الحریر	میں فرشتے حریر یا گزی کا کپڑا لے کر
او المسح وان الملئکة	آتے ہیں، اور فرشتے مردہ کو لوہے
تضرب المقبور بمطرقة	کے گرز سے مارتے ہیں، مردہ شور
من حدید فیصیح صیحة	کرتا ہے اور اُسکے شور کی آواز
یسمعها ما بین المشرق	مشرق سے مغرب تک کی چیزیں

ابن الماجشون ان کل حدیث جاء فی التنقل والرؤیۃ فی المحشر فمعناہ انہ یغیر ابصار خلقہ فیرونہ نازلا متجلیا ویناجی خلقہ ویخاطبہم وھو غیر متغیر عن عظمتہ ولا متنقل لیعلموا ان اللہ علی کل شیٔ قدیرا او یجعلھا تمثیلا لتفہم معان اخری و لست ادری المقتصر علی الثالثۃ من اھل الحق،

ابن ماجشون (مشہور محدث تھے) ان سے مروی ہے کہ جن حدیثوں میں خدا کے اُترنے اور مرئی ہونیکا ذکر ہے انکے معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوقات کی نظر میں ایسا تغیر پیدا کردیگا کہ وہ خدا کی ایسی حالت میں دیکھیں گے کہ وہ اتر رہا ہے اور تجلی کر رہا ہے اور اپنے بندوں سے گفتگو اور خطاب کر رہا ہے، حالانکہ خدا کی جو شان ہے نہ اسمیں تغیر ہوگا نہ خدا منتقل ہوگا، اور یہ اسلیئے ہوگا کہ لوگ جان لیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سب باتیں بطور تمثیل کے بیان کی گئی ہیں جن سے اور مطالب کا ذہن نشیں کرنا مقصود ہے لیکن جو شخص صرف اسی احتمال پر اکتفا کرتا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اہل حق میں سے ہے،

شاہ صاحب ایک اور عالم کے قائل ہیں جس کو وہ عالمِ مثال اور عالمِ محسوسات کے بیچ بیچ میں قرار دیتے ہیں اور اس کا نام عالم برزخ رکھتے ہیں، چنانچہ وحی، رویتِ ملائکہ معراج نبوی، براق، سدرۃ المنتہیٰ، انہار جنت وغیرہ وغیرہ ان سب واقعات کی تفسیر اسی عالم کی بنا پر کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت لکھی ہے، وحی کی

لہ از صفحہ ۳۸۵ تا ۳۸۷،

بين احدى ثلث امان يقر
بظاهر ما فيضطر الى اثبات
عالم ذكرنا شانه وهذه
هي التي يقتضيها قاعدة
اهل الحديث، نبه على
ذالك السيوطي رحمه الله
تعالى وبها اقول واليها اذهب
او يقول ان هذه الوقائع
تترائ لحس الرائي وتتمثل
له في بصره وان لم تكن خارج
حسه وقال بنظير ذالك عبد الله
ابن مسعود في قوله تعالى يوم
تاتي السماء بدخان مبين"
انهم اصابهم جدب فكان
احدهم ينظر الى السماء
فيرى كهيئة الدخان
من الجوع ويذكر عن

تین باتوں میں سے ایک نہ ایک بات
اس کو ماننی پڑیگی، یا تو ظاہری معنی
مراد لے اور اس صورت میں اُس کو
ایک ایسے عالم کا قائل ہونا پڑیگا
جسکی کیفیت ہم بیان کرچکے (یعنی عالم
مثال) اور یہ صورت وہ ہی جو اہل حدیث
کے قاعدے کے مطابق ہے، چنانچہ
سیوطی نے اسکی طرف اشارہ کیا ہی، اور خود
میری بھی یہی رائے اور یہی مذہب ہی، یا اس بات
کا قائل ہو کہ دیکھنے والے کے حاسہ میں
واقعات کی یہی شکل ہوگی، اور اسکی نظر میں
وہ اسی طرح جلوہ گر ہونگے، گو اسکے حاسہ کے باہر انکا
وجود نہو چنانچہ قرآن مجید میں جو آیا ہی کہ اس آسمان
دن صاف دھواں نظر آئیگا، اسکے معنی حضرت عبد اللہ
ابن مسعودؓ نے اسکے قریب قریب لئے ہیں یعنی یہ کہ
لوگوں پر قحط پڑا تھا تو جب کوئی آسمان کیطرف دیکھتا تھا
تو اسکو بھوک کیوجہ سے آسمان دھواں سا معلوم ہوتا تھا

پھر معراج کے متعلق لکھتے ہیں،

وکل ذالک لجسدہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ ولکن ذالک فی موطن ھو برزخ بین المثال والشہادۃ جامع لاحکامھما فظھر علی الجسد احکام الروح وتمثل الروح والمعانی الروحیۃ اجسادا ولذالک بان لکل واقعۃ من تلک الوقائع تعبیر وقد ظھر لحزقیل وموسی وغیرھم علیھم السلام نحو من تلک الوقائع وکذالک لاولیاء الامۃ

اور یہ سب واقعات آپ کے جسم پر حالتِ بیداری میں گذرے لیکن اُس عالم میں جو مثال اور شہادت کے بیچ بیچ میں ہے اور دونوں کے آثار کا جامع ہے، تو جسم پر روح کے واقعات ظاہر ہوئے، اور روح اور روحانی باتیں مجسم بن کر نظر آئیں اور یہی وجہ ہے ان واقعات میں ہر واقعہ کی الگ تعبیر ظاہر ہوئی، اور خرقیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام وغیرہ کو بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے اور اسی طرح اولیا کو بھی پیش آتے ہیں،

اس کے بعد انہی اصول پر شاہ صاحب نے براق، ملاقاتِ انبیاء، عروجِ افلاک، سدرۃ المنتہیٰ، بیت المعمور وغیرہ کی تشریح کی ہے،

شاہ صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت حکیمانہ اور محققانہ ہے، لیکن کسی قدر خلط مبحث

نسبت پہلے یہ حدیث نقل کی ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کبھی تو اس طرح آتی تھی کہ گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی اور کبھی فرشتہ مجسم ہو کر نظر آتا تھا، پھر اسکی حقیقت اس طرح بیان کی ہے،

اما الصلصلة فحقيقتها	باقی صلصلہ (گھنٹے کی آواز) تو اس کی
ان الحواس اذا صادمها تاثیر	حقیقت یہ ہے کہ حواس پر جب کسی
قوی تشوشت فتشويش	قوی تاثیر کا صدمہ پہنچتا ہے تو وہ مشوش
قوة البصر ان يرى الوان	ہو جاتا ہے، تو قوتِ بصارت کی تشویش
الحمرة والصفرة والخضرة	یہ ہے کہ سرخ زرد و سبز رنگ نظر آتے ہیں
وتشويش قوة السمع ان يسمع	اور قوتِ سمع کی تشویش یہ ہے کہ
اصواتا مبهمة كالطنين	مبہم آوازیں سننے میں آئیں، مثلاً
والصلصلة والهمهمة	طنین، صلصلہ، ہمہمہ، پھر جب اثر
فاذا اتم الاثر حصل العلم	پورا ہو چکتا ہے تو علم حاصل ہو جاتا
واما التمثل فهو في موطن	ہے، باقی فرشتہ کا مجسم بن کر آنا تو
يجمع بعض احكام المثال	یہ اس عالم کی بات ہے جس میں عالمِ
والشهادة ولذالك كان	مثال اور عالمِ شہادت کے بعض
يرى الملك بعضهم	آثار مجتمع ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے
دون بعض،	کہ فرشتہ بعض کو نظر آتا تھا اور بعض کو نہیں۔

ثم[1] ان الله سبحانه وتعالیٰ	پھر خدائے پاک نے ہمکو اُس آرام
اخبرنا بما وعدنا به	اور رنج کی خبر دی جس کا قیامت میں
فی الدار الآخرة من النعیم و	وعدہ کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ
العذاب واخبرنا بما یوکل	طعام، شراب، ازواج اور فرش
و یشرب وینکح ویفرش و	کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی چیزوں
غیر ذلك فلولا معرفتنا	سے ہم دنیا میں واقف نہ ہو چکے ہوتے
بما یشبه ذلك فی الدنیا	تو اُن موعود چیزوں کو کیوں کر
لم نفهم ما وعدنا به ونحن	سمجھ سکتے تاہم ہم یہ بھی جانتے
نعلم مع ذلك ان تلك	ہیں کہ یہ چیزیں دنیاوی چیزوں کے
الحقائق لیست مثل هذه	مانند نہیں ہیں یہاں تک کہ حضرت ابن
حتی قال ابن عباس لیس	عباسؓ کا قول ہے کہ دنیا اور آخرت
فی الدنیا مما فی الجنة	کی چیزوں میں نام کے سوا اور کسی
الا الاسماء[2]	چیز میں مشارکت نہیں،

[1] رسالہ شرح حدیث نزول [2] اور اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ کی عبارت یہ ہے،

وهذا تفسیر قوله تعالیٰ واتوا به	اور یہی مطلب آیت قرآنی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اس [illegible]
متشابها علی احد الاقوال فبین هذه	کہ جنت میں انکو دنیا کی نعمتوں سے مشابہ نعمتیں
الموجودات فی الدنیا وتلك الموجودات	دیجائینگی، تو دنیا میں جو چیزیں موجود ہیں ان
فی الآخرة مشابهة وموافقة واشتراك	میں اور آخرت کی چیزوں میں ایک گونہ بہت مشابہت

ہوگیا ہے، اُنھوں نے عالم مثال اور برزخ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ مجازات و استعارات کو بھی عالم مثال میں داخل کر لیا ہے، مثلاً یہ حدیث کہ قیامت میں موت مینڈھے کی صورت میں آئے گی، اور ذبح کر دی جائے گی، صرف بیان کا ایک پیرایہ ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ مابعد الموت پھر موت نہیں، شاہ صاحب اس کو بھی عالم مثال کا واقعہ قرار دیتے ہیں،

امام غزالی، شیخ الاشراق اور شاہ ولی اللہ صاحب کے بیان میں جو جزئی تفاوت ہے اس سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو قدر مشترک یہ ہوگا کہ شریعت میں جو امور بظاہر خلاف عقل ہیں، اُن کی حسب ذیل قسمیں ہیں،

شریعت میں جو امور خلاف عقل ہیں انکے اقسام

(۱) اکثر جگہ محض مجاز و استعارہ ہے، مثلاً جمادات کی تسبیح، آسمان و زمین سے خطاب اور اُنکا جواب، ازل میں بنی آدم کا اقرار، خدا کا عرش پر متمکن ہونا وغیرہ وغیرہ،

(۲) روحانیات کو جسمانیات کے پیرایہ میں ادا کیا ہے، اور یہ طریقہ تمام مذاہب میں مشترک ہے، انسان صرف اُن چیزوں کا تصور کر سکتا ہے، جو اُس نے حواس سے محسوس کی ہوں، اسلئے جب ان چیزوں کا بیان کرنا ہوگا جو آیندہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اسکے تصور سے بالکل بالاتر ہیں، تو ضرور ہے کہ ان کو جسمانیات کے پیرایہ میں ادا کیا جائے، مثلاً موت کے بعد جو راحت و رنج ہوگا، اس کو بجز اُس کے کہ باغ و انہار اور کژدم و مار سے تعبیر کیا جائے اور کیا طریقہ ہے، علامہ ابن تیمیہ ٹھیٹ ظاہری ہیں لیکن ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں کہ جب کوئی استاد کسی بچہ کو تعلیم دینا چاہتا ہی تو اسکو بچہ کی زبان میں باتیں کرنی پڑتی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں،

بہرِ طفلِ نو پدر "تی تی" کند — گرچہ عقلش ہندسہ گیتی کند

کم نگردد فضلِ استاد از علو — گر "الف چیزے ندارد" گوید او

از پے تعلیم آں بستہ دہن — گوید او "خطی و ہوز کلمن"

در زبانِ او باید آمدن — از زبانِ خود بروں باید شدن

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) نفس ما اخفی لهم من قرة اعین جزاء بما كانوا يعملون) وقال النبي صلى الله عليه وسلم في الحديث الصحيح يقول الله تعالى اعددت لعبادى الصالحين ما لا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر فما اخبرنا الله به من صفات المخلوقين نعلم تفسيره ومعناه و نفهم الكلام الذي خوطبنا به ونعلم معنى العسل واللحم واللبن والحرير والذهب.

نسبت فرما دیا ہو کہ کسی جان کو نہیں معلوم کہ نیکوکاروں کے لئے کیا کیا آنکھ کی ٹھنڈک (لذت) چھپا کر رکھی گئی ہو، اور آنحضرت صلعم نے صحیح حدیث میں فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہو کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے مہیا کی ہی جسکو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اسکا خیال گذرا، تو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی جو صفتیں بتائی ہیں، ان کے لفظی معنی تو ہم جانتے ہیں اور جس کلام سے ہمکو خطاب کیا گیا ہی اسکو بھی ہم سمجھتے ہیں، ہم شہد، گوشت، دودھ، ریشم اور سونے چاندی کے لفظوں کے معنی جانتے ہیں، اور ان لفظوں سے جو جو چیزیں

؎ یعنی الف خالی، ب کے پیٹ میں ایک نقطہ،

مولانا روم نے جن سے بڑھکر شریعت کا راز داں کون ہوگا، اس مضمون کو مختلف موقعوں پر نہایت عمدہ مثالوں کے ذریعہ سے ادا کیا ہی، ایک جگہ لکھتے ہیں،

ہیچ ماہیاتِ اوصاف کمال — کس نداند جز بہ آثار و مثال

طفل ماہیت نداند طمث را — جز کہ گوئی ہست چوں حلوا ترا

طفل را بنو و نہ وطی زن خبر — جز کہ گوئی ہست آں خوش چوں شکر

کے بود ماہیتِ ذوقِ جماع — مثلِ ماہیاتِ حلوا اے مطاع

لیک نسبت کرد از روئے خوشی — با تو آں عاقل کہ تو کودک وشی

(بقیہ حاشیہ ۲۲۳) من بعض الوجوہ وبہ فہمنا المراد واحببناہ ورغبنا فیہ وبینھما مباینۃ ومفاضلۃ لا یقدر قدرھا فی الدنیا وھذا من التاویل الذی لا نعلمہ نحن بل یعلمہ اللہ تعالیٰ.

اور موافقت اور بعض وجوہ سے اشتراک ہوگا، اور اسی موافقت اور اشتراک کے سبب سے ہم کو سمجھے اور انکو پسند کیا، اور انکی خواہش کی، اور ان دونوں کے موجودات میں امن دینا اور آخرت کی چیزوں میں امتیاز و علیحدگی اور موجودات دنیا سے موجودات آخرت میں خوبی کا اضافہ ہوگا، جس کا اندازہ دنیا میں نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ تاویل ہی جس کو ہم نہیں جانتے بلکہ [illegible]

. . . .

وکذالک ما وعد بہ فی الجنۃ تعلم العباد تفسیر ما اخبر اللہ بہ واما کیفیتہ فقد قال تعالیٰ فلا تعلم

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جنت میں جن چیزوں کا وعدہ کیا ہی، اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کی خبر دی ہی انکے لفظی معنی تو بندے سمجھتے ہیں، لیکن اُن کی کیفیت تو خدا نے انکی

سب سے پہلے یہ ظاہر کرنا ہے کہ علوم موجودہ اور فلسفۂ حال کے رو سے اس احتمال پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، تمثل خیالی کی حقیقت جو امام غزالی نے بیان کی وہ یہ ہے، کہ معانی متمثل ہو کر نظر آتے ہیں، اور آوازیں اور باتیں سنائی دیتی ہیں جیسا کہ خواب میں ہوتا ہے، خواب کی حالت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اب اس پر غور کرنا چاہئے کہ خواب میں یہ حالت کیوں پیش آتی ہے، اسکی وجہ صرف یہی ہو کہ خواب میں حواس ظاہری معطل ہوتے ہیں، اور روح یا نفس یا قوت متخیلہ تنہا کام کرتی ہے، اب اگر کسی شخص کو بعض اوقات استغراق اور محویت کی وجہ سے بیداری میں بھی خواب کی حالت طاری ہو تو اس قسم کے امور کا محسوس ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، ان محسوسات کو ہم محسوسات عام نہیں کہتے جن کی بنا پر یہ لازم آئیگا کہ وہ اوروں کو بھی محسوس ہوں، بلکہ وہ خاص انبیاء اور اولیاء کے حواس کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اس صورت میں ان امور کا عام طور پر محسوس ہونا ضرور نہیں، اسی نکتہ کو مولانا روم نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

فلسفی کو منکر حنانہ است ۔۔۔ از حواس انبیا بیگانہ است

نطق خاک و نطق آب و نطق گل ۔۔۔ ہست محسوس حواس اہل دل

امام غزالی اور دیگر محققین نے اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، اور چونکہ یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے، جس میں سے ذرا سے تغیر سے اصل حقیقت کی صورت بدل جاتی ہے، اس لئے ہم ان محققین کے اصلی الفاظ نقل کرتے ہیں، اور خود صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں،

چونکہ با کودک سروکارت فتاد | ہم زبانِ کودکاں باید کشاد
کہ برو کتاب، تا مرغت خرم | یا مویز و جوز و فستق آورم

(۳) وہ روحانیات یا معانی ہیں جو انبیاء کو جسمانی صورت میں محسوس ہوتی ہیں یہی چیز ہے جس کو شاہ ولی اللہ صاحب اور شیخ الاشراق، عالم مثال اور عالم اشباح سے تعبیر کرتے ہیں اور امام غزالی اس کا نام تمثل خیالی رکھتے ہیں، اور چونکہ یہی صورت کثیر الوقوع ہے اور چونکہ ملاحدہ کو اسی پر زیادہ اعتراض ہے، اسلئے ہم اس کو زیادہ توضیح اور تفصیل سے لکھتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۵) والفضة والتفرق بين مسميات هذه الاسماء واما حقائقها على ما هي عليه فلا يمكن ان نعلمه نحن ولا نعلم حتى تكون الساعة فتفصيل ما اعد الله عز و جل لعباده لا يعلمه ملك مقرب ولا نبي مرسل بل هذا من التاويل الذي

(مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ابن تیمیہ صفحہ ۱۲ مطبوعہ مصر)

مسمی ہیں ان میں سے ایک کا دوسرے سے امتیاز بھی ہم کو معلوم ہے لیکن ان کی اصلی حقیقتیں تو اُن کا جاننا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں، اور جب تک قیامت نہ آجائے ہم جان بھی نہیں سکتے، تو خدا نے اپنے بندوں کے لئے جو کچھ مہیا کیا ہے، اس کو نہ تو مقرب فرشتے جانتے ہیں نہ کوئی پیغمبر، اور یہی وہ تاویل ہے جس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،

علامہ ابن تیمیہ کا مقصود یہ ہے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی ہمکو معلوم نہیں، اور ان پر ہمارا ایمان ہے، لیکن ان معنوں کے حقائق جو بعض وجوہ سے اُس کے لغوی معنوں سے متشابہ اور دوسرے اعتبار سے اُن سے بدرجہا مافوق ہیں، اُن کا علم و احساس ہم کو اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے نہ آجائیگا۔

"س س ن"

الصور وتفصيلها وهي التي
تركب راسين على بدن انسان
حتى تحصل صورة انسان ذي
راسين وتفصل راس الانسان
عن بدنه حتى تحصل تصور
انسان عديم الراس وهذا
اذا ركبت من الصور ووردت
على الحس المشترك تصير
مشاهدة بحسب مشاهدة الصور الخارجية
لان الصور التي في الخارج
لم تكن مشاهدة لكونها خارجية
بل لكونها منطبعة في الحس
المشترك فتلك الصور
التي ركبتها اذا وردت على
الحس المشترك صارت
مشاهدة واذا ثبت هذا
فنقول ان الصور التي

ترکیب دیتی ہے اسی قوت کا کام
ہے کہ ایک آدمی کے بدن پر دو سر
فرض کرتی ہے یہانتک کہ ایک
ایسے انسان کی صورت بن جاتی
ہے جس کے دو سر ہیں، اور اسی کا کام
ہے کہ انسان کے سر کو جدا کر دیتی ہے
یہانتک کہ ایک ایسا انسان متشکل
ہو جاتا ہے جس کے سر نہیں، یہ
قوت جب صورتوں کو ترکیب دیکر
حس مشترک کے پاس حاضر کرتی ہے
تو وہ صورت نظر آنے لگتی ہے جس طرح
کہ خارجی صورتیں نظر آتی ہیں کیونکہ
خارجی صورتوں کے نظر آنے کی یہ وجہ
نہیں کہ وہ خارج میں موجود ہیں بلکہ
یہ وجہ ہے کہ وہ حس مشترک میں منقش ہیں
تو یہ صورتیں جن کو قوت متخیلہ نے
ترکیب دیا ہے، جب حس مشترک کے

مقاصد المراصد[۱] میں ہے،

فی الرؤیا والوحی والالہامات والمخبرات والکرامات علیٰ رائی الحکماء[۲]

وعلم ان الانسان لہ قوۃ یجتمع	جاننا چاہیے کہ انسان میں ایک قوت ہے
فیہ صور المحسوسات لانہ یحکم علی	جس میں محسوسات کی صورتیں جمع ہوتی
ھذا الحلو بانہ ابیض ولو لم یکن لہ	ہیں کیونکہ انسان شیرینی کی نسبت
قوۃ یجتمع فیہا ھذہ المحسوسات	کہتا ہے کہ وہ سفید ہے تو اگر کوئی ایسی
لاستحال ھذا الحکم بدون	قوت موجود نہیں ہے جس میں محسوسات
حضور المحکوم علیہ والمحکوم	مجتمع ہوتے ہیں تو یہ حکم کیونکر دے سکتا
بہ وتسمی ھذہ القوۃ بالحس	کیونکہ جب کوئی حکم دیا جائے تو محکوم علیہ اور
المشترک وینطبع فیہا	محکوم بہ دونوں کا موجود ہونا ضروری ہے، اس
احدھما ان الحواس الظاھرۃ	ایک[۱] یہ کہ حواس ظاہری یعنی سامعہ، باصرہ
التی ھی السمع والبصر والشم	شامہ، ذائقہ، لامسہ محسوسات کی
والذوق واللمس تاخذ صور	صورتیں لیکر حس مشترک کے پاس
المحسوسات وتؤدیھا الی الحس	پہنچا دیتے ہیں، دوسری[۲] صورت
المشترک والثانی ان فی الدماغ	یہ ہے کہ دماغ میں ایک قوت متخیلہ
قوۃ متخیلۃ من شانہا ترکیب	ہے اس کا کام یہ ہے کہ صورتوں کو

صور المحسوسات ای بعض نسخ میں یحضرن، بعض میں ... [illegible]

وحی اور الہام وغیرہ کی حقیقت حکمائے اسلام کی رائے کے موافق

[۱] جو عبارت ہم نے نقل کی ہے وہ سفینہ راغب پاشا سے منقول ہے، دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۱۱۶ [۲] حکمائے اسلام مراد ہیں،

اذا تعطلت بالنوم بقي الحس	ہونے لگتا ہے، پہلا مانع نیند کی حالت
المشترك خالياً عن الصور	میں زائل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب نیند کی
الواردة عليه من خارج المانع	وجہ سے حواس معطل ہو جاتے ہیں تو حسِ مشترک
الثاني يزول بالمرض فان	خارجی صورتوں سے خالی ہو جاتا ہے،
النفس في حالة المرض تكون	. . . .
مشغولة بجهة فتسلط المتخيلة	دوسرا مانع بیماری کی حالت میں
على تركيب الصور وتنطبع	زائل ہو جاتا ہے کیونکہ بیماری کی حالت
تلك الصور في الحس المشترك	میں نفس مرض کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے
فتصير مشاهدة،	تو اس حالت میں قوتِ متخیلہ صورتوں

کو ترکیب دینے لگتی ہے اور وہ صورتیں حسِ مشترک میں آکر مشاہد ہو جاتی ہیں،

واما الوحي والالهام

فالنفس الناطقة اذا كانت	باقی وحی اور الہام تو ان کی حقیقت
قوية بحيث لم يكن اشتغالها	یہ ہے کہ نفس ناطقہ جب اس قدر قوی
بالبدن مانعاً عن الاتصال	ہوتا ہے کہ باوجود اشتغال بدن کے
بالمبادي القدسية وكانت	مبادی قدسیہ سے متصل ہو سکتا ہے اور
المتخيلة قوية بحيث تقوى	اس کے ساتھ قوتِ متخیلہ اس قدر
على استخلاص الحس المشترك	قوی ہوتی ہے، کہ حسِ مشترک کو

يرا ها النائمون امان تكون
موجودة في الخارج اولا والاول
باطل والا لرا ها كل من كان
سليم الحس وحيث لم
يرها دل على انها من تركيب
القوة المتخيلة وهذه القوة
لو خليت وطبعها لصدر
هذا الفعل دائما وانما
لا يصدر منها هذا الفعل
لامرين احدهما اشتغال
الحس المشترك بالصور
الواردة عليه من خارج
والثاني تسلط النفس الناطقة
عليها بضبط فاذا زال المانعان
او احدهما صدر منها
هذا الفعل والمانع الاول
يزول بالنوم فان الحواس

سامنے آتی ہیں تو نظر آنے لگتی ہیں،
اور جب یہ ثابت ہوا تو ہم کہتے ہیں
(یعنی اب اصل مقصد کو ثابت کرتے ہیں) کہ
خواب میں جو صورتیں نظر آتی ہیں، وہ دو
حالت سے خالی نہیں، یا خارج میں موجود
ہیں یا نہیں، پہلا احتمال باطل ہے کیونکہ
خارج میں موجود ہوتیں تو ہر صحیح الحواس
آدمی کو نظر آتیں۔ اسلئے معلوم ہوا کہ خارج
میں موجود نہیں، بلکہ قوت متخیلہ کا فعل ہے، قوت متخیلہ
اگر اپنی اصلی حالت پر رہنے پائے تو یہ فعل ہمیشہ
اس سے سرزد ہو لیکن دو چیزیں مانع ہو جاتی
ہیں، ایک یہ کہ حس مشترک اُن صورتوں
کے قبول کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے
جو باہر سے آتی رہتی ہیں، دوسرے
یہ کہ نفس ناطقہ قوت متخیلہ کو دبا لیتا ہے
تو جب یہ دونوں مانع، یا ایک اُٹھ
ہو جاتا ہے تو قوت متخیلہ سے وہ فعل سرزد

تابعۃ لقوۃ التخیل والعقلی	خاصہ قوت تخیل اور قوت عقلی
العملی،	عملی کا تابع ہے،

اس خاصہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، اس میں سے جو عبارت یہاں درج کے قابل ہے، حسب ذیل ہے،

ثم ان المتخیلۃ یفعل مثل	پھر قوت متخیلہ وہی عمل کرتی ہو جو تعبیر
مایفعل فی حال الرؤیا المحتاجۃ	طلب خواب کی حالت میں کرتی ہو،
الی التعبیر بان یاخذ تلک	یعنی یہ کہ ان واقعات کو لیتی ہو اور انکی
الاحوال ویحاکیھا ویستولی	نقل اتارتی ہے، اور قوت حسیہ پر چھا
علی الحسیۃ حتی یوثر ماتخیل	جاتی ہو، یہاں تک کہ یہ تخیل قوت
فیھا من تلک فی قوۃ بنطاسیا[1]	حس پر اس قدر اثر ڈالتا ہے کہ قوت
بان ینطبع الصور الحاصلۃ	متخیلہ میں جو صورتیں تھیں وہ حس مشترک
فیھا فی البنطاسیا المشارکۃ	میں اتر آتی ہیں، تو اس حالت میں عجیب
فیشاھد صور الھیۃ عجیبۃ	عجیب خدائی صورتیں نظر آتی ہیں اور
مرئیۃ واقاویل الھیۃ	خدائی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور
مسموعۃ ھی مثل تلک	وہ ایسی ہوتی ہیں جیسے کہ وحی کی مدرکات
المدرکات الوحیۃ وھذا	اور یہ اس وصف سے جس کو نبوت

---

[1] یونانی لفظ ہے جس کے معنی حس مشترک کے ہیں،

عن الحواس الظاهرة اتصلت	حواس ظاہری سے نجات دے سکتی
حالة اليقظة بالعقول المجردة	ہے، تو نفس ناطقہ بیداری کی حالت
والنفوس السماوية وحصل	میں بھی عقول مجردہ اور نفوس سماویہ
لها ادراك المغيبات على	سے متصل ہوجاتا ہے، اور اسکو غیب کی
وجه كلي ثم المتخيلة تحاكيها	باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے پھر
بصورة جزئية مناسبة لها	قوت متخیلہ اسکے مشابہ ایک جزئی صورت
وتنزل الى الحس المشترك	پیدا کرلیتی ہے، یہ صورت حس مشترک
فتصير مشاهدة محسوسة	میں اترکر مشاہد اور محسوس ہوجاتی ہے،
وقد يعرض لبعضهم ان يسمع	اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے، کہ وہ
كلاما منظوما او يشاهد	مسلسل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی
منظرا بهيا يخاطبه بكلام	صورت دیکھتے ہیں، جو ان سے مسلسل
منظوم فيما يتعلق باحواله	الفاظ کے ذریعہ سے باتیں کرتی ہے،
واحوال ما يقرب منه،	باتیں یا خود انہی کے متعلق ہوتی ہیں یا انکے متعلقین کے

امام غزالی نے معارج القدس میں نبوت کے عنوان سے جو بسیط مضمون لکھا ہے اس میں ایک فصل نبوت کے خواص میں لکھی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

بيان خواص النبوة،	نبوت کے خواص کا بیان،
ولها خواص ثلث احدها	نبوت کے تین خاصے ہیں، ایک

امام صاحب نے اگرچہ اصل مطلب کو بہت پیچ دیگر بیان کیا ہے، لیکن حاصل وہی ہے جو صاحب مقاصد نے صاف صاف لفظوں میں ادا کیا ہے، اس مضمون کو بوعلی سینا کے حوالہ سے ابو البقا نے نہایت مختصر اور جامع و مانع الفاظ میں ادا کیا ہے، چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہے، لکھا ہے،

فنحن نری الاشیاء بواسطۃ	تو ہم لوگ اشیاء کو حواس کے ذریعہ
الحس والنبی یری الاشیاء	سے دیکھتے ہیں اور پیغمبر قوائے باطنی
بواسطۃ القوی الباطنۃ	کے ذریعہ سے دیکھتا ہے، اور ہم لوگ اگر
ونحن نری ثم نعلم والنبی	چیز دیکھتے ہیں، پھر جانتے ہیں، اور
یعلم ثم یری،	پیغمبر جانتا ہے، پھر دیکھتا ہے،

حکیم ابو نصر فارابی، بوعلی سینا وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے، لیکن ہم نے اُنکی تصریحات اسلئے نقل نہیں کیں کہ یہ لوگ مذہبی حیثیت سے مقتدا تسلیم نہیں کئے جاتے،

اسلام تمدن اور ترقی کا مانع نہیں بلکہ موید ہے

یہ پانچواں معیار ہے جس کی رو سے مذہب کی صحت کا اندازہ کیا جاتا ہے، منکرین مذہب کو جس چیز نے سب سے زیادہ مذہب کا دشمن بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام مذاہب دنیاوی ترقیوں کے سد راہ ہیں" وہ اس کے وجوہ یہ بیان کرتے ہیں،

کن وجوہ سے مذہب کو دنیاوی ترقی کا مانع کہا جاتا ہے،

(۱) مذہب اعتقادیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ ہم جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں ہر

دون درجات المعنی المسمی بالنبوة	کہتے ہیں، کمتر درجہ ہے اور اس سے قوی تر
واقوی من هذا ان یستثبت	یہ درجہ ہے کہ یہ حالات اور
تلک الاحوال والصور علی هیئتها	صورتیں اپنی ہیئت پر اس طرح قائم
مانعة للقوة المتخیلة عن	ہو جائیں کہ قوتِ متخیلہ کو یہ موقع
الانصراف الی محاکاتها	نہ دیں کہ وہ دوسری چیزوں کی
باشیاء اخری واقوی من هذا	تصویر اتار سکے، اور اس سے بھی
ان یکون المتخیلة مستمرة	زیادہ قوی یہ درجہ ہے کہ متخیلہ
فی محاکاتها والعقل العملی و	برابر اپنا کام کرتی رہے، اور
الوهم لا یختلفان عمن	قوتِ عقلیہ اور وہم اسکی قائم کردہ
استثبتاه فیثبت فی الذاکرة	صورتوں سے اختلاف نہ کریں تو
مصورة ما اخذت ویقبل	جو صورت متخیلہ نے قائم کی ہے وہ
المتخیلة علی بنطاسیا ویحاکی	حافظہ میں رہ جائے گی، اور
فیه فاقبلت بصورة عجیبة	قوتِ متخیلہ، حسِ مشترک پر اثر کریگی،
ومبصرة ویودی کل واحد منهما	یہاں تک کہ حسِ مشترک میں وہ عجیب
علی وجهه وهذه طبقة النبوات	صورت منقش ہو جائے گی اور ہر ایک اپنا
المتعلقة بالقوة العقلیة	کام اپنے طریقہ پر کریگی اور یہ نبوت کا وہ
والخیالیة،	طبقہ ہے جو قوتِ عقلیہ اور خیالیہ سے متعلق ہے،

اسلام

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ	جو لوگ کہ پیغمبر اُمی کی پیروی کرتے
الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا	ہیں، جس کا نام اپنے ہاں توریت و
عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ	انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انکو اچھی
یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ	بات کا حکم دیتا ہے، اور بری بات سے
عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ	روکتا ہے، اور پاک چیزوں کو انکے
وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ	لئے حلال کرتا ہے، اور ناپاک چیزوں
اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ	کو اُن پر حرام کرتا ہے اور وہ بوجھ جو اُن پر
کَانَتْ عَلَیْھِمْ (اعراف ۱۹)	تھے، اور وہ بیڑیاں جو ان پر تھیں اُتار دیتا ہے

خوب غور کرو کہ یہودیوں پر کون سا بوجھ تھا جس کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہلکا کیا اور اُن کے پاؤں میں کون سی بیڑیاں تھیں جو آپ نے اُتروا دیں،

قرآن مجید میں خاص طور پر یہود اور نصاریٰ کو مخاطب کرکے کہا ہے، لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ یعنی مذہب میں غلو نہ کرو مذہبی غلو کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ہر قسم کی حرکات و سکنات کو مذہب کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے، دوسرے یہ کہ احکام مذہبی سخت ناقابل تحمل مقرر کئے جائیں، اسلام نے ان دونوں کو مٹادیا، مذہب کے دائرہ کو لوگوں نے یہانتک وسعت دی تھی کہ زندگی کے عیش و عشرت، ناز و نعمت، عمدہ خور و پوش کو بھی اسمیں داخل کر لیا تھا، اور اسکو ناجائز قرار دیا تھا، اس پر قرآن مجید نے کہا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ الَّتِیْ	اے پیغمبر ان سے کہہ کہ خدا نے جو
اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ	آرایش اور جو اچھے کھانے اپنے بندوں

بات میں دست اندازی کرنا چاہتا ہے، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ایک چیز بھی اسکی حد سے باہر نہیں ہو سکتی، ایسے شکنجہ میں رہ کر انسان کیونکر ترقی کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں نے جب ترقی کی، ہمیشہ اس قسم کی مذہبی سخت گیریوں سے آزاد ہو کر کی،

(۲) مذہبی اعمال ایسے سخت ہوتے ہیں کہ ان کی پابندی معاشرت اور تمدن کی ترقی کا موقع نہیں دیتی،

(۳) ہر مذہب دوسرے مذہب والوں کے ساتھ سخت تعصب اور نفرت کی تلقین کرتا ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی قوم نے غیر مذہب والوں پر انصاف کے ساتھ حکومت نہیں کی، جس کی وجہ سے نوعِ انسانی کا ایک گروہ کثیر ہمیشہ ذلیل و خوار رہ کر تمدن اور تہذیب سے محروم رہا،

عام مذاہب کی نسبت یہ اعتراض واقعیت سے خالی نہیں، لیکن ہم دیکھنا چاہتے ہیں، کہ مذہب اسلام، ان اعتراضات کا ہدف ہو سکتا ہے یا نہیں، یہ باتیں مذہب اسلام میں نہیں پائی جاتیں،

بے شبہہ اکثر مذاہب نے انسان کے ہر ہر جزئی فعل کو مذہب کے شکنجہ میں جکڑ دیا ہے لیکن اسلام اسی غرض سے آیا کہ اس قسم کی تنگ دریوں کو مٹا دے، یہودیوں کے ہاں ایک ایک چیز مذہب کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی تھی، خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بڑا مقصد یہ قرار دیا کہ یہ قیدیں اور بندشیں اٹھا دی جائیں،

قرآن مجید میں ارشاد کیا،

یہ صرف دعویٰ نہیں، بلکہ اسلام کے تمام احکام اس دعوے کے شاہد ہیں، مذہبی اعمال کی سختی کی متعدد صورتیں ہیں،

(۱) فرائض کی تعداد زیادہ ہو، اور وہ ایسے ہوں، جنکی تعمیل مشکل ہو، یا جن کی تعمیل میں وقت کا بڑا حصہ صرف ہوجائے،

اسلام میں صرف پانچ فرائض ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، حج اور زکوٰۃ، دولت مندوں پر محدود ہے، جہاں صرف اس وقت فرض ہی، جب حفاظت خود اختیاری کی ضرورت ہو، صرف دو فرض ہیں، جو سب کے لئے عام ہیں، نماز روزہ، روزہ سال میں ایک دفعہ ہے، وہ بھی مسافر اور بیمار اور نہایت کمزور آدمیوں کے لئے نہیں، نماز البتہ کسی حالت میں معاف نہیں، لیکن اسکی یہ صورت ہے کہ بیمار کے لئے وضو کی ضرورت نہیں، گھوڑے یا جہاز کی سواری میں سمت قبلہ کی پابندی نہیں، وہ حسب اختلاف ضرورت کھڑے ہو کر بیٹھ کر لیٹ کر، گھوڑے پر سوار ہو کر غرض ہر طرح ادا کی جا سکتی ہے، سفر میں بجائے چار رکعت کے صرف دو رکعتیں رہجاتی ہیں، اسکے ادا کے لئے جو ارکان و آداب مقرر ہیں، اُن میں سے خصوصیت کے ساتھ نہایت کم کی پابندی ضرور ہے، مثلاً ہاتھ کھول کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں باندھ کر بھی ہاتھ سینے پر بھی باندھ سکتے ہیں بالائے ناف بھی، آمین پکار کر بھی کہہ سکتے ہیں آہستہ بھی، غرض بعض امور کے سوا باقی کسی خاص طریقہ کی پابندی ضرور نہیں چنانچہ مختلف اماموں نے مختلف صورتیں اختیار کیں،

(۲) فرائض کے ادا کرنے کے لئے نہایت جزئی چھوٹی چھوٹی قیدیں لگائی جائیں

مِنَ الرِّزْقِ (اعراف-۴) کیلئے پیدا کیے ہیں، انکو کس نے حرام کیا ہے

خدا کے انہی احکام کی بنا پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیاوی معاشرت اور تمدن کو

مذہب کے دائرہ سے بالکل الگ رکھا اور فرمایا کہ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ یعنی دنیا

کی باتیں تم ہی خوب جانتے ہو،

دوسرا اعتراض تو اسلام سے بہ مراحل دور ہے، اسلام کو دعویٰ ہے، اور بجا دعویٰ

ہے کہ اس کے احکامِ مذہبی نہایت نرم، آسان اور سہل العمل ہیں،

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج-۱۰)	اور خدا نے دین کے بارے میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی،
مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ (مائدہ)	خدا یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی تنگی ہو، اسکے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمکو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کردے،
یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ	خدا تمھارے ساتھ آسانی کرنی چاہتا ہے نہ کہ سختی،
لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (سورہ بقر)	خدا کسی پر اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جس قدر اسکو طاقت ہے،
یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا،	خدا چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے،

بچھڑے کا لہو لے کے اپنی انگلی سے کفارہ گاہ پر پورب کی طرف کو چھڑکے اور کفارہ گاہ کے آگے بھی اپنی انگلی سے سات مرتبہ چھڑکے (توراۃ احبار باب ۱۶)

اسی قسم کے طفلانہ قیود ہندوؤں اور تمام دیگر قوموں میں پائے جاتے ہیں، یہانتک کہ کوئی شخص بطور خود عبادتِ الٰہی ادا ہی نہیں کر سکتا، جب تک کوئی عبادت کرانے والا پیشوا موجود نہ ہو، ہندوؤں کو پنڈتوں کی ضرورت ہے، عیسائیوں کو پادری کی، یہودیوں کو احبار کی لیکن مسلمان کو کسی دوسرے شخص کی دستگیری کی ضرورت نہیں، وہ اپنا آپ پادری اپنا آپ پنڈوا، اپنا آپ احبار ہے،

اسلام نے طریقۂ عمل کے نمونہ کے لئے اس قسم کی کوئی شرط اختیار بھی کی ہے تو ساتھ ہی بتا دیا ہے کہ یہ قیدیں فی نفسہٖ ضروری نہیں، نماز کے لئے قبلہ کی سمت کا جہاں حکم دیا ساتھ ہی کہدیا کہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، یعنی جس طرف منہ کرو اسی طرف خدا کا منہ ہے، قربانی کا جہاں ذکر کیا یہ بھی فرمایا کہ لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی یعنی خدا تک نہ قربانی کا گوشت پہنچتا ہے، نہ خون، بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری پہنچتی ہے،

تیسرے اعتراض کا جواب بہ تفصیل آگے آئیگا،

ہمارا صرف یہ دعویٰ نہیں کہ اسلام تمدن کے موافق ہے، بلکہ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ تمدن کو ترقی دینے والا ہے اور اس حد تک پہنچانے والا ہے، جو تمدن کا انتہائی درجہ ہے،

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیاوی تمدن آج یورپ میں جس حد تک پہنچا ہے،

اور ہر ایک کو ضروری قرار دیا جائے، دیگر مذاہب میں اس قسم کی جو سختی تھی اس کا اندازہ
توراۃ کے احکام سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً قربانی جو اسلام میں نہایت سادہ اور آسان
طریقہ سے ادا ہو سکتی ہے، توراۃ میں اسکے لئے جو قیدیں مذکور ہیں، اُنکا مختصر سا نمونہ یہ ہے
"اور ہارون پاکترین مکان میں یوں آئے کہ خطا کی قربانی کے لئے ایک بچھڑا اور سوختنی
قربانی کے لئے ایک مینڈھا لائے اور کتانی مقدس پیراہن پہنے اور اسکے بدن میں کتانی
پاجامہ ہو، اور کتانی پٹکے سے اسکی کمر بندی ہو، اور اپنے سر پر کتانی عمامہ رکھے، یہ مقدس
کپڑے ہیں، اور اپنا بدن پانی سے دھوئے اور انھیں پہن لے، اور بنی اسرائیل کی جماعت
سے بکری کے دو بچے خطا کی قربانی کے لئے لے لے، اور ہارون اپنے اس بچھڑے کو جو خطا
کی قربانی کے لئے اسکی طرف سے ہے نزدیک لائے اور اپنے گھر کے لئے کفارہ دے
پھر ان دونوں حلوانوں کو لے کے جماعت کے خیمہ کے دروازہ پر خداوند کے آگے
حاضر کرے، اور ہارون ان دونوں حلوانوں پر قرعہ ڈالے، ایک قرعہ خداوند کے لئے
اور دوسرا قرعہ چلاوے کے لئے، اور ہارون اس حلوان کو جس پر خداوند کے نام کا
قرعہ پڑے لائے اور اُسے خطا کی قربانی کے لئے ذبح کرے"
اور وہ ایک عود سوز اس آگ کے انگاروں سے جو خداوند کے آگے مذبح پر ہے
بھرے اور اپنی مٹھیاں بخور کے کوٹے ہوئے مصالح سے بھی بھرے، اور اسی پردہ
کے اندر لائے، اور اس بخور کو خداوند کے حضور آگ میں ڈال دے، تاکہ بخور کا دھواں
کفارہ گاہ کو جو شہادت کے صندوق پر ہے چھپائے کہ وہ ہلاک نہ ہو، پھر وہ اس

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ	انسان کے نفس کو جو فائدہ پہنچتا ہے اسی کی کمائی
(بقرہ)	کی بدولت ہے اور جو نقصان پہنچتا ہے اُسی کے
وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا	اور جو کوئی بُرا کام کرتا ہے تو اس کا وبال
(انعام)	اسی پر پڑتا ہے،
أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ	کیا جب ایسا ہوگا کہ تم پر کوئی مصیبت
قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى	پڑے حالانکہ اس کے دو چند تم پر پہلے پڑ چکی
هَٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ	ہے تو تم کہو گے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی اے
(آل عمران)	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہدے کہ یہ خود تمہاری
ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا	یہ اسلئے کہ خدا جب کسی قوم کو کوئی نعمت
نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ	دیتا ہے تو پھر اس کو بدلتا نہیں جب تک
يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (انفال)	وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں،
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	لوگوں کے کرتوت کی بدولت تمام خشکی
بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم)	وتری میں فساد پھیل گیا،
مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا	تم پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خود
كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (حمعسق)	تمہارے کرتوت کی بدولت،

اسلام نے اس مضمون پر اس قدر زور دیا کہ قرآن مجید میں جا بجا تصریح کی کہ بندہ جب ایک کام کرلیتا ہے، تو خدا بھی اسی کے موافق کرتا ہے،

کبھی نہیں پہنچا تھا، اسلئے ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ اس تمدن کے اصلی اصول کیا ہیں،

یورپ کے تمدن کے مہمات اصول حسب ذیل عنوان میں محدود کئے جا سکتے ہیں اور دنیا میں جب کبھی کسی قوم نے تمدن میں ترقی کی ہو گی یا آیندہ کریگی تو انہی اصول پر کی ہوگی اور کرے گی،

ترقی تمدن کے جو اصول ہیں سب اسلام میں پائے جاتے ہیں،

(۱) انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے، اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے، وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اٹھائے، سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم کی،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ	ہم نے انسان کی بناوٹ بہتر
اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ	سے بہتر بنائی،
وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ	تمام آسمان وزمین کی چیزوں کو
وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا،	تمہارا مسخر کیا،

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جو آیندہ آئیں گی،

(۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اس کو یہ یقین ہو کہ اس کے خیر و شر، ترقی اور تنزل، عروج وزوال کا مدار تمامتر اسکی سعی اور کوشش پر ہے، اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اسکی کوششوں پر موقوف ہیں، قرآن مجید نے اس اصول کو نہایت توضیح اور تاکید کے ساتھ بیان کیا،

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی،	انسان کیلئے اتنا ہی ہے جتنی اسکی کوشش ہے

میں بیان کیا کہ جب ان لوگوں نے کجی کی تو خدا نے بھی اُن کے دلوں کو کج کر دیا، یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا میں یہ کہا کہ مسلمانو! پرہیزگاری اختیار کرو، اور ٹھیک بات کہو تو خدا تمھارے عمل صالح کر دیگا، حالانکہ پرہیزگاری خود عملِ صالح کا نام ہے، اور جب کوئی شخص پرہیزگاری کرے گا تو پھر اس کے عمل کے صالح کرنے کی کیا ضرورت ہے،

اس موقع پر یہ بات بھی ظاہر کرنی ضرور ہے کہ قرآن مجید میں ایسی بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے، اور جو کچھ کرتا ہے، خدا کرتا ہے،

وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ، اور وہ اپنے بندوں پر بالا دست ہے

قُلْ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللہِ، کہدے کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے

عیسائی اکثر طعنہ دیتے ہیں، کہ مسلمانوں میں جو کاہلی اور پست ہمتی پائی جاتی ہے، وہ اسی مسئلہ قضا و قدر کا اثر ہے، اور اس لئے مسلمانوں کا تنزل خود اُن کے مذہب کا لازمی نتیجہ ہے،

اس اعتراض کو اگرچہ ہمارے توکل پیشہ علماء اور صوفیہ نے اپنے طرزِ عمل سے قوی کر دیا ہے، لیکن درحقیقت یہ اعتراض بالکل لغو ہے،

اس کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ یہی قضا و قدر کا اعتقاد تھا جس کی بدولت صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک ایک شخص ہزاروں آدمیوں کے دل میں گھس جاتا تھا، اور سینکڑوں کو خاک میں ملا کر صحیح سلامت نکل آتا تھا، اگر آج اسی جوہر کو ہمارے علما و صوفیہ اپنی شکستہ پائی اور کاہلی کے لئے استعمال کرتے ہیں، تو اس میں اسلام کا کیا قصور،

تحقیقی جواب یہ ہے کہ بے شبہہ اسلام نے انسان کو مختارِ کل قرار دیا ہے، لیکن

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے، اور انھوں
يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ	نے کام بھی اچھے کئے، خدا اون کو
(یونس)	ان کے ایمان کی وجہ سے ہدایت کرتا ہے
إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ	جو لوگ خدا کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے
اللّٰهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللّٰهُ،	خدا ان کو ہدایت نہیں کرتا،
وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ	اور جو لوگ ہمارے لئے مجاہدہ کرتے ہیں
سُبُلَنَا ، (عنکبوت)	ہم انکو اپنی راہ دکھاتے ہیں،
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	مسلمانو! خدا سے ڈرو، اور
وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ	ٹھیک بات بولو تو خدا تمھارے اعمال
لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (الاحزاب)	کو صالح کردیگا،
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا	مسلمانو! اگر تم خدا کی مدد کروگے تو خدا بھی
اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد)	تمھاری مدد کریگا اور تمکو ثابت قدم رکھیگا
فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ	پھر جب وہ لوگ کج ہوئے، تو خدا نے بھی
(صف)	اُن کے دلوں کو کج کردیا،
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى	خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک
يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (رعد)	وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں،

ان آیتوں میں خدا نے اپنے کام کو بندہ کے کام سے متاخر رکھا ہے، فَلَمَّا زَاغُوا، الآیہ

لیکن اسلام کے قبل تک یہ خیال کسی قوم اور ملک میں پیدا نہیں ہوا تھا، تعزیرات کے متعلق مہذب سے مہذب قوموں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ مجرموں کے مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے سزائیں دیجاتی تھیں، لاروس اپنی انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ "رومن امپائر میں ایک ہی جرم کی سزائیں مختلف ہوتی تھیں یعنی مجرم کی حیثیت اور درجہ کے لحاظ سے سزا ہوتی تھی اس کے بعد مصنف مذکور نے اس نا انصافی اور ظلم کی تفصیل کی ہے، اور رومن سے لیکر فرنچ تک کے واقعات گنائے ہیں، اخیر میں لکھا ہے، کہ ۱۷۸۹ء کے ہنگامہ نے یہ تمام امتیازات مٹا دیئے کیونکہ اُس نے خود ان القاب و خطابات کو مٹا دیا، جو لوگوں کی ذاتی عزت یا وراثت کے اعزاز کی بنا پر قائم تھے"

فلاسفر فرنک لکھتا ہے کہ "مساوات کی بنیاد پچاس برس سے یورپ کی بعض قوموں میں پڑی ہے، اور اب دوسرے حصوں میں بھی پھیلتی جاتی ہے"

فلاسفر مذکور مساوات کی ابتدا پچاس برس سے بتاتا ہے، لیکن اسلام میں بارہ سو برس پہلے یہ اصول قائم ہو چکا تھا، قرآن مجید میں ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ	لوگو! ہم نے تمکو مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے کنبے اور قبیلے ٹھہرائے، اس غرض سے کہ ایک دوسرے سے پہچانے جائیں، لیکن خدا کے نزدیک صاحبِ عزت وہ ہے جو پرہیزگار ہو،
(نساء-۱)	

ساتھ ہی اس بات کی بھی احتیاط رکھی ہے کہ یہ اعتقاد الحاد کی حد سے نہ مل جائے، انسان کے مختار ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ خالق اور خدا کوئی چیز نہیں، اسلئے انسان قادر مطلق ہے جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں کرتا، دوسرے معنی یہ ہیں، کہ خدا قادر مطلق ہے لیکن اُسنے انسان کو اپنے افعال کا مختار بنایا ہے، اسلئے انسان جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے، اسلام نے پہلے معنی کی نفی کی ہے، اور اسی بنا پر قرآن میں آیا ہے کہ

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ — تم کسی بات کو نہ چاہو گے جبتک کہ خدا نہ چاہے

جس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو جو مشیت اور ارادہ کی قوت دی گئی ہے، یہ خدا ہی نے دی ہے اگر خدا نہ چاہتا تو تم میں یہ قوت بھی نہ ہوتی،

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ

قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ، — یعنی جو کچھ دنیا میں ہے سب کی علۃ العلل خدا ہی ہے

اس امر کا قطعی فیصلہ کہ اسلام نے اختیار کی تعلیم کی تھی یا جبر کی، اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اسلام کے مرکز تھے، جو اسلام کی مجسم تصویر تھے، جو لوگ اسلام کی ایک ایک ادا سے واقف تھے، یعنی صحابہؓ اُنھوں نے کیا سمجھا، اور ان پر اسلام کی تلقین کا کیا اثر ہوا؟ تاریخ شاہد ہے، کہ اسلام کی تعلیم نے اُن کو اختیار، عزم، استقلال اور حوصلہ کا مجسم پیکر بنا دیا تھا،

مساوات (۳) تمدن کی ترقی کا سب سے بڑا اصول مساوات کا اصول ہے، یعنی یہ کہ تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں، فلاسفر گوندرسیہ کا قول ہے کہ "حقوقِ انسانی کے سمجھنے کا پہلا دیباچہ مساوات ہے، اور مساوات ہی تمام اخلاقِ حمیدہ کی بنیاد ہے"

اس قسم کے ہزاروں واقعات ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ عام کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے، کہ تمام مورخین نے لکھا ہے، کہ اسلام میں سب سے پہلا ظلم جو شروع ہوا وہ تَنَحَّ عَنِ الطَّرِیْقِ (راستہ سے ذرا ہٹ جاؤ) کا کہنا تھا، یعنی اوائلِ اسلام میں بڑے سے بڑا آدمی راہ میں کسی معمولی آدمی کو نہیں کہہ سکتا تھا کہ ذرا ہٹ جاؤ، اول جو ظلم شروع ہوا وہ اسی لفظ کا استعمال کرنا تھا،

مذہبی تعصب

(۴) تمدن کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ، اور ترقی تمدن کی بہت بڑی علامت مذہبی نفرت اور مذہبی جبر کا دور کرنا ہے، دنیا جب سے آباد ہے، ہمیشہ ہر ملک میں، ہر قوم میں، ہر سلطنت میں یہ طریقہ رہا کہ غیر مذہب والوں پر جبر کیا جاتا تھا، ان کو مذہبی آزادی نہیں دی جاتی تھی، اُن سے نفرت اور حقارت کی تلقین کی جاتی تھی، اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کیا جاتا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ اسلام سے پہلے تمام دنیا کا یہ مذاق تھا اور یہ گویا انسان کی فطرت ہو گئی تھی کہ جب دو شخصوں میں کسی رائے اور خیال کے متعلق اختلاف ہوتا تھا، تو اُس کا اثر معاشرت کے تمام امور پر پڑتا تھا، یعنی دونوں میں اجنبیت پیدا ہو کر منافرت اور عداوت کی حد تک نوبت پہونچتی تھی،

سب سے پہلے اسلام نے اختلافِ مذہب اور دیگر تعلقات کے حدود جداگانہ قائم کئے، یعنی یہ بتایا کہ اگر کسی شخص سے مذہب میں اختلاف ہو تو اس کا اثر عام معاشرت پر نہیں پڑنا چاہیئے، والدین کے جہاں حقوق بیان کئے وہاں فرمایا کہ

یہ صرف الفاظ نہ تھے، بلکہ اسلام کا نظام اسی اصول پر قائم ہوا، اور اسلام جب تک اسلام تھا اسی اصول پر قائم رہا، عرب میں قبائل کے مدارج مقرر تھے، جو قبیلہ زیادہ شریف اور معزز تھا اس کا ایک آدمی دوسرے قبائل کے متعدد آدمیوں کے برابر مانا جاتا تھا یعنی معزز قبیلہ کے ایک آدمی کے خون کے بدلے میں دوسرے قبائل کے کئی آدمی قتل کئے جاتے تھے، اسی طرح غلام کے خون کے معاوضہ میں آقا قتل نہیں کیا جاسکتا تھا، اسلام نے اصولِ مساوات کی بنا پر یہ تفرقے بالکل مٹا دیئے، قریش جن کو یہ غرور تھا کہ جنگِ بدر میں اُنھوں نے انصار کے مقابلہ سے اس بنا پر انکار کر دیا تھا کہ انصار پر ہاتھ اُٹھانا بھی اُن کو عار ہے، وہ حبش اور ایران کے زرخرید غلاموں کے برابر کر دیئے گئے، ابوسفیان جو تمام قریش کا سردار رہ چکا تھا، اور جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حریف مقابل ہونے کا دعویٰ تھا، جب اسلام لایا تو اُس کو بلالؓ وصہیبؓ کا ہمرتبہ ہو کر رہنا پڑا، حالانکہ بلالؓ وصہیبؓ دونوں عجمی زرخرید غلام تھے،

جبلہ بن الایہم عرب کا مشہور بادشاہ تھا، جب وہ اسلام لایا تو اُس نے چاہا کہ ایک عامی آدمی کے مقابلہ میں اس کی عزت مرجح تسلیم کی جائے، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے جو اسلام کے اصلی تصویر تھے گوارا نہ کیا، اور وہ اسی ضد پر مرتد ہو کر عیسائیوں سے جا کر مل گیا،

عمر فاروقؓ نے جب شام کا سفر کیا، اور بیت المقدس میں داخل ہوئے تو ان کا غلام اونٹ پر سوار تھا، اور خود ان کے ہاتھوں میں اونٹ کی باگ تھی، حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ تمام لوگ خلیفۂ اسلام کی جاہ و شوکت دیکھنے کے لئے گھروں سے نکل آئے تھے،

انسانی کو مٹاتا ہے،

اس نکتہ کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں ادا کیا:-

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ	اور اگر خدا چاہتا تو تمام آدمیوں کو ایک ہی
أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ	اُمت بناتا، لیکن، لوگ ہمیشہ مختلف رہیں گے
مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ	بجز اُنکے جن پر تیرے خدا کا رحم ہو، اور خدا
وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ھود)	نے اسی لئے اُن لوگوں کو بنایا ہی ہے،
وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ	اور اگر خدا چاہتا تو دنیا کے تمام آدمی
فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلَوْ شَاءَ اللهُ	مسلمان ہو جاتے، اور اگر خدا چاہتا تم
لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (مائدہ)	تم کو ایک ہی امت بناتا،
وَلَوْ شَاءَ اللهُ مَا أَشْرَكُوا (انعام)	اور اگر خدا چاہتا تو لوگ شرک نہ کرتے
وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَجَمَعَهُمْ	اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت
عَلَى الْهُدَىٰ (انعام)	پر متفق کر دیتا،
أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنْ لَوْ	کیا مسلمان مایوس نہیں ہوے کہ اگر
يَشَاءُ اللهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا (رعد)	خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو ہدایت کر دیتا،
وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً	اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی
(حمعسق)	اُمت بناتا،
وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (نحل)	اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لاتا،

وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا،	لیکن دنیا میں اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کر	اگر وہ دونوں اس بات پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک کرے جس کا تجھکو علم نہیں ہی، (یعنی اگر والدین شرک پر مجبور کریں) تو تو اُن کا کہا نہ مان،

پھر عام طور پر فرمایا،

لَا یَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔[۵] (ممتحنہ-۲)	جن لوگوں نے تم سے مذہبی جنگ نہیں کی اور تمکو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، انکی نسبت خدا تمکو منع نہیں کرتا کہ تم اُنکے ساتھ بھلائی اور انصاف کرو، بے شبہہ خدا انصاف کو پسند کرتا ہی،

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ کا اصلی فلسفہ بتا دیا، یعنی خدا نے انسانوں کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ اُن کی صورت، سیرت، خیال، مذاق اور رائے میں اختلاف ہو، اسلئے اس بات کی خواہش کرنا کہ تمام لوگ خواہ مخواہ متحد الخیال ہو جائیں گویا فطرت

۵ قرآن مجید میں بہت سی آیتیں اس قسم کی موجود ہیں جنمیں یہ حکم ہے کہ غیر مذہب والوں سے دوستی اور محبت نہ رکھو، اور انہی آیتوں کو ہمارے ظاہر بیں علما ہر موقع پر پیش کرتے ہیں، لیکن وہ آیتیں ان کافروں سے مخصوص ہیں جو مسلمانوں سے مذہبی لڑائی لڑتے ہیں، چنانچہ خود خدا نے اس آیت کے بعد تصریح کر دی اور فرمایا کہ اِنَّمَا یَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ، یعنی خدا تو ان لوگوں سے دوستی رکھنے کو منع کرتا ہی جو تم سے مذہب کے بارہ میں لڑے اور تمکو تمہارے گھروں سے نکال دیا، اور تمہارے نکال دینے پر اعانت کی،

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ) ہے، نہ کہ دارو غہ۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ تو جس کے جی میں آئے وہ اپنے خدا کی

سَبِيْلًا (مزمل) راہ اختیار کرے،

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى کیا تو لوگوں کو زبردستی مسلمان

يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس) کرنا چاہتا ہی،

اعتقاد اور یقین ایسی چیز ہے جو دل سے متعلق ہے، اس لئے کوئی شخص کسی کے دل میں کوئی یقین، جبر اور زبردستی سے نہیں پیدا کر سکتا، اس بنا پر مذہب میں جبر کرنا بالکل بے فائدہ چیز ہے لیکن یہ نکتہ اس وقت تک دنیا کی سمجھ میں نہ آیا جب تک اسلام نے یہ نہیں کہا کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (آل عمران) مذہب کوئی زبردستی کی چیز نہیں،

ژول سیمان جو فرانس کا بہت بڑا فاضل گذرا ہے، لکھتا ہے کہ "مذہبی آزادی کو کچھ بہت دن نہیں گذرے کیونکہ دنیا کی تمام تاریخیں درحقیقت مذہبی تعصب اور کینہ پروری کا مجموعہ ہیں،" اسکے بعد فاضل مذکور نے قرونِ اولیٰ سے عہد وسطیٰ تک مذہبی تعصب کے واقعات تفصیل کے ساتھ گنائے ہیں، اخیر میں لکھا ہے، کہ بالآخر فلسفیانہ روح نے ۴ر اگست ۱۸۸۹ء کو مذہبی آزادی پر بحث کی لیکن یہ خیال وجود میں اس وقت آیا جب یہودیوں کو ۱۷۹۱ء میں ظلم سے نجات دی گئی، تاہم چونکہ فرنچ ریولیوشن کا طریق انتظام اچھا نہ تھا، اس لئے وہ مذہبی آزادی کو مضبوط

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا (سجدہ۱۸) — اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت کر دیتے،

بعض وقت جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہ اقتضائے بشریت کافروں کی سرکشی اور بے پروائی گراں گذرتی تھی، اس پر قرآن مجید میں یہ آیت اتری،

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ، (انعام ۴)

اور اگر اُن کی سرکشی تجھ پر گراں گذرتی ہے، تو اگر ممکن ہو کہ زمین کے اندر سرنگ تلاش کرو، یا آسمان میں سیڑھی ہم پہنچاؤ تا کہ انکو کوئی معجزہ دکھاؤ، (تو کر دیکھو) اور اگر خدا چاہتا تو سب کو راہ راست پر متفق کر دیتا، تو دیکھ جاہل نہ بن،

لیکن چونکہ اکثر انسانوں کی فطرت ایسی بھی بنائی ہے کہ وہ ہدایت اور وعظ و پند سے حق بات کو قبول کر لیتے ہیں، اسلئے اسلام نے وعظ اور پند کے ذریعہ سے دعوتِ اسلام کی اجازت دی اور فرمایا،

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل)

لوگوں کو اپنے خدا کے راستہ کیطرف بلاؤ بذریعہ حکمت کے اور بذریعہ وعظ کے اور لوگوں سے بحث کر معقول طریقہ سے،

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ — لوگوں کو نصیحت کر تو صرف نصیحت کرنیوالا

یہی سلف آئر کا خیال تھا جو مسلمانوں کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں، اولو العزمیوں، بلند خیالیوں کا باعث تھا، تاریخوں میں تم نے پڑھا ہوگا کہ ایک معمولی درجہ کا مسلمان بھی قیصر و کسریٰ کے دربار میں کس دلیری اور آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا،

(۷) ترقی کا مقدم ترین اصول علم ہے، اسلام نے علم کو گویا لازمۂ اسلام قرار دیا، قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں علم کی تحصیل کے متعلق کثرت سے جو ہدایتیں ہیں، ان سے قطع نظر واقعات پر نظر ڈالو تو تاریخ ہر ہر قدم پر اس بات کی شہادت دینے کے لئے موجود ہے کہ اسلام دنیا میں جہاں جہاں گیا علم کو ساتھ لیکر گیا، وہ قومیں جو ازل سے جاہل اور امی رہتی آئی تھیں جس دن اسلام لائیں علم و فن سے معمور ہوگئیں، عرب ابتدائے عالم سے جاہل تھا، یہاں تک کہ اسلام کے اوائل تک بڑے بڑے شعرا لکھنے پڑھنے کو عار سمجھتے تھے، ذو رمہ جو مشہور شاعر تھا لکھا پڑھا تھا، لیکن ایک موقع پر جب اس کو کچھ لکھنا پڑا تو اُس نے حاضرین سے نہایت الحاح کے ساتھ درخواست کی کہ یہ راز کہیں ظاہر نہ ہونے پائے ورنہ میری بڑی بدنامی ہوگی، لیکن یہی عرب اسلام کے وجود کے ساتھ علوم و فنون کا مرکز بن گیا، اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ، زہری جیسے مجتہدین وہاں پیدا ہونے لگے، ترکوں کی قوم ہزاروں برس پہلے سے موجود تھی، لیکن اُن کا امتیازی وصف یہ تھا ع

چناں بردند صبر از دل کہ ترکان خوان یغمارا

یہی ترک تھے جن میں اسلام لانے کے ساتھ حکیم ابو نصر فارابی اور امیر خسرو

بنیاد پر قائم نہ کرسکا،

یہ فاضل نزول سیمان جس چیز کی ابتدا ۱۷۸۹ء سے بیان کرتا ہی، اسلام میں بارہ سو برس پہلے قائم ہوچکی تھی، لیکن چونکہ فاضل مذکور، اسلام کی حقیقت اور تاریخ سے واقف نہ تھا، اُس نے دوسری قوموں کی بنا، پر تمام عالم کی نسبت عام رائے قائم کی، اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا،

(۵) ترقی تمدن کے بڑے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر قائم کیے جائیں، اسلام سے پہلے تمام دنیا کا عمل اس اصول کے خلاف تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس کی تلقین کی، چنانچہ یہ بحث نہایت تفصیل کیسا تھ اوپر گذر چکی ہی،

(۶) کسی قوم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اس کے ہر فرد کو من حیث القوم سلف آنر یعنی اپنی آپ عزت کا خیال دلایا جائے،، اسلام نے ابتدا ہی سے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا، اپنی آپ عزت کا خیال

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ	تم تمام قوموں سے بڑھکر ہو،
لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ	عزت خدا کے لئے ہی اور اس کے
وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ	رسول کے لئے اور مسلمانوں کیلئے،

قرنِ اول میں یعنی جب تک اسلام اسلام رہا، یہ خیال تمام مسلمانوں میں اسقدر جاگزیں تھا کہ قوم کا ہر ہر فرد من حیث القوم اپنے آپ کو افضل ترینِ عالم سمجھتا تھا،

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (سورۂ آل عمران)
اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہیئے کہ لوگوں کے اچھے کام کی رغبت دلائے اچھی باتوں کا حکم دے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (سورۂ براءت)
تمام مسلمانوں کو اٹھ کھڑا نہیں ہونا چاہیئے لیکن یہ تو ہونا چاہیئے کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ آمادہ ہوں کہ مذہب میں تفقہ کریں۔

(۱۰) ہر زمانہ میں ایک گروہ ایسا ہوتا آیا ہے جس کی یہ رائے ہے کہ انسانوں کے افراد میں جو اختلافِ مراتب ہے یہ مٹا دیا جائے۔ یورپ میں انارکسٹ نہلسٹ وغیرہ اسی خیال کے لوگ ہیں لیکن یہ درحقیقت اصولِ فطرت کے خلاف ہے، اور اگر اس پر عمل کیا جائے، تو ہر قسم کی ترقیاں دفعۃً رک جائیں، اسلام نے اس کا فلسفہ ان لفظوں میں ادا کیا،

انسانوں کا مختلف المراتب ہونا

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (زخرف ۳۰)
ہم نے دنیا میں انسانوں کی روزی انکے باہم تقسیم کی ہے، اور ایک کو ایک پر ترجیح دی ہے تاکہ ایک کو ایک اپنے کام میں لائے،

علمی ترقی کی انتہا نہ ہونی

(۱۱) ترقی کا بہت بڑا اصول یہ ہے کہ علمی ترقی کی کوئی انتہا نہ قرار دیجائے یعنی انسان ترقی کی کسی حد تک پہونچ کر قانع نہ ہو، اور یہ خیال رکھے کہ ابھی ترقی کے

اور سینکڑوں علما و شعرا پیدا ہوئے، جن جن قوموں نے دنیا میں اسلام قبول کیا، ان سب کا شمار کرو اور دیکھو کہ اسلام کے قبل ان کی علمی حالت کیا تھی، اور کیا ہو گئی، صاف نظر آئیگا کہ علم اسلام کے عنصر میں داخل تھا،

حکومت جمہوری

(۸) ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نظام حکومت جمہوریت کی بنا پر قائم کیا جائے اس اصول پر اسلام نے اس قدر زور دیا کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسکی پابندی کا حکم ہوا،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ — اور لوگوں سے مشورہ کر،

حالانکہ وحی و الہام کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی سے مشورہ اور صلاح لینے کی کیا حاجت تھی، مزید تاکید کے لئے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیت یہ قرار دی،

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ — ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے

تقسیم عمل

(۹) ترقی کا بڑا اصول یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے، یعنی ہر فرقہ ایک خاص کام میں مشغول ہو تاکہ اس کام کو بوجہ خصوصیت کے نہایت اعلیٰ درجہ تک ترقی دے سکے، یورپ میں یہ اصول یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ طبیبوں اور حکیموں میں سے خاص خاص امراض کے الگ الگ طبیب ہیں، اور وہ ان امراض کے سوا اور بیماریوں کے علاج سے واسطہ نہیں رکھتے، خود قدرت نے اسی اصول پر عمل کیا ہے ہاتھ پاؤں دل دماغ کے کام الگ الگ تقسیم کر دیئے ہیں، اسلام نے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا،

اس کو بالکل مٹا دیں مذہب کی تخصیص نہیں فلسفہ و حکمت کا میلان بھی اسی طرف ہی سقراط،
افلاطون، دیوجانس کلبی، ابو نصر فارابی کی زندگی بالکل جوگیوں کی طرز زندگی سے مشابہ
تھی، خوب غور سے دیکھو یہ خیال تمام دنیا پر کس قدر چھایا ہوا ہے، ہم جب کسی شخص کی
نسبت سنتے ہیں کہ دنیا اس کی نظر میں ہیچ ہے، وہ فرشِ خاک پر پڑا رہتا ہے، نان و نمک
پر بسر کر لیتا ہے، تو خود بخود ہمارے دل میں اسکی وقعت قائم ہو جاتی ہے، اور ہم اس سے
کچھ بحث نہیں کرتے کہ ان باتوں کے سوا اس میں کوئی اور کمال بھی ہے یا نہیں،

دین اور دنیا کا موازنہ اور ان میں صحیح تناسب کا قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے کہ
یورپ کے بڑے بڑے اہلِ نظر اس کو ناممکن الحصول قرار دیکر اس کے حاصل ہونے
پر حسرت ظاہر کرتے ہیں، ہنری برجیہ، ریویو آف ریویو (جلد ۲۴) میں لکھتا ہے "آہ
کاش کوئی ذہین شخص مذہبی اور علمی تعصب کے نقابوں کو ایک ساتھ چاک کر ڈالتا اور
اس مضبوط تعلق کو جو مذہبی خیال اور علمی تفکر میں ہے کھول کر دکھا دیتا، ایسا کرنے
سے جو رنج وہ کشمکش دونوں میں ایک مدت سے چلی آتی ہے، وہ مٹ جاتی"

اب دیکھو اسلام نے دین و دنیا کا کیونکر موازنہ کیا، اس سے سب سے پہلے جوگی پن
اور ترکِ دنیا کے خیال کو مٹایا۔

رہبانیت کو مٹانا

وَرُهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا	اور جوگی پنا جس کو عیسائیوں نے ایجاد
مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ	کیا، ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا۔
وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا	اور دنیا میں تمہارا جو حصہ ہی اسکو بھول نہ جاؤ

اور منازل طے کرنے باقی ہیں، اس مسئلہ پر اسلام نے اس قدر زور دیا کہ خود جناب سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو علوم لدنیہ سے ممتاز تھے، ان الفاظ سے مخاطب کیا،

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْماً، کہہ کہ اے خدا مجھکو اور زیادہ علم دے

دین و دنیا کا باہمی تعلق

دین و دنیا کا تعلق،

مذہب کے حق و باطل ہونے کا یہ بہت بڑا معیار ہے، ابتدائے عالم سے آج تک تمام مذاہب اور تمام قوموں نے (بجز اسلام) کے اس معیار میں غلطی کی ہے، فرقہ آباجیہ، مزدکیہ اور متبعان اپیکیورس صرف دنیاوی لذائذ کے قائل تھے، باقی تمام دیگر مذاہب نے دنیاوی تمتعات کو ہیچ بتایا اور جس قدر انسان دنیاوی حظوظ سے کنارہ کش رہے، اسی نسبت سے کمال کے مدارج قائم کئے، اسی خیال نے دنیا میں جوگی، تارک الدنیا، راہب، منک اور نن پیدا کئے، اور ان لوگوں کی وہ عزت دلوں میں قائم کی کہ ایک ذلیل بوریا نشین کے آگے بڑے بڑے شہنشاہ کا سر جھک جاتا ہے،

فویرباش لکھتا ہے کہ "مذہب کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ ملکی اور سیاسی زندگی تباہ کر دی جائے، دنیا کے تمام کاروبار اس غرض سے چھوڑ دیئے جائیں، کہ نہایت خضوع کے ساتھ بہشت کے انتظار میں گھلا جائے، اور ہر قسم کے فطری جذبات اور خواہشیں قتل کر دی جائیں"

لاروس لکھتا ہے کہ "زاہدوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فطرتی خواہشوں کا جو اثر انسان پر ہے

مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ — اس سے تازہ گوشت کھاؤ، اور اس سے زیور
حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ — نکالو جس کو تم پہنتے ہو، اور توکشتیوں کو دیکھتا ہے کہ
مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ — پھاڑتی ہوئی چلی جارہی ہیں، اور تاکہ تم خدا کا فضل
وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا — اور گھوڑوں اور گدہوں اور خچروں کو تمہاری
وَزِيْنَةً — سواری اور آرایش کیلئے پیدا کیا۔
وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا — اور بہت سی چیزیں تمہارے لئے زمین میں
اَلْوَانُهٗ — پیدا کیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔
يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ — وہی تمہارے لئے پانی سے کھیتی، زیتون، کھجور
وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ — اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا
الثَّمَرَاتِ — ہے۔

(سورۂ نحل پ ۱۴ ع ۲)

اس قسم کی سیکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا ضروری نہیں۔

ان آیتوں میں یہ تصریح و توضیح بیان کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اٹھائے، اور اسی غرض سے خدا نے تمام چیزوں کو انسان کا مسخر کردیا۔ تسخیر میں جس قسم کی تعمیم قرآن نے بیان کی وہ بظاہر استعارہ یا شاعرانہ طرز ادا معلوم ہوتا ہے لیکن زمانہ ہر روز ثابت کرتا جاتا ہے کہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقی معنے مقصود ہیں۔ بھاپ، بجلی، الکٹریسٹی، آواز وغیرہ یہ چیزیں کس طرح مسخر ہوچکیں، اور ان کی تسخیر سے کیسے کیسے عجیب و غریب کام لئے گئے۔

یہ نکتہ غور کرنے کے قابل ہے کہ دنیاوی حظوظ و لذائذ جن چیزوں کا نام ہے گو وہ ہزاروں لاکھوں ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ

مسلمانو! خدا نے جو اچھی چیزیں تمکو حلال کی ہیں، ان کو حرام نہ کرو،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ،

سورۂ اعراف

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہدے کہ خدا نے جو آرایش بندوں کے لئے پیدا کی ہے اسکو حرام کس نے کیا اور اچھی خوراکوں کو؟

يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ،

خدا تمہارے ساتھ آسانی کا برتاؤ چاہتا ہے نہ کہ سختی،

تمام دیگر مذاہب کی تلقین ہے کہ اس وسیع دنیا سے انسان کا حصہ سد رمق کھانا اور دو گز کپڑا ہے، لیکن اسلام بتاتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے زمین، دشت، کوہ، دریا، درخت، چارپائے لعل وجواہر، فواکہ وروائح سب اس لئے ہیں کہ انسان اس سے جائز طور پر لطف اٹھائے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا أَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان)

اور خدا نے تمہارے لئے زمین اور آسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کردیا اور تمہارے اوپر اپنی ہر قسم کی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کردیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (نحل)

اور خدا نے تمہارے لئے رات، دن، سورج چاند کو مسخر کردیا اور ستارے بھی تمہارے تابع فرمان ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا

وہی خدا ہے جس نے دریا کو اس لئے مسخر کردیا کہ

سب سے بڑھکر یہ کہ امتِ محمدیہ کو اعمالِ صالحہ کے معاوضہ میں جس چیز کے عطا کرنے کا وعدہ ہوا وہ خلافت اور سلطنت تھی،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	اور جنھوں نے اچھے کام کیے یہ وعدہ
فِی الْاَرْضِ،	کیا کہ ان کو خلافت دیگا،

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا جہاں ذکر کیا اس کی دنیاوی ترقیوں کا ذکر اس پیرایہ میں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ترقیوں کو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے میں بڑا دخل ہے،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ	اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور
حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ	ان کو خشکی و تری میں پہنچایا، اور ان کو
رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ	اچھے کھانے دیئے، اور ان کو
وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ	اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت
خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا،	بخشی،

ایک بہت بڑا قرینہ جس سے یہ پتہ لگ سکتا ہی کہ اسلام نے دولت و مال کا کیا درجہ قائم کیا ہی، اس بات کا دریافت کرنا ہے کہ قرآن مجید میں خدا نے مال و دولت کو کس لقب سے یاد کیا ہے،

قرآن مجید میں مال و دولت کو کن الفاظ سے یاد کیا ہے؟

استقصا اور تفحص سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید نے ۲۵ جگہ مال کو خدا کا فضل کہا ہو

لیکن ان کو اگر اقسام میں محدود کیا جائے تو کل تین قسمیں ٹھہریں گی، دولت و مال، آل واولاد،
شہرت اور بقائے نام، اب دیکھو اسلام نے اُن کے متعلق کیا کہا، تونگری اور جاہ و دولت
کو ان نعمائے الٰہی میں شمار کیا جن کے عطا کرنے کا احسان انبیاء علیہم السلام پر رکھا گیا،
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا نے جو احسانات کئے ان کا جہاں تذکرہ کیا یہ بھی فرمایا،

دنیا کا مرتبہ

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ،	اور تجھکو مفلس پایا تھا تو غنی کر دیا،

حضرت سلیمانؑ کو جو سلطنت اور جاہ و دولت عطا کی گئی اس کا ذکر قرآن مجید میں
نہایت شان و شوکت سے کیا، اور اُس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ خود حضرت سلیمانؑ نے
خدا سے اسکی استدعا کی تھی،

رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي	خدا! مجھکو ایسی سلطنت دے کہ
لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي ،	میرے بعد کسی کو نہ مل سکے،

بنو اسرائیل پر خدا نے جو احسانات کئے ان میں بڑا احسان یہ جتایا،

إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا	تم لوگوں میں پیغمبر اور بادشاہ پیدا کئے
وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکومت
الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	اور پیغمبری دی،

ایک اور آیت میں ہے،

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ	سو ہم نے ابراہیم کے خاندان کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا	اور حکومت دی اور انکو بہت بڑا ملک دیا

ضمیمہ

مسئلہ نبوت پر امام رازی کی تقریر کا خلاصہ

از مطالب عالیہ امام رازی

فصل اول جو لوگ نبوت کے قائل ہیں، ان میں دو فرقے ہیں، ایک کا یہ مذہب ہے کہ نبوت کی دلیل معجزہ ہے، یعنی اگر کوئی شخص نبوت کا مدعی ہو تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے پاس معجزہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ سچا نبی ہے، اور جب اس طرح اس کی نبوت ثابت ہو جائیگی تو جس بات کو وہ حق کہے گا، ہم حق سمجھیں گے اور جس کو باطل کہیگا اس کو باطل، قدیم اور عام مذہب یہی ہے،

دوسرے فریق کا یہ مذہب ہے کہ پہلے ہم کو خود یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ حق اور باطل کیا ہے،؟ اس کے بعد جب ہم کو یہ نظر آئے کہ ایک شخص حق کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے، اور اسکی دعوت میں یہ تاثیر ہے کہ لوگ باطل چھوڑ کر حق کی طرف آتے جاتے ہیں تو ہم سمجھیں گے کہ وہ سچا پیغمبر ہے، یہ طریقہ قریب العقل اور قلیل الشبہات ہے،

۱۲ جگہ اس کو خیر کے لفظ سے تعبیر کیا ہی، ۱۲ جگہ حسنہ کہا ہی، اور ۱۲ جگہ رحمت کا لقب دیا ہی،
چنانچہ علامہ احمد بن محمد الرازی نے ان تمام مقامات کی آیتیں بعینہا نقل کی ہیں ہم نمونہ کے
طور پر چند آیتوں کو نقل کرتے ہیں جن میں مال کو خیر کے لقب سے یاد کیا ہے،

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ قُلْ مَا أَنفَقْتُم
مِّنْ خَيْرٍ، وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ، وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ، مَّنَّاعٍ
لِّلْخَيْرِ، كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا، إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ
عَن ذِكْرِ رَبِّي، وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ،

دنیاوی حظوظ کی دوسری قسم آل واولاد ہے، قرآن مجید میں ایک موقع پر خدا نے
اپنے خاص بندوں کے امتیازی اوصاف گنائے ہیں، چنانچہ ان الفاظ سے ابتدا کی ہی،
وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا. ان اوصاف میں سے ایک صف یہ گنایا ہے،

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا	اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہمکو
مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ	ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھ کی ٹھنڈک دے،

تیسری چیز شہرت اور نیکنامی ہی، اس کا احسان خدا نے خود آنحضرت صلعم پر رکھا، اور فرمایا،
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ،

اخیر میں یہ کہنا بھی ضرور ہی کہ قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر دولت و مال کی برائی بھی بیان
کی ہی، لیکن جب دونوں قسم کے موقعوں کا موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آئیگا کہ جس دولت و مال کی برائی
بیان کی ہی وہ وہ ہی کہ بے موقع اور بیجا صرف کیجائے، اور اسکی برائی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے،

تمت

ملکوتیت سے مل جائے،

(۲) استقرا بھی اس کی شہادت دیتا ہے، اجسامِ عنصری کی تین قسمیں ہیں، معدن، نبات، حیوان، ان میں سب سے افضل حیوان ہے، پھر نبات پھر معدن، حیوان کے بھی بہت سے انواع ہیں، اور ان سب میں اشرف انسان ہے، اسی طرح انسان کے بھی بہت سے اصناف ہیں، مثلاً زنگی، ہندی، رومی، شامی، فرنگی، ترک، ان سب میں جو لوگ ایشیا کے وسط حصہ میں سکونت رکھتے ہیں، وہ سب سے افضل ہیں، اس قیاس پر ضرور ہے کہ خود ان لوگوں میں بھی کمال کا درجہ متفاوت ہوکر بڑھتا جائے یہاں تک کہ ایک ایسا شخص نکل آئے جو اپنے صنف میں بھی سب سے افضل ہو،

ہر دور میں ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو اپنے زمانہ کا افضل الناس ہوتا ہے، صوفیہ اسی کو قطب کہتے ہیں، اور سچ کہتے ہیں، کیونکہ جب اس عالم جسمانی کا بہترین حصہ انسان ہے، جو قوتِ نظریہ کی وجہ سے عالمِ ملکوت سے استفادہ کرتا ہے، اور قوتِ عملیہ کی وجہ سے دنیا کا عمدہ سے عمدہ انتظام کرسکتا ہے، تو عالم کا مقصود اصلی درحقیقت یہی انسان ہوا اور جب یہ شخص (یعنی قطب) اور تمام انسانوں سے بھی بڑھکر ہے، توگویا اس تمام عالم عنصری کا حاصل یہی شخص ہے، اس بنا پر اس شخص کو عالم کا قطب کہنا بالکل صحیح ہے، شیعہ اسی کو امام معصوم، صاحب الزمان اور غائب عن العیان کہتے ہیں، اور یہ کہنا ان کا بجا ہے کیونکہ جب وہ نقائص سے خالی ہے تو معصوم ہے، اور جب اپنے دور کا مقصد اصلی ہے، تو صاحب الزمان ہے، اور چونکہ عام لوگ اس کے کمال سے واقف

اس دوسرے طریقہ کو ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں، لیکن پہلے مقدماتِ ذیل ذہن نشین کر لینے چاہئیں،

(۱) انسان کا کمال یہ ہے کہ اس کی قوتِ نظری اور عملی دونوں کامل ہوں، قوتِ نظری کے کمال کے یہ معنی کہ حقائقِ اشیار کا اس کو صحیح علم ہو، یعنی اس کے ذہن میں جس شے کا تصور آئے ٹھیک اصلی صورت میں آئے، قوتِ عملی کے کمال کے یہ معنی کہ نفس میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ خود بخود اچھے کام سرزد ہوں،

(۲) دنیا میں تین طرح کے آدمی ہیں، ناقص یعنی جن کی قوتِ نظری اور عملی دونوں ناقص ہیں، یہ عوام الناس ہیں، خود کامل ہیں لیکن دوسروں کو کامل نہیں کر سکتے، یہ اولیار اور صلحا ہیں، خود کامل ہیں لیکن دوسروں کو بھی کامل کر سکتے ہیں یہ انبیا ہیں،

(۳) قوتِ نظری اور عملی کے درجے بہ لحاظ نقصان و کمال و شدت و ضعف نہایت مختلف ہیں، یہاں تک کہ ان کی کوئی حد نہیں قرار پا سکتی،

(۴) گو عموماً تمام لوگوں میں نقصان پایا جاتا ہے، لیکن ضرور ہے کہ انہی میں کوئی ایسا کامل بھی ہو، جو نقصان سے بمراحل دور ہو، اسکی تصدیق مختلف مثالوں سے ہوتی ہے

(۱) یہ ظاہر ہے کہ انسانوں میں کمال اور نقصان کے درجے نہایت متفاوت ہیں نقصان کے مدارج بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتے ہیں، کہ بعض انسان عقل اور ادراک میں بالکل جانوروں سے قریب ہو جاتے ہیں، جب نقصان کی جانب یہ حالت ہے، تو ضرور ہے کہ کمال کی جانب بھی یہی حالت ہو، یہاں تک کہ انسانیت کی سرحد

جیسا کہ عوام الناس کا حال ہے،

جب یہ مقدمات ثابت ہو چکے تو سمجھنا چاہئے کہ رُوح کا مرض، خدا سے اعراض اور دنیا میں انہماک ہے، جو شخص اس مرض کا طبیب ہوتا ہے، یعنی لوگوں کو خدا کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور دنیا سے ہٹاتا ہے، وہی پیغمبر ہوتا ہے، اوپر یہ بیان ہو چکا ہو کہ اس صفت میں اختلافِ مراتب ہوتا ہے، اس لئے جس شخص میں یہ صفت درجۂ کمال پر پائی جائے گی، وہ درجہ نبوت میں بھی کمال درجہ پر ہوگا، جس میں کم درجہ پر ہوگی، اس کی نبوت کا درجہ بھی نسبتًہ کم ہوگا،

فصل دوم | قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کے ثابت کرنے کا یہی طریقہ افضل اور اکمل ہے، چنانچہ ہم قرآن مجید کی بعض سورتیں نقل کرکے اُن کی تفسیر کرتے ہیں جس سے اس دعوی کی تصدیق ہوگی،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الآیۃ چونکہ الٰہیات اصل اور نبوت اسکی فرع ہے اس لئے قرآن مجید کا عام طریقہ یہ ہے کہ پہلے الٰہیات کا بیان ہوتا ہے، چنانچہ اس سورہ میں الٰہیات سے ابتدا کی، اور فرمایا کہ اپنے خدا کی تسبیح پڑھ، جو سب سے برتر ہے، یعنی اسکو ممکنات سے کسی طرح کی مناسبت نہیں، کیونکہ تمام ممکنات مادہ وصورت یا جنس وفصل سے مرکب ہیں، اور ان کی ذات یا صفات تغیر اور فنا کے قابل ہیں، لیکن خدا ان تمام باتوں سے برتر ہے،

قرآن مجید میں خدا کے ثبوت کی جس قدر دلیلیں مذکور ہیں، سب کا مدار صفات کے

نہیں، اس لئے گویا وہ غائب عن العیان ہے،

اسی قیاس پر ایک ایسا شخص بھی ہونا چاہئے جو سب افضلوں سے بھی افضل ہو، ایسا شخص سیکڑوں ہزاروں برس میں کہیں جاکر پیدا ہوتا ہے، اور وہی پیغمبر برحق اور موجد شریعت ہوتا ہے، ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو ان فضائل میں پیغمبر سے کم لیکن اور تمام لوگوں سے زیادہ ہوتے ہیں، یہ امام اور قائم مقام پیغمبر ہوتے ہیں، امام کو پیغمبر سے وہ نسبت ہوتی ہے جو چاند کو آفتاب سے ہے، امام سے جو کم رتبہ ہیں، ان کو پیغمبر سے وہ نسبت ہوتی ہے جو عام ستاروں کو آفتاب سے ہے، باقی عوام الناس تو وہ گویا حوادث یومیہ ہیں، جو اجرامِ فلکی کی تاثیر سے وجود میں آتے ہیں،

(۵) پیغمبر انسانیت کی اخیر سرحد پر ہوتا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر نوع کی انتہا دوسرے نوع کی ابتدا سے متصل ہے، اسلئے بشریت کی انتہا ملکوتیت کی ابتدا ہے، اس بنا پر پیغمبر میں ملکوتی صفات پائے جاتے ہیں، وہ جسمانی سے بے پروا ہوتا ہے، روحانیت اس پر غالب ہوتی ہے اسکی قوتِ نظریہ کے آئینہ میں معارفِ الٰہی مرتسم ہوتے ہیں، اُس کی قوتِ عملیہ عالم اجسام میں طرح طرح کے تصرفات کرسکتی ہے، اور اسی کا نام معجزہ ہے،

اوپر ثابت ہو چکا کہ نفوسِ ناطقہ مختلف الماہیۃ ہیں، بعض کی قوتِ نظری نہایت کامل ہوتی ہے، لیکن قوتِ عملی ضعیف ہوتی ہے، بعض اس کے برعکس ہوتے ہیں، بعض کو دونوں میں کمال ہوتا ہے اور یہ شاذ و نادر ہے، بعض کی دونوں قوتیں ضعیف ہوتی

کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ سمجھانے سے یہی مراد ہے کہ ناقصوں کی اصلاح کی جائے ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ ہر شخص میں اصلاح کی قابلیت نہیں، کیونکہ نفوسِ انسانی کے مدارج مختلف ہیں، بعضوں کو سمجھانے سے فائدہ ہوتا ہے بعضوں کو نہیں، بعضوں کو فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے، کیونکہ سمجھانے سے ان کے حسد، غیظ و غضب اصرار اور ہٹ کو اور ترقی ہوتی ہے۔

اس کے بعد خدا نے دونوں قسم کے آدمیوں کی خاصیتیں بیان کیں چنانچہ فرمایا،

سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ (وہ قبول کریگا جس کو خدا کا ڈر ہے) یعنی جن لوگوں میں اصلاح کی قابلیت ہوتی ہے، ان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ خوفِ الٰہی ہر وقت اُن پر چھایا ہوا رہتا ہو

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ (اور نصیحت سے وہ بدبخت دور رہتا ہے، جو بڑی آگ میں داخل ہونے والا ہے) یعنی جو بدبخت ہیں وہ نصیحت سے متنفر ہوتے ہیں، اور اس وجہ سے دنیا میں بھی مبتلائے مصیبت رہتے ہیں اور آخرت میں بھی،

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ (پھر یہ بدبخت نہ مریگا نہ جئے گا) نہ مرنا اس لئے کہ انسان مرنے سے دراصل نہیں مرتا کیونکہ روح زندہ رہتی ہے، نہ زندہ رہنا اس لئے کہ ایسا جینا گویا جینا نہیں؛

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ (وہ کامیاب رہا جس نے نفس کا تزکیہ کیا) انبیا کی تعلیم کا دو مقصد ہوتا ہے شر کا مٹانا اور خیر کی تعلیم دینا مَن تَزَكَّىٰ سے پہلے مقصد کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تزکیہ کے معنی اخلاقِ ذمیمہ کے زائل کرنے کے ہیں،

حدوث پر ہے (امام رازی کا یہ دعوی جو درحقیقت اشاعرہ کی آواز بازگشت ہے، ہمارے نزدیک صحیح نہیں، خدا کا ثبوت صفات کے حدوث پر مبنی نہیں)

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (وہ خدا جس نے بنایا اور ٹھیک بنایا) اس سے جسم کے عجائبات مراد ہیں، وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (وہ خدا جس نے اندازہ کیا اور راہ دکھائی) اس سے روح کی طرف اشارہ ہے، وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی، (اور وہ خدا جس نے چارہ پیدا کیا) اس سے نباتات کی طرف اشارہ ہے، حاصل یہ کہ جماد، نبات، حیوان، روح سب خدا کے ثبوت کے دلائل ہیں،

الٰہیات کا ذکر ہو چکا تو نبوات کا بیان کیا، اوپر بیان ہو چکا کہ انبیا کا کمال چار چیزوں میں ہے، قوتِ نظری، قوتِ عملی، دوسروں کی قوتِ نظری کی تکمیل، دوسروں کی قوتِ عملی کی تکمیل، چنانچہ ان چاروں کو بہ ترتیب بیان کیا،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰی (ہم تجھکو پڑھا دیں گے کہ پھر تو نہ بھولے گا) یہ قوتِ نظری کے کمال کا بیان ہے، یعنی اے پیغمبر تجھ کو نفس قدسی عطا کیا گیا ہی، جو غلطی اور نسیان سے محفوظ ہے، البتہ اقتضاے بشریت اس سے مستثنیٰ ہے،

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰی (اور ہم تجھ کو آہستہ آہستہ لائیں گے آسانی کی طرف) اس سے قوتِ عملی کے کمال کی طرف اشارہ ہے یعنی تجھ میں ایسا ملکہ پیدا کریں گے کہ خود بخود تجھ سے وہ کام سرزد ہوں گے جو سعادت اور راحتِ دارین کا سبب ہے،

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی (تو لوگوں کو سمجھا، اگر سمجھانا مفید ہو) اس سے ناقصوں

ان سب کے مقابلہ میں ضعیف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ تمام انسان معرضِ خطر میں ہیں صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے پاس روحانی تریاق ہے، یہ تریاق چار چیزوں سے مرکب ہے، پہلا قوتِ نظریہ کا کمال، اس کو ان لفظوں میں بیان کیا،

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے) دوسرا قوتِ عملی کا کمال، چنانچہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے، وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور وہ لوگ جنھوں نے اچھے کام کئے) تیسرا لوگوں کی قوتِ نظری کی تکمیل، وہ اس آیت میں بیان کی، وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ[1] چوتھا قوتِ عملی کی تکمیل، چنانچہ فرمایا،

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[2]، یہاں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں صرف صبر کا ذکر ہے اور محض صبر سے قوتِ عملی کی تکمیل کیونکر ہو سکتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر برائیاں ہیں دو چیزوں کے نتائج ہیں، شہوت اور غضب، شہوت ہر قسم کی بدکاریوں کا سبب ہے اور غضب، خونریزی اور سفاکی کا، اسی بنا پر جب خدا نے آدم کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے کہا،

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ (کیا تو ایسے شخص کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو خون ریزی اور فساد کریگا) تو جب انسان شہوت اور غضب کے روکنے پر قادر ہوگا اور اسی کا نام صبر ہے، تو قوتِ عملی کی جس قدر خوبیاں ہیں سب خود بخود اس کو حاصل ہوں گی،

---

[1] ترجمہ۔ اور لوگوں کو نصیحت کی سچائی کی [2] ترجمہ (اور لوگوں کو نصیحت کی صبر کی)

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی (اور خدا کو یاد کیا اور نماز ادا کی) اس آیت میں تعلیم خیر یعنی علم وعمل کی تکمیل کا بیان ہے کیونکہ راس العلم خدا کی معرفت اور راس العبادات نماز ہے

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (بلکہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں یعنی لوگ انبیاء کی تعلیم سے اعراض کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان پر دنیا کی محبت غالب ہوتی ہے

وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (اور آخرت زیادہ بہتر اور پائدار ہے) آخرت کی ترجیح دو طرح پر ثابت کی، ایک یہ کہ روحانی لذت، جسمانی لذت پر مقدم ہے، دوسرے یہ کہ آخرت کی لذتیں ابدی اور دائمی ہیں،

حاصل یہ کہ آیاتِ مذکورہ میں چار چیزوں کا بیان ہے، خدا کی ذات وصفات، نبوت کے اوصاف، سعید وشقی کی تقسیم اور دونوں کا انجام، دنیا پر عقبیٰ کی ترجیح، اور یہی چار چیزیں ہیں جو علم وعمل کی بنیاد ہیں، پھر فرمایا اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی ہے) یعنی جس قدر انبیاء گذرے سب کی تعلیم کا مقصد یہی چار چیزیں ہیں،

اسی طرح سورہ وَالْعَصْرِ میں بھی انہی چیزوں کا بیان ہوا ہے، چنانچہ ہم اس کی بھی تفسیر بیان کرتے ہیں،

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (بے شبہ انسان نقصان میں ہے) پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان میں ۱۹ مختلف قوتیں ہیں، دس حواس ظاہری وباطنی، دو شہوت وغضب، سات نباتی قوتیں اور یہی وہ ۱۹ چوکیدار ہیں جو جسم کے دوزخ پر متعین ہیں، یہ قوتیں سب کی سب انسان کو دنیا کی طرف کھینچتی ہیں، صرف ایک عقل روکنا چاہتی ہے، لیکن اس کی قوت

ہر کوچہ میں سر مارتے پھرتے ہیں یعنی وہ لذاتِ دنیوی کا ذکر کرتے ہیں، اور اسی کی ترغیب دلاتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا پرستی کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے شیطان ان کا شریک اور معین نہیں ہو سکتا، ان تمام آیتوں سے ثابت ہوا کہ نبوت کے اثبات کا یہ طرز اعلیٰ اور افضل ہے،

فصل سوم | پیغمبر کی دعوت کا طریقہ،

نبوت کا اصلی مقصد لوگوں کو دنیا سے اعراض اور عاقبت کی طرف توجہ کرنے کی تعلیم دینی ہے، لیکن چونکہ انسان کو دنیاوی تعلقات سے گریز نہیں اس لئے پیغمبر کو دنیوی معاملات پر بھی متوجہ ہونا پڑتا ہے، مذہبی تعلیم کے متعلق جو پیغمبر کا فرض ہے اس کے مہماتِ اصول تین ہیں،

(۱) یہ بتانا کہ عالم حادث ہے، اور اس کا ایک صانع ہے، جو ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا، جس کو ممکنات سے کسی طرح کی مشابہت نہیں، جو کمال کے تمام اوصاف کا جامع ہے جس کی قدرت تمام ممکنات میں ساری ہے جس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے، جو واحد اور یکتا ہے یعنی نہ اس کے اجزا ہیں، نہ اس کا کوئی شریک ہے، نہ مقابل ہے، نہ اسکی بیوی ہے، نہ بچے ہیں، اس کے بعد یہ بتانا کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم وارادہ سے ہوتا ہے، اور یہ کہ خدا ظلم اور ہرزہ کاری سے بالکل مبرا ہے، لیکن ان امور کی تعلیم کے لئے پیغمبر حسب ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(۱) ان عقائد کی تعلیم، مناظرہ اور مباحثہ کے طریقہ پر نہیں دیتا، کیونکہ اس

بہت سی آیتوں سے اسکی تائید ہوتی ہے، کہ نبوت کے لئے صرف انہی اوصاف چہارگانہ کا پایا جانا کافی ہے، معجزہ کی ضرورت نہیں، چنانچہ کفار نے جب رسول اللہ صلعم سے معجزات طلب کئے اور کہا کہ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ جاری کر دو تو خدا نے فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (اے محمد کہدے کہ سبحان اللہ! میں تو صرف آدمی ہوں اور پیغمبر ہوں) یعنی پیغمبری کے لئے ان باتوں پر قادر ہونا ضرور نہیں، بلکہ صرف قوت نظری اور عملی کا کمال کافی ہے،

اسی سورۂ شعراء میں جب خدا نے کہا کہ قرآن مجید خدا کا کلام اور شیطان کا کلام نہیں، تو ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں تمکو بتاؤں کہ شیطان کس شخص کے پاس آتے ہیں، تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (وہ جھوٹوں اور گنہگاروں کے پاس آتے ہیں) یعنی اگر یہ کلام شیطان کی طرف سے ہوتا تو شیطان چونکہ جھوٹ اور بدکاری کی تعلیم دیتا ہے اس لئے ضرور تھا کہ اس کلام کا پیش کرنیوالا خود بھی جھوٹا اور بدکار ہوتا اور اسی کی تعلیم بھی دیتا حالانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ترک دنیا اور توجہ الی اللہ کی تعلیم دیتے ہیں، اس آیت میں رسول اللہ صلعم کی نبوت پر جو استدلال کیا گیا صرف اس بنا پر کہ وہ ترک دنیا، اور توجہ الی اللہ کی تعلیم دیتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ نبوت کے لئے اسی قدر کافی ہے، معجزہ کی ضرورت نہیں،

کفار یہ بھی کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں اور ہر شاعر کے پاس ایک شیطان ہوتا ہے، اس کو شاعری میں مدد دیتا ہے، خدا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ شعرا

اور لوگوں کو اُن پر غور وفکر کرنے سے روکتا ہے،

چنانچہ جناب رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تعلیم کا یہی طریقہ اختیار کیا، اور یہی طریقہ تمام طریقوں سے بہتر ہے، آپ نے سب سے پہلے خدا کی تنزیہ نہایت زور کے ساتھ بیان کی اور یہ آیتیں پیش کیں،

وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ یعنی خدا بے نیاز ہے اور تم لوگ محتاج ہو، اس آیت سے خدا کا ہر چیز سے منزہ ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جب غنی ہو گا تو اسکو کسی چیز کی حاجت نہ ہوگی اور جب کسی چیز کی حاجت نہ ہوگی تو وہ نہ مرکب ہو گا نہ متحیز ورنہ اگر مرکب یا متحیز ہو تو اسکو اجزا یا مکان کی حاجت ہوگی

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (اس کے مثل کوئی چیز نہیں) اس سے ثابت ہے کہ خدا جسمانی نہیں ورنہ اجسام کے مشابہ ہوتا، اس کے ساتھ خدا کے وجود کو بار بار بڑی تاکید کے ساتھ بیان کیا، یہ اس لئے ضرور تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو لوگ سمجھتے کہ جب خدا نہ جسم ہے، نہ کسی مکان میں ہے، نہ جہت میں ہے تو سرے سے ہو ہی گا نہیں، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بیان کیا کہ خدا تمام معلومات کا عالم ہے،

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی وَمَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ، لیکن اس سے کچھ بحث نہیں کی، کہ علم کی یہ صفت عین ذات ہے یا غیر، پھر فرمایا کہ انسان فاعل ہے، صانع ہے، خالق ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ خیر و شر جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ان دونوں باتوں میں بظاہر جو تناقض معلوم ہوتا ہے، اسکی طرف کچھ توجہ نہیں کی، بلکہ صرف یہ حکم دیا کہ ان پر اجمالی ایمان لاؤ

طریقہ سے اعتراضات کا راستہ کھلتا ہے، اور پیغمبر اگر ان اعتراضات کے جواب میں مشغول ہو تو یہ سلسلہ بڑھتا جائے، اور اصل مقصد رہ جائے، اس لئے پیغمبر دلائل کو خطابیات کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے جن میں ترغیب اور ترہیب بھی شامل ہوتی ہے، ترغیب و ترہیب کی وجہ سے دل مرعوب ہو جاتا ہے، اور چون وچرا کی مجال نہیں رہتی، اور چونکہ فی نفسہٖ بھی وہ دلائل قوی ہوتے ہیں، اس لئے ارباب نظر کو بھی اس کے قبول سے چارہ نہیں ہوتا،

(۲) پیغمبر تنزیہ محض کی تعلیم نہیں دیتا، کیونکہ تنزیہ محض عام لوگوں کے خیال میں نہیں آسکتی، بلکہ وہ پہلے یہ بتاتا ہے کہ خدا ممکنات کی مشابہت سے منزہ ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے،

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ پھر یہ بتاتا ہے کہ خدا تمام مخلوقات پر غالب ہے، تمام اچھی باتیں اسی تک منتہی ہوتی ہیں، وہ عرش پر قائم ہے، لیکن ان پیچیدہ عقائد کے متعلق لوگوں کو غور اور فکر سے بالکل روکتا ہے، ہاں کوئی صاحب بصیرت ہو تو مضائقہ نہیں، پھر بتاتا ہے کہ انسان فاعل مختار ہے، جس کام کو چاہے کر سکتا ہے، جس کو نہ چاہے چھوڑ سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ گو انسان کو خدا نے ہر طرح کا اختیار دیا ہے تاہم جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے، ایک ذرہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا،

یہ دونوں خیال اگرچہ بظاہر متناقض ہیں، لیکن وہ ان کو اسی طرح رہنے دیتا ہے،

ہیں، دوسری نماز روزہ وغیرہ تیسری زکوٰۃ وغیرہ، تیسرا اصول قیامت اور واقعات قیامت پر ایمان لانا،

یہ تین چیزیں انبیاء کی تعلیم کا اصل الاصول ہیں،

مہمات دین کی دو قسمیں ہیں، امور حسنہ کی تحصیل، امور قبیحہ کا ازالہ، دوسری قسم پہلی پر مقدم ہے، کیونکہ ایک لوح پر اگر کوئی غلط تحریر ہو تو پہلے اس کے مٹانے کی ضرورت ہوگی، اس بناء پر سورۂ بقرہ میں فرائض مذہبی کے جو مراتب ہفتگانہ مذکور ہیں، ان میں سے پہلے تقویٰ کا ذکر ہے،

هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ کیونکہ اتقا امور قبیحہ سے بچنے کو کہتے ہیں، باقی مراتب میں یہ ترتیب ہے، کہ روح کا مرتبہ جسم سے مقدم ہے، اور جسم کا مرتبہ مال سے اسلئے پہلے

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ فرمایا کیونکہ ایمان اور اعتقاد لانا روح سے متعلق ہے پھر نماز کا ذکر کیا،

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ، کیونکہ نماز جسمانی اعمال میں داخل ہے، پھر زکوٰۃ کا بیان کیا،

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، کیونکہ زکوٰۃ مال سے متعلق ہے، یہ چاروں امور الٰہیات سے متعلق تھے، ان کا بیان ہو چکا تو نبوت کے متعلقات بیان کئے، چنانچہ فرمایا

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا ذکر ہے، پھر فرمایا،

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اصل اصول یہ ہے، کہ خدا کو ہر طرح منزہ مانا جائے، اور اس کے متعلق کچھ غور نہ کیا جائے کہ اس سے تناقض لازم آتا ہے، اس میں راز یہ ہے کہ اگر یہ مانا جائے کہ انسان اپنے برے افعال کا آپ خالق ہے تو خدا ظلم کے الزام سے بچ جاتا ہے لیکن اسکی قدرت کی وسعت تنگ ہو جاتی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ افعالِ بد کا خالق بھی خدا ہی ہے تو گو قدرت کی وسعت ثابت ہوتی ہے لیکن خدا پر ظلم کا الزام آتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم کی کہ خدا کو تمام افعال کا خالق بھی مانا جائے اور ظلم و جور سے بری بھی مانا جائے[1]

دوسرا اصول انبیاء کی تعلیم کا یہ ہے کہ انسان کو تین طرح سے خدا کی عبادت کرنی چاہئے، دل سے، اعضا سے، مال سے، پہلی قسم کی عبادت، معارف اور اعتقادات

[1] امام رازی کی یہ تقریر اگرچہ بظاہر نہایت لغو اور دور از کار معلوم ہوتی ہے، وہ ایسی تعلیم کی عمدگی ثابت کرتے ہیں، جو بالکل متناقض اور ضدیک دگر ہے، باقی یہ حکم کہ اس تناقض پر غور نہ کرو، کہاں تک تعمیل کے قابل ہے، غور اور فکر سے باز رہنا انسان کی اختیاری چیز نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام رازی نے انسان کی فطرت کو خوب سمجھا ہے، خود دیکھتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں آدمی خدا کی نسبت یہ تسلیم کرتے ہیں، کہ وہ تمام چیزوں کا خالق ہے، کوئی چیز اس کے حکم اور مرضی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی، ایک پتہ اس کے اشارہ کے بغیر ہل نہیں سکتا، باوجود اس کے یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا عادل ہے، منصف ہے، رحیم ہے، فیاض ہے، تو جب ایسے متناقض خیالوں کو لوگ تسلیم کرتے ہیں، اور ان کو خیال تک نہیں آتا، کہ یہ دونوں اعتقاد باہم متناقض ہیں تو اگر اس کی تعلیم دیجائے تو کیا اعتراض کی بات ہے، اس میں بھی شبہہ نہیں کہ اس مسئلہ میں ایک خاص پہلو اختیار کرنے سے یا جبر محض ہو جاتا ہے یا خدا کی عظمت و شان کا پورا اثر اس کے دل پر نہیں رہتا، اس لئے یہی جامع الاضداد طریقہ فطرت انسانی کے مناسب ہے، لیکن میرے دل سے پوچھو، تو میں انسان کو فاعل بااختیار مانتا ہوں اور اس سے خدا کی عظمت و شان میں کچھ فرق نہیں آتا،

لوگ آج عیسائیت کے مدعی ہیں وہ تثلیث کے قائل ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے تثلیث کی تعلیم نہیں دی تھی، اس بنا پر جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں وہ بھی درحقیقت عیسائی نہیں،

اب رسول اللہ صلعم کی نبوت پر غور کرو،

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے تمام عالم گمراہی میں مبتلا تھا، بت پرست پتھر پوجتے تھے، یہود خدا کو مجسم مانتے تھے، مجوسی دو خدا مانتے، اور ماؤں اور بیٹیوں سے نکاح کرتے تھے، عیسائی تثلیث کے قائل تھے، صابئین ستارہ پرست تھے، اس لحاظ سے تمام عالم گمراہ اور برگشتہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا ہونا تھا کہ تمام ادیانِ باطلہ غبار بن کر اڑ گئے، اور آفتاب توحید کی روشنی تمام دنیا میں پھیل گئی، اس سے علانیہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور ہدایت کا اثر تمام انبیاے سابقین سے بڑھکر تھا، اس لئے آپؐ نبوت کے اعتبار سے تمام انبیا سے اعلیٰ اور افضل ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افضل الانبیار ہونے کی یہ دلیل لمّی دلیل ہے یعنی پہلے نبوت کی حقیقت بیان کی گئی پھر یہ ثابت کیا گیا کہ وصف جس کمال کے درجہ پر آپؐ کی ذات میں تھا، اور کسی پیغمبر میں نہ تھا،

فصل پنجم | اس بیان میں کہ نبوت کی صحت پر اس طریقہ سے استدلال کرنا زیادہ قوی ہے بہ نسبت اس کے کہ معجزات سے استدلال کیا جائے،

معجزہ سے نبوت پر استدلال کرنا برہان انی ہے، یعنی اثر سے موثر پر استدلال کرنا ہے اور جو طریقہ ہم نے ابھی بیان کیا، یہ برہانِ لمی ہے، جس سے اصل نبوت کی حقیقت بھی ظاہر ہوجاتی

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یعنی انبیاے سابقین پر ایمان لانا بھی مشروط ہے، جب الٰہیات اور نبوات کا بیان ہو چکا اور ماضی حال مستقبل، تینوں زمانہ کے متعلق جو فرائض ہیں، ان کی تفصیل ہو چکی تو فرمایا،

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (یہی لوگ خدا کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں) مقصد یہ کہ جب تک آدمی دنیا میں ہے، مسافر ہے، اور مسافر کے لئے ضرور ہے کہ راستہ کے علامات اور حالات معلوم ہوں، اس بنا پر ان لوگوں کی شان میں جو فرائض مذکورہ پر کاربند ہیں، فرمایا، کہ یہ لوگ راستہ سے واقف ہیں، اور یہی لوگ مرنے کے بعد کامیاب بھی ہونگے، یعنی منزلِ مقصود تک پہونچ جائیں گے،

(اس تقریر کے بعد امام صاحب کہتے ہیں کہ دعوتِ اسلام کا یہ طریقہ بہترین طرق ہے، اور اگر میں شریعتِ اسلامی کے نکات اور لطائف کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائیگا، اس لئے اختصار پر قناعت کرتا ہوں)

فصل چہارم | اس امر کے بیان میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں،

اوپر بیان ہو چکا کہ پیغمبر وہ ہوتا ہے جو نفوسِ انسانی کا علاج کرتا ہے، اس بنا پر جس شخص میں یہ وصف زیادہ کمال کے ساتھ پایا جائیگا اسی قدر وہ پیغمبری میں بھی کامل ہوگا، اب انبیاے سابقین کے حالات پر غور کرو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کا اثر بنو اسرائیل تک محدود رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم قریبًا بالکل بے اثر رہی، جو

اور رغبت سے کرنے لگتے ہیں، باقی یہ اعتراض کہ شریعتوں میں جو تھوڑا سا ادل بدل ہوتا ہے، اس کے لئے قتل اور خونریزی کا جائز رکھنا پسندیدہ نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جزئیات میں اگر ایسا نہ کیا جائے تو کلیات کو بھی لوگ نہ مانیں گے، (لیکن میرے نزدیک شریعتِ اسلامی میں حفاظتِ خود اختیاری کے سوا کسی حالت میں قتل اور خونریزی کی اجازت ہی نہیں (شبلی نعمانی)

سب سے اخیر اعتراض یہ تھا کہ قرآن مجید میں تشبیہ کے الفاظ بہت وارد ہیں جن سے خدا کا جسمانی اور مکانی ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیہ محض، عام لوگوں کے خیال میں آ ہی نہیں سکتی تھی، اسلئے بین بین کا طریقہ اختیار کیا گیا۔

ہے، اس استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، امراضِ روحانی کے طبیب ہیں،
اور امراضِ روحانی کے طبیب ہی کو پیغمبر کہتے ہیں،

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منطق و فلسفہ و ہندسہ
و طب وغیرہ سے واقف ہونا ضرور نہیں بلکہ یہ چیزیں، استغراق اور توجہ الی اللہ میں
خلل انداز ہوتی ہیں، اس تقریر سے وہ تمام اعتراضات جو نبوت پر وارد ہوتے
ہیں، اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا، خود بخود اٹھ جاتے ہیں، مثلاً یہ اعتراض کہ ہر پیغمبر انبیائے سابقین
کی شریعت کو منسوخ کر دیتا ہے، اور یہ بالکل لغو بات ہے، اس کا جواب یہ ہے، کہ
شریعت کے دو حصے ہیں، عقلی اور وضعی، عقلی میں نسخ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ صرف خدا کی
تقدیس، اور خلق اللہ کی خیرخواہی کا نام ہے، اور یہ نسخ کے قابل نہیں، اسی بنا پر
قرآن مجید میں آیا ہے، کہ

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ، آؤ ہم تم
ایک ایسی بات پر متفق ہو جائیں جو ہم دونوں کے نزدیک مسلّم ہے، وہ یہ کہ خدا کے سوا
اور کسی کو نہ پوجیں،

شریعت کا دوسرا حصہ یعنی احکام اور قانون، یہ البتہ نسخ کے قابل ہے، اور اس میں
مصلحت یہ ہے کہ انسان جب کسی کام کو ایک مدت سے کرتا آتا ہے، تو پھر اس میں
اثر باقی نہیں رہتا، وہ اس کام کو بربنائے عادت کرنے لگتا ہی، نہ بربنائے رغبت و
شوق، اس لئے نسخ کے ذریعہ سے ایک جدت آجاتی ہے، اور لوگ اس کام کو شوق

ہیں، اور اُن کی حقیقت کو بالکل نہیں جانتے،

فرض کرو کہ کوئی شخص اگر خود کسی پیغمبر سے نبوت کی ماہیت اور اسکی جنس و فصل پوچھتا تو کیا پیغمبر نبوت کی حد و رسم کے بتانے میں مشغول ہوتا، اور کیا اگر پیغمبر ایسا نہ کرتا تو اس شخص کو یہ حق ہوتا کہ جبتک پیغمبر، نبوت کی حد تام نہ بتائے، وہ ایمان نہ لائے،

نبوت ایک وصف ہے جو انسانیت سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، انسان حیوانات کو مسخر کرتا ہے، لیکن حیوانات یہ عذر نہیں پیش کر سکتے کہ جب تک ہمکو انسان کی حقیقت اور ماہیت نہ بتائی جائے، ہم انسان کی اطاعت نہ کریں گے، عام انسانوں اور پیغمبر میں بھی یہی نسبت ہے، فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے بار بار خدا کی ماہیت اور حقیقت پوچھی لیکن حضرت موسیٰؑ نے حقیقت کچھ نہیں بتائی بلکہ صرف اسکی قدرت کے آثار بتائے، جس کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی حد و حقیقت بتائی نہیں جا سکتی، اور خدا پر ایمان لانے کے لئے حد و حقیقت کا معلوم ہونا ضروری نہیں،

دوسری بحث | نبوت کوئی اکتسابی چیز نہیں بلکہ خدا جس شخص میں یہ قابلیت پیدا کرتا ہے وہی نبی ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے،

اَللّٰہُ یَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ یعنی خدا ہی جانتا ہے کہ پیغمبری کے لئے کس کو انتخاب کرے، البتہ ریاضت، فکر، مجاہدہ، لوازم نبوت سے ہیں جن کی وجہ سے نبی وحی کے قابل ہوتا ہے، اسکی یہ مثال ہے کہ انسان کا انسان ہونا کوئی اکتسابی چیز نہیں، بایں ہمہ انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں ان میں کسب اور مجاہدہ

بحث نبوت پر امامِ غزالی کی تقریر کا خلاصہ

از معارج القدس غزالی

نبوت اور رسالت

اس مسئلہ میں امورِ ذیل سے بحث ہے،

۱۔ کیا نبوت کی حد اور حقیقت بیان کی جا سکتی ہو؟

۲۔ نبوت کوئی اکتسابی چیز ہے یا الہامی؟

۳۔ نبوت پر استدلال،

۴۔ نبوت کے خواص جن کو معجزات کہتے ہیں،

۵۔ تبلیغِ نبوت کی کیفیت،

پہلی بحث | نبوت کے مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اسکی حد تام بیان کیجائے سینکڑوں ہزاروں چیزیں ہیں جن کی جنس و فصل، حد اور حقیقت ہمکو معلوم نہیں، باوجود اس کے ہم اس کے مفہوم کو سمجھتے اور جانتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کا جاننا حدِ تام، یا جنس و فصل کے جاننے پر موقوف نہیں، عقل، روح اور غیر مادی اشیار کا تصور ہم کرتے

ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ تمام انسانوں سے ممتاز نظر آتے ہیں، تمام انسان اُن کے محکوم اور تحت التصرف ہوتے ہیں اور جس طرح انسان کے افعال اور حرکات حیوانات کے لئے معجزہ ہیں یعنی حیوان کبھی انسان کی قوتِ فکری اور عقلی کا ہمسر نہیں ہوسکتا، اسیطرح انبیا سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ عام انسانوں کے لئے معجزہ ہوتے ہیں، یعنی اور لوگوں سے وہ افعال سرزد نہیں ہوسکتے؛

جس طرح نبی کی عقل اوروں سے ممتاز ہوتی ہے، اسی طرح اس کا نفس اسکی طبیعت اس کا مزاج بھی تمام لوگوں سے ممتاز اور نفوسِ ملکی کے مشابہ ہوتا ہے،

جس طرح ہر حیوان، انسان نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر آدمی نبی نہیں ہوسکتا خدا ہی جانتا ہے کہ کس شخص میں نبی ہونے کی قابلیت ہے اور کس میں نہیں، خدا جس شخص کو نبوت کے لئے انتخاب کرتا ہے اسکی عقل، اسکی طبیعت، اس کا مزاج بھی منتخب ہوتا ہے یعنی اور لوگوں کی عقل، مزاج اور طبیعت سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہوتی، وہ صورۃً انسانوں کے مشابہ ہوتا ہے، لیکن معنًی سب سے الگ ہوتا ہے، وہ بشر ہوتا ہے لیکن اسکی بشریت وحی کے قابل ہوتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ میں انہی دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہے،

تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں،

پہلا طریقہ انسان میں تین قسم کی قوتیں پائی جاتی ہیں، فکری، قولی، عملی، ان قوتوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی، ان

کو دخل ہوتا ہے، اسی طرح نبوت گو کوئی اکتسابی چیز نہیں لیکن نبی عبادت اور مجاہدہ کرتا ہے تب اس پر نبوت کے آثار مرتب ہوتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسقدر عبادت کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔

نبی فطرۃً معتدل مزاج اور پاکیزہ صورت ہوتا ہے، اسکی اُٹھان اور تربیت عمدہ ہوتی ہے، اس میں شریفانہ اخلاق پائے جاتے ہیں، اس کے چہرہ سے نور ٹپکتا ہے، حلم وقار، تواضع، راست گوئی، دیانتداری، اس کی فطرت ہوتی ہے، وہ ہر قسم کے رذائل اور دنی باتوں سے بری ہوتا ہے، عفو، احسان، صلۂ رحم، حفظ غیب، حسن جوار، اعانت مظلوم، یہ تمام اوصاف اُس میں بالطبع پائے جاتے ہیں، وہ بالطبع اچھی باتوں کو پسند اور بری باتوں سے نفرت کرتا ہے، وہ مغرور، جابر، درشت خو اور کج خلق نہیں ہوتا، چپ رہتا ہے، تو لوگوں پر اس کا رعب چھا جاتا ہے، بات کرتا ہے تو اس پر کوئی گرفت نہیں کرسکتا، اسکی حرکت وسکون دونوں میں سنجیدگی پائی جاتی ہے، تمام لوگ طوعًا اور کرہًا اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں،

تیسری بحث | نبوت کا ثبوت،

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، اجمالی وتفصیلی، چنانچہ ہم دونوں کو الگ الگ بیان کرتے ہیں، یہ امر بدیہی ہے کہ انسان کو جو چیز تمام حیوانات سے الگ کرتی ہے وہ نفس ناطقہ ہے، یہی چیز ہے، جس کی بدولت انسان حیوانات سے فائق ہے، ان کو مسخر کرتا ہے، ان پر ہر طرح کا تصرف کرتا ہے، اسی طرح انبیاء میں ایک خاص عقل

یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص ایسا دستور العمل اور ضابطہ نہیں بنا سکتا، جو تمام نبی نوع انسان کے مناسب حال اور ہر ہر شخص کی ضرویات کا کفیل ہو، ایسا ضابطہ صرف وہ شخص وضع کر سکتا ہے، جس کو قوتِ قدسیہ حاصل ہو، جس کو ان روحانیات سے فیض پہنچتا ہو جن کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے، یہ شخص رموزِ مذہب سے آگاہ ہوتا ہے، ہر بات میں حق کا پیرو ہوتا ہے، ہر شخص سے اسکی سمجھ کے موافق خطاب کرتا ہی، لوگوں کو ان کی استطاعت کے موافق، احکام کی تکلیف دیتا ہے، یہی شخص پیغمبر اور رسول ہوتا ہے،

تیسرا طریقہ | اس طریقہ کے سمجھنے کے لئے مقدماتِ ذیل ذہن نشین رکھنے چاہئیں،

(۱) چونکہ ممکن کا وجود و عدم برابر ہے، اس لئے ممکن کے وجود میں آنے کے لئے مرجح کا ہونا ضرور ہے، جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو، یہی مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے،

(۲) ہر قسم کی حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے، جو حرکت کی تجدید کرتا رہتا ہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں، طبعی اور ارادی، ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے،

ارادی حرکت کی بھی دو قسمیں ہیں، خیر و شر، پہلی قسم کے لئے ضرور ہے، کہ اس کا محرک صاحبِ عقل و تدبیر ہو، اسی بنا پر خدا نے فرمایا وَاَوْحیٰ فِی کُلِّ سَمَآءٍ اَمرَھَا یعنی خدا نے ہر آسمان میں بذریعہ وحی کے اپنا حکم بھیجا،

حالتوں کے لحاظ سے ہر ایک کا الگ نام ہوتا ہے، فکر کو حق و باطل سے موسوم کرتے ہیں، قول کو صادق و کاذب کہتے ہیں، عمل کو خیر و شر سے تعبیر کرتے ہیں،

یہ امر ظاہر ہے کہ تمام افعال قابلِ عمل نہیں ہیں، اور نہ سب قابلِ ترک، بلکہ بعض قابلِ عمل ہیں اور بعض قابلِ ترک،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قابلِ عمل اور قابلِ ترک کی تمیز آیا ہر شخص کر سکتا ہے، یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں، اور بعض نہیں، پہلے دونوں احتمال بداہۃً باطل ہیں، اس لئے صرف تیسرا احتمال باقی رہا یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں افعال عمل کے قابل ہیں، اور فلاں نہیں، یہی لوگ پیغمبر اور بانیِ شریعت ہوتے ہیں،

دوسرا طریقہ یہ امر ظاہر ہے کہ انسان کی بقا آپس کی اعانت اور اجتماع کے بغیر نہیں ہو سکتی، اگر آپس میں تعاون اور تعاضد نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد باقی رہ سکتا ہے، نہ اُسکی نوع، نہ اس کا مال، نہ اُس کی عزت، اس اجتماع اور تعاون کے جو اصول اور آئین ہیں، انہی کو شریعت کہتے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی بقاے نوع اور بقاے جان و مال کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، تعاون اور تمانع، تعاون کے ذریعہ سے انسان اپنی خوراک، لباس اور مسکن اور دیگر ضروریات مہیا کرتا ہے اور تمانع کے ذریعہ سے اسکی جان و مال و اولاد خطرات سے محفوظ رہتی ہے، لیکن اس تعاون اور تمانع کا کوئی باقاعدہ ضابطہ اور دستور العمل ہونا چاہئے،

نظامِ عالم میں خدا کا تدبیری حکم جو نافذ ہے، ملائکہ کے ذریعہ سے ملے' اس قیاس پر انسانوں پر خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی کسی کے ذریعہ سے ہوگا اسی کا نام پیغمبر ہے' باقی جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ امر و نہی، ترغیب و ترہیب، تنبیہ و تہدید انبیا خود اپنی طرف سے کرتے ہیں، خدا کو اس سے واسطہ نہیں، اور خدا کی طرف ان افعال کی نسبت مجازاً ہے، تو یہ لوگ انبیاء کو (نعوذ باللہ) کاذب اور خائن قرار دیتے ہیں،

جب یہ مسلّم ہے کہ خدا تمام عالم کا بادشاہ ہے، اور بادشاہ عموماً امر و نہی، تنبیہ و تہدید، ترغیب و ترہیب کرتے ہیں، تو خدا سے یہ امور کیوں بعید ہیں،

نبوت کے خواص | نبوت کے تین خاصے ہیں، ایک قوت تخیل سے متعلق ہے، دوسرا قوتِ نظری سے، تیسرا قوتِ عملی سے، پہلی خاصیت کی تفصیل حسب ذیل ہے،

امام غزالیؒ نے یہاں یونانی فلسفہ کا ایک مسئلہ بیان کیا ہے، اور اس کو بہت پھیلا کر لکھا ہے، لیکن وہ مسئلہ نہایت لغو اور مہمل ہے، اور اسکی دلیل اس سے زیادہ مہمل، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یونانیوں کے نزدیک افلاک، ذی روح ہیں، اور تمام کلیات و جزئیات کی صور علمیہ ان کے نفس میں مرتسم ہیں، اس بنا پر وہ عالم جزئیات و کلیات ہیں، انسان کو جو علم ہوتا ہے وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ صور علمیہ جو افلاک کے نفوس اور جواہر مجردہ میں مرتسم ہیں' وہی انسان کے نفسِ ناطقہ میں مرتسم ہو جاتے ہیں، کیونکہ نفسِ ناطقہ چونکہ مجرد ہے اسلئے اسکو عقولِ مجردہ اور نفوسِ افلاک سے اتصال ہوتا ہے، لیکن امام صاحب کا اصلی استدلال اس مسئلہ کے ماننے پر موقوف نہیں، وہ

(۳) جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے، یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں، اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے رہنما کی بھی ضرورت ہے، جو ٹھیک راستہ بتائے، تاکہ وہ حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے خیر کو شر سے تمیز کر سکے،

(۴) خدا کے حکم، دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی. پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے، جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور نظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے،

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ	آفتاب، چاند، تارے سب
مُسَخَّرَاتٍ	اس کے حکم کے تابعدار ہیں،
بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ	ہاں خلق اور امر دونوں خدا ہی
وَالْأَمْرُ،	کے لئے ہیں،

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ	اے لوگو خدا کی عبادت کرو
الَّذِي خَلَقَكُمْ،	جس نے تمکو پیدا کیا،

مقدماتِ مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اسلئے مرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں، اسلئے عقل کی ضرورت ہے، محتمل الخیر والشر ہیں اسلئے رہنما کی ضرورت ہے، اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے،

حواسِ ظاہری معطل رہتے ہیں، لیکن بعض آدمیوں میں یہ قوت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ حواسِ ظاہری کے بحال رہنے کی حالت میں بھی وہ اپنا کام کرتی ہے، اور اس لئے بیداری میں بھی ان کو وہ باتیں نظر آتی ہیں، جو اور لوگوں کو خواب کی حالت میں نظر آتی ہیں،

قوتِ متخیلہ کو جو صورتیں نظر آتی ہیں، کبھی وہ ان میں تصرف کرکے حسِ مشترک کے حوالہ کرتی ہے، اس صورت میں انسان عجیب وغریب خدائی صورتیں اور آوازیں مشاہدہ کرتا اور سنتا ہے، یہ صورتیں اور آوازیں بالکل محسوسات کے مثل ہوتی ہیں، یہ نبوت کا ادنیٰ درجہ ہے، اس سے ترقی ہو کر یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ قوتِ متخیلہ ان صورتوں میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرتی، اور بعینہ وہی صورتیں حسِ مشترک میں آتی ہیں،

اس سے بڑھکر یہ کہ قوتِ متخیلہ اور قوتِ عقلی اور عملی، ایک ساتھ کام کرتی ہیں، اور یہ درجہ نبوت کا وہ درجہ ہے، جو قوت عقلی، عملی اور خیالی تینوں کا جامع ہے، قرآن مجید کے قصوں پر خیال کرو، کس طرح ایک ایک جزئی واقعہ بیان کیا ہے، گویا تمام واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے تھے اور یہ تمام واقعات بالکل سچ ہیں،

یہ امر کہ جو صورتیں قوتِ متخیلہ میں مرتسم ہوتی ہیں، وہ حسِ مشترک میں آکر آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہیں، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا، مجانین کو دیکھو، وہ جو کچھ تخیل کرتے ہیں، ان کو آنکھوں سے نظر آنے لگتا ہے، اصل یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ، عقل اور حس دونوں کے درمیان میں واقع ہے، حس، قوتِ متخیلہ کے سامنے محسوس صورتیں

ل[1] انبیا کی اس قوت کو قوت متخیلہ کے بجائے قوتِ قدسیہ کہنا زیادہ صحیح ہے، "شبلی نعمانی"

قوت متخیلہ سے استدلال کرتے ہیں، اور قوت متخیلہ کے وجود سے کسی کو انکار نہیں ہے،

قوت متخیلہ میں جو اشیاء کی صورتوں کے مرتسم ہونے کی قابلیت ہے وہ مختلف المدارج ہے بعض آدمیوں میں یہ قابلیت قوی ہوتی ہے، بعض میں کمزور اور بعض میں بالکل ندارد، قوت متخیلہ جب قوی ہوتی ہے تو محسوسات سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی فوراً اس میں صورتیں مرتسم ہونی شروع ہوتی ہیں، قوت متخیلہ کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ وہ ایک صورت پر قناعت نہیں کرتی، ایک صورت کو چھوڑکر وہ دوسری صورتیں پیدا کرنی شروع کرتی ہے، جو پہلی صورت کے مشابہ یا مخالف ہوتی ہیں، مثلاً انسان ایک شئے کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، دیکھتے دیکھتے اس کا خیال ایک ذرا سے تعلق سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، پھر اُس چیز سے ایک اور چیز کی طرف، یہانتک کہ پہلی چیز بالکل بھول جاتی ہے، اسی حالت میں پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس چیز کا کیوں تصور ہوا تھا، اس طرح پھر سلسلہ بہ سلسلہ پہلے خیال کی طرف واپس آجاتا ہے؛

یہ قوت بعضوں میں اس قدر مستحکم اور قوی ہوتی ہے، کہ جو صورت خیال میں آتی ہے، وہ قائم رہتی ہے، اور اُس سے ہٹ کر دوسری صورتوں کی طرف منتقل نہیں ہوتی اس قسم کی قوت سے جو خواب نظر آتا ہے وہ محتاجِ تعبیر نہیں ہوتا،

قوت متخیلہ عموماً اس وقت کام کرتی ہے، جب ظاہری حواس بیکار ہوتے ہیں، اسی بنا پر نیند کی حالت میں یہ قوت زیادہ تر کام کرتی ہے، کیونکہ اُس وقت

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ تخیل کے مراتب مختلف اور ضد یک دگر ہیں یہاں تک کہ بعض حکمار کا قول ہے کہ تخیل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ روح کو اس نفس سے اتصال ہو جائے، جو فلک قمر کی مدبر اور واہب الصور ہے، اور تمام وہ صورتیں اس میں مرتسم ہو سکیں جو نفس فلکی میں مرتسم ہیں (یہ وہی ارسطو کا خیال ہے کہ افلاک صاحب ادراک ہیں اور جو صور علمیہ ان میں مرتسم ہیں، وہ سب انسان کے نفس ناطقہ میں بھی مرتسم ہو سکتے ہیں) یہ تخیل کا اعلیٰ درجہ ہے،

تخیل کا ادنیٰ درجہ حیوانات میں پایا جاتا ہے، اور بعض حیوانات میں مطلقاً یہ قوت نہیں ہوتی،

یہ اختلاف قوت وضعف کی بنا پر تھا، تباین اور تضاد کا اختلاف اس طرح ہوتا ہے، کہ بعض تخیلات سچے اور صحیح ہوتے ہیں اور ان کا مخرج نفوسِ مقدسہ ہوتے ہیں، بعض بالکل جھوٹے اور فتنہ انگیز اور ان کا مخرج نفوسِ خبیثہ ہوتے ہیں، بعض دونوں کے بین بین، یہ بات بھی یہاں جتانے کے قابل ہے کہ عقل[۱] خیال[۲] اور حس[۳] کے مختلف اقسام ہیں، عقل[۱] محض جس میں مطلق خیال کی آمیزش نہیں، خیال[۲] محض جس میں عقل کا لگاؤ نہیں، عقل[۳] جو بالکل خیال ہے، خیال[۴] جو بالکل عقل ہے، حس[۵] جو خیال سے پیدا ہوتی ہے، خیال[۶] جو حس سے پیدا ہوتا ہے،

اسی طرح بعض علم بالکل ظن کے مشابہ ہوتے ہیں اور بعض ظن علم کے ہم پایہ

پیش کرکے اس کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے عقل کا یہ کام ہے کہ قوتِ متخیلہ کو غلط تخیلات سے روکتی ہے، ان دونوں قوتوں کی کشمکش اور مزاحمت میں قوتِ متخیلہ اپنا اصلی کام آزادی سے نہیں کرسکتی لیکن جب ان میں سے ایک کا زور کم ہوتا ہے تو قوتِ متخیلہ آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے، مثلاً جب قوتِ حسیہ کا بار اس پر نہیں پڑتا تو وہ عقل پر غالب آکر اپنے خاص کام میں مشغول ہوتی ہے، یعنی صورتوں کو اصلی صورت میں حسِ مشترک کے حوالہ کرتی ہے، نیند میں یہی کیفیت ہوتی ہے، یا مثلاً جب عقل کی حکومت سے اسکو نجات ملتی ہے تو قوتِ حسیہ پر غالب آکر خیالی صورتوں کو اس طرح حسِ مشترک میں بھیجتی ہے، کہ وہ آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہیں، چنانچہ جنون اور خوف کی حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے، اسی بنا پر ان حالتوں میں مجانین کو وحشت ناک صورتیں نظر آتی ہیں اسی بنا پر واقعاتِ غیب کی خبر جو لوگ دیتے ہیں، اسی حالت میں دیتے ہیں جب ان کے قوائے حسیہ باطل ہو جاتے ہیں، اور ان پر صرع یا غشی طاری ہوتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوتِ متخیلہ زیادہ کام کرتے کرتے تھک جاتی ہے اس صورت میں وہ محسوسات کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے، اور اس وجہ سے نفسِ ناطقہ سے اتصال ہوتا ہے، اور صورِ مجردہ کو وہ مشاہدہ کرتی ہے، کاہن جو واقعاتِ آیندہ کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اسی حالت میں کرتے ہیں،

یہاں یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ جب مجانین، کاہن، آسیب زدہ بھی واقعاتِ آیندہ کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں تو نبوت کو کیا ترجیح ہوئی۔

اشیاے مجہولہ کا علم دو طریقے سے ہوتا ہے، فکر اور حدس، فکر میں ذہن مقدمات معلومہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، حد اوسط کو تلاش کرتا ہے، سب کو ملا کر ترتیب دیتا ہے، ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے، حدس میں دفعۃً تمام مقدمات ذہن میں آجاتے ہیں، اور اُن سے فوراً نتیجہ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، ممکن ہے کہ اس حالت میں بھی حرکتِ فکری وقوع میں آتی ہو، لیکن یہ حرکت اس قدر جلد اور غیر نمایاں ہوتی ہے، کہ ذہن اس کو مطلق محسوس نہیں کرتا حدس میں کم و کیف دونوں اعتبار سے اختلافِ مراتب ہوتا ہے بعض آدمیوں کو اکثر حدس ہوتا ہے بعض آدمیوں کو نہایت جلد ہوتا ہے یعنی ذرا سا غور کرنے سے فوراً مقدمات ذہن میں آجاتے ہیں، اور ساتھ ہی نتیجہ بھی ذہن میں آجاتا ہے، حدس کے مراتب نہایت مختلف ہیں، بعض ایسے کودن ہوتے ہیں کہ سیکڑوں دفعہ غور کرنے سے بھی ان کا ذہن نتیجہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، بعض کا ذہن جلدی سے منتقل ہوتا ہے، بعض کا اس سے بھی زیادہ وھکذا الیٰ آخر النہایۃ،

حدس کا جو سب سے انتہائی درجہ ہے، وہ نبوت کا خاصہ ہے، نبی کو جو اشیار کا علم ہوتا ہے مقدمات کی ترتیب اور استنباط سے نہیں ہوتا بلکہ خود بخود دفعۃً اس کے دل میں القا ہو جاتا ہے،

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ قوت نبی کے سوا اور لوگوں میں بھی ہوتی ہے جو شخص کسی فن کا ماہر ہوتا ہے اس فن کے متعلق اکثر امور دفعۃً اس کے ذہن میں

ہوتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت میں وَ اَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ دوسری قسم کے ظن کا ذکر ہے،

"قرآن مجید[1] میں جن کا جہاں ذکر آیا ہے، ظن کے لفظ سے آیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا وجود اور ان کا تصور خیالی ہے، اور ان کی صورتیں صرف خیال کو نظر آسکتی ہیں، اور چونکہ خیال حس اور عقل کے درمیان میں ہے، اس لئے جو چیز خیالی ہوگی وہ جسمانی اور روحانی کے بین بین ہوگی، جیسے اجنہ اور شیاطین، اور جو چیز وسط میں ہوتی ہے، وہ یا تو طرفین سے مرکب ہوتی ہے، یا دونوں سے الگ ہوتی ہے۔"

نبوت کی دوسری خاصیت | یہ خاصیت قوت نظری کے تابع ہے:

اشیائے مجہولہ کے ادراک کا طریقہ یہ ہے کہ چند معلوم باتوں کو ترتیب دیتے ہیں، اس ترتیب سے ایک مجہول بات معلوم ہو جاتی ہے، مثلاً ہمکو معلوم تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے، یہ بھی معلوم تھا کہ جس چیز میں تغیر ہوتا رہتا ہے، وہ فانی ہے، ان دونوں مقدمات کو جب اس طرح ترتیب دیا کہ عالم متغیر ہے، اور جو متغیر ہے، فانی ہے، تو یہ نتیجہ نکلا کہ عالم فانی ہے، یہ نتیجہ ہمکو پہلے معلوم نہ تھا، لیکن جن مقدمات کی ترتیب سے معلوم ہوا وہ پہلے سے معلوم تھے، ان مقدمات کو صغری اور کبری کہتے ہیں، اور جو جزء دونوں مقدموں میں مشترک ہوتا ہے، اسکو حد اوسط کہتے ہیں،

[1] یہ فقرہ امام غزالی کی عبارت کا لفظی ترجمہ ہے،

تو اس کو وجدان اور دلیل دونوں حاصل ہونگے،

خاتمہ | نوعِ بشری میں سب سے افضل وہ ہے، جس کی قوتِ حدسیہ اس قدر قوی ہو کہ اس کو تعلم و تعلیم کی بالکل حاجت نہ ہو اور قوتِ متخیلہ اس قدر صحیح اور مضبوط ہو کہ محسوسات اس کو اپنی طرف متوجہ نہ کرنے پائیں، بلکہ نفس سے جو ادراکات پیدا ہوتے ہیں، وہ مجسم ہو کر سامنے آئیں، اور قوتِ نفسانی اس قدر قوی ہو کہ عالمِ اجسام پر اثر ڈال سکے، یہاں تک کہ اجرامِ علوی بھی اس کے دست رس میں آجائیں،

اس درجہ سے اتر کر وہ شخص ہے، جس میں صرف دو پہلی باتیں ہوں، اس سے کم وہ جس کی صرف قوتِ نظری قوی ہو، اس سے کم وہ جس کی صرف قوتِ عملی قوی ہو،

جس شخص میں تینوں باتیں پائی جائیں وہ گویا شہنشاہ ہے، عالم علوی سے اس کو یہ نسبت ہے کہ جب چاہے اُس عالم میں شامل ہو جائے، عالمِ نفسانی کا وہ گویا رہنے والا ہے اور عالم اجسام پر جس قسم کا چاہے تصرف کر سکتا ہے،

اس سے کم درجہ پر جو شخص ہے وہ دوسرے درجہ کا بادشاہ ہے، اس سے کم درجہ کے لوگ شرفاے امت ہیں،

جن میں کسی قسم کی قوت نہ ہو، لیکن اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونے کی قابلیت ہو وہ اذکیاے امت ہیں جو عام آدمیوں سے ممتاز ہیں،

آجاتے ہیں، تو نبی کو ترجیح کیا ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ اس قوت میں اختلافِ مدارج ہے تو نبوت کا خاصہ وہ حد ہے، جو ان مدارج کی اخیر انتہا ہے،

نبوت کا تیسرا خاصہ یہ امر بداہۃً ثابت ہے کہ خیالی اور تصور کا اثر جسم پر پڑتا ہے، انسان پر جب خوف طاری ہوتا ہے تو جسم پر ایک خاص حالت طاری ہوتی ہے، غصہ کی حالت میں دوسرا اثر ہوتا ہے، ایک محبوب صورت کا خیال دل میں آتا ہے تو اعضا میں ایک اور قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوائے نفسانی جسم پر اثر کرتے ہیں، اب جس طرح نفس کا اثر اپنے جسم پر ہوتا ہے، ممکن ہے کہ بعض نفوس ایسے قوی ہوں کہ ان کا اثر صرف ان کے جسم پر محدود نہ ہو، بلکہ اور اجسام پر بھی اثر کریں جس سے تبرید یا تحریک، یا سکون یا تکثیف یا تلیین حاصل ہو اور اس کا یہ نتیجہ ہو کہ بادل پیدا ہو جائیں، یا زلزلہ آجائے، یا چشمہ جاری ہو جائے، اس قسم کی قوت جن نفوس میں ہوتی ہے، وہ اگر نیک اور پاکیزہ اخلاق ہوں تو یہ افعال معجزہ یا کرامت کہلاتے ہیں، ورنہ سحر اور جادو، یہ قوت تزکیہ نفس اور ریاضت سے ترقی کر سکتی ہے،

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ یہ امور فرضی نہیں ہیں بلکہ چونکہ تجربوں سے ان کا ثبوت ہوا ہے، اس لئے اُن کے اسباب سے بحث کی گئی، اگر کسی شخص میں یہ قوت خود موجود ہو، اور وہ ان افعال کے اسباب پر غور کرے

دوبویس ریمونڈ	Du Bois Reymond	
میلن اڈورڈ	Milne Edward	
ویبٹر	Vabotier	
لاروس	Larousse	فرانس کا مشہور فاضل ہی جس نے انسائیکلوپیڈیا لکھی،
شفر	Sheffer	
بوشنر	Buchner	
راسین	Racinie	
بنجامن کانستان	Benjamin constant	
گسلر	Ghisler	
کانٹ	Conte	
دومارگن	Du: Morgan	
جان کوکس	John Cox	
ہکسن	Hickson	
لمبروزو	Lombroso	
ہزلوپ	Haslop	
ہوڈسن	Hodgson	

تصحیح اسماء

چونکہ اس کتاب میں اکثر فرانس وجرمن وغیرہ کے فضلا اور مصنفین کے نام آئے ہیں جن کا صحیح تلفظ اردو میں ادا نہیں ہو سکتا، اس لئے ان ناموں کو انگریزی خط میں لکھا جاتا ہے کہ ناظرین ان ناموں کو صحت کے ساتھ پڑھ سکیں،

ویلس	R. Wallace	ڈارون کا معاصر اور ہم پایہ اور مسئلہ ارتقاء کی ایجاد میں ڈارون کا شریک تھا
لودج	Lodge	فزیکل سائنس کا مشہور عالم ہے
رچیٹ	Richet	
زولنر	Zolner	جرمنی کا مشہور فاضل ہے جو اسٹرانومی کا بہت بڑا ماہر ہے
ٹنڈل	Tyndall	طبعیات کا بہت بڑا عالم ہے،
کروکس	Crookes	فن کیمسٹری کا بہت بڑا ماہر ہے
الیٹ	Elliot Couse	امریکہ کی علمی سوسائٹی کا پریسیڈنٹ تھا
دوڈروشیہ	Du, Dutrochet	

	Camille Flammarion	کیمیل فلامریان
	Chamber	شمبر
	Parkes	پارکس
	Cromwell Forley	کرامول فارلی
	Weber	ویبر
	Alexzander Kozokoff	الکسنڈر کازوکاف

مولٰنا شبلی کا سلسلۂ علم الکلام

مولٰنا نے چاہا تھا کہ پہلے مسلمانون کے علم الکلام کی تاریخ لکھین، پھر اکابر علماے متکلمین کی سوانح عمریان، اور اُن کے متکلمانہ مجتہدات لکھین اور اس کے بعد اُن ہی بزرگون کے اصول کے مطابق جدید علم کلام ترتیب دین، چنانچہ اس تجویز کے مطابق انھون نے حسب ذیل کتابین لکھین جو ہمارے ہان موجود ہین،

۱- **علم الکلام**، یعنی مسلمانون کے علم کلام کی تاریخ، مطبوعۂ معارف، قیمت، عہ

۲- **الغزالی**، امام غزالی کی سیرت اور اُن کے فلسفیانہ اجتہادات، قیمت: عہ

۳- **سوانح مولٰنا روم**، مولٰنا رومی کے حالات، اور اُن کا علم کلام، مطبوعہ معارف پریس، حجم ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

۴- **الکلام**، یعنی جدید علم کلام، جس مین فلسفۂ حال کے مقابلہ مین اسلامی عقائد کو ثابت کیا گیا ہے، مطبوعہ معارف پریس، قیمت: عہ

۵- **رسالہ اہلسنت والجماعہ**، فرقہ اہل السنہ والجماعہ کے اصولی عقائد کی تحقیق اور سلف صالحین کے عقائد صحیحہ کی تشریح، از مولٰنا سید سلیمان ندوی، مطبوعہ معارف پریس، قیمت: ۸ر حجم ۵۴ صفحے،

مسعود علی ندوی **منیجر: دار المصنفین** **اعظم گڈہ**

(طابع وناشر محمد اویس وارثی)